
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی
October
2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
حنا دل پذیر
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں
☆...."مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆....ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ "زرد لومڑی" اور کاشی چوہان کا ناول "زہر عشق"
www.paksociety.com
Monthly SACH-CHEE KAHANIYAN Reg.No Sc-117 October 2016 SR.12 Rs.60/=
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی	MEMBER APNS
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز	CPNE

منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر

مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 ۔ شمارہ: 10 اکتوبر: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

بے خبر

دنیا چاند پر پہنچ کر واپس بھی آ گئی اور ہم پاکستانی آج تک چاند ہی تلاش کر رہے ہیں۔ اس بات میں کس قدر حقیقت ہے۔ اس کا اندازہ عید کی چھٹیوں میں ہوا جب صبح سے رات گئے تک اللہ کی راہ میں دینے والے جانوروں کو کترینہ، دبنگ، سلطان وغیرہ وغیرہ کے ناموں سے ٹی وی چینلز متعارف کراتے رہے، پھر انہی جانوروں کو ڈنڈوں، لاتوں اور گھونسوں اور کہیں کہیں گولیوں سے بھی قابو کرتا دکھایا گیا۔ ایک ٹی وی چینل نے تو مشہور ماڈلز کے ساتھ ان جانوروں کو ریمپ پر واک کرتا بھی دکھایا جہاں اُن کی بولیاں لگ رہی تھیں۔ اس کے بعد بریانی، تکہ، باربی کیو کے نظارے جیسے اس قربانی کا مقصد صرف ناشتے میں کلیجی کھانا اور 3 دن صرف باربی کیو کی دعوت اُڑانا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ سب غلط ہے مگر حد میں رہیں تو سب اچھا ہے۔ مقبوضہ کشمیر عید پر بھی لہولہان تھا، مگر ہمیں فکر نہیں بھارت نے امریکہ کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کے لیے دے دی۔ اس کے بعد خطے میں کیا تبدیلی آئے گی ہمیں دلچسپی نہیں۔ تارکین وطن کھلے سمندروں میں بے یارومددگار تڑپ رہے ہیں۔ ناسا نے زمین سے 60 گنا بڑا زمین سے مشابہت رکھنے والا سیارہ دریافت کرلیا ہم بے خبر...... خبر ہے تو صرف تکے، کباب اور قورمے کی کیا، ہم واقعی میں اتنے بے خبر ہیں کہ مذہبی تہوار کو بھی صرف کھیل تماشے کا نام دے کر فارغ ہو جاتے ہیں یا ہم خواب غفلت میں مبتلا قوم ہیں۔ قربانی اور ایثار کے مطلب سے ناواقف ہیں۔ کاش اس نئے سال ہم قربانی کا درست مطلب جان سکیں اور تیسری دنیا سے نکل کر ترقی یافتہ دنیا میں قدم رکھ سکیں۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارو! کیسے ہو! یقین جانو پرچے کی تزئین و آرائش میں، نوک پلک سنوارنے میں دن کس طرح ہو جاتے ہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ میرے ہاتھوں سے دن ریشم کی طرح پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اس ماہ لگنی ہے، فلاں کہانی تو ضرور مگر..... سوچ کی پرواز ابھی نے بھی نہیں پاتی کہ کوئی اور مزیدار، سنسنی خیز کہانی آجاتی ہے اور کہتی ہے ''کاشی جی! کیا میرا نمبر نہیں آئے گا اور پھر سے آرائش گل زیبا شروع..... ہر بار یوں لگتا ہے کہ اس بار بہت لیٹ ہو جاؤں گا مگر خدا کا کرم ہو جاتا ہے اور وقت پھر سے قدم بہ قدم ہو جاتا ہے۔ میرے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔ بس کام کام اور کام..... جو آپ سب کو گمشدگی سے نکال کر حال میں لا سکے۔ یہ میرا دل چاہتا ہے آپ کو مشرق کی صدیاں دکھاؤں۔ میں مشرق کا شہری ہوں۔ مشرق کے شہسواروں کو میدان عمل میں کارساز دیکھنا چاہتا ہوں۔ چمکیلے پتھروں کی دیوار پر بیٹھا میں گرم ہواؤں سے لطف اٹھانا جانتا ہوں۔ چپ کی ایک عادت سے میں اب انحراف کرنے لگا ہوں۔ کہانیاں سر جھکائے میرے آزو بازو کھڑی ہیں اور میں کہانی کی پیشانی پر محبت سے قلم کی مہر ثبت کرتا جا رہا ہوں۔ مجھے وہ بچے بہت اچھے لگتے ہیں جو سیلف میڈ ہوتے ہیں۔ کسی کا باپ ٹھیلا لگائے رات کو گھر کا تختہ بان کی چارپائی پر ڈال دیتا ہے تو کسی کا باپ مٹی میں بیگار کاٹ کاٹ ٹانگیں لکڑی کیے گھر آتا ہے اور گھر کی دہلیز پار کرتے ہی اوندھے منہ ٹانگیں لیے پڑ سو جاتا ہے۔ کسی کی ماں گھروں میں صفائیاں کرتی، مالکوں کی جھڑکیاں سنتی شام کو کھانا پوٹلی میں باندھے ٹھنڈے چولہے کو آگ لگائے پیٹ کے دوزخ کو گرم کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتی ہے۔ فیکٹری میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عقابی نظروں سے بچتی، گدھ راجاؤں کے آشیر باد کو دھتکارتی حق حلال کما کر غربت بادشہ کے خلاف برسر پیکار ماں..... باپ ماں کو مشین کا کل پرزہ بنے دیکھتے پرورش پاتے سیلف میڈ بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کسی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو پلیز درد کی آواز محسوس کر کے دیکھیے۔ آپ خود حیران رہ جائیں گے کہ یہ انسانی عشق، انسانیت سے محبت تو ازل سے آپ کے وجود میں بسیرا کیے روح سے لپٹی رہتی تھی مگر اس گمشدہ محبت کے احساس کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ چپ کی سازش کو توڑ دیجیے اور بولیے۔ آئیے ساتھیو! اب چلتے ہیں محبتوں کے طلسم کدے احوال کی جانب سب سے پہلے جو ہمارے ساتھ ہیں ہمارے ساتھی لکھاری مقصود احمد بلوچ..... میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ ''اس دفعہ پراسرار نمبر دو اگست کو ملا۔ پرچہ ملتے ہی جب اسے کھولا تو اچانک میری نظر صفحہ نمبر 11 پر آ کر رکی۔ سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ کا پڑھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ کاشی بھائی! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں اور انشاء اللہ سچی کہانیاں کی یہ پہلی تقریب بہت ہی دھوم دھام سے ہوگی۔ اس کے بعد جن لوگوں نے میری اسٹوری ''قسمت'' کو پسند کیا۔ میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں تہہ دل سے ان لوگوں کا مشکور و ممنون ہوں۔ جن میں سب سے پہلے سرگودھا سے ممتاز احمد، ملتان سے پیاری بہن صائمہ مجید، لاہور سے عشال احمد نواب، ساہیوال سے ایم افضل آزاد، کراچی سے بہت ہی پیاری آپی نگہت غفار، فتح جنگ سے نزاہت افشال مہورہ اور سرگودھا سے فیصل ندیم بھٹی۔ ان سب بہن بھائیوں کا بہت بہت شکریہ۔ سونیا خان، ایم اے راحیل، عمارہ ناز، ان تینوں نے میری اسٹوری کے متعلق لکھا کہ ہم پہلے بھی کسی رسالے میں پڑھ چکے ہیں۔ آپ تینوں اس بات کا ادارے کو ثبوت پیش کرو۔ اس دفعہ کہانیوں میں محمد سلیم اختر، ممتاز احمد، مہر پرویز دولو، نادیہ ملک اور جاوید راہی ان سب کی اسٹوریاں بہت ہی عمدہ تھیں۔ میری طرف سے ڈھیروں مبارکباد اب تک لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ فی امان اللہ۔

☆☆ پیارے مقصود! تمہارا پیغام یقیناً ان سب تک پہنچ گیا ہوگا جنہوں نے تمہاری کہانی کے بارے میں رائے دی تھی۔

☆ شادی وال سے ہماری بہت پیاری شاعرہ عائشہ نور عاشا احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''آپ سب مجھے بھول تو نہیں

گئے۔ خیر غلطی بھی تو میری ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی مصروف تھی۔ مصروفیت کیا تھی جی بس ایم اے انگلش اف خدایا اتنی کتابیں...... پھر بھی مجھے ''سچی کہانیاں'' اور ''دوشیزہ'' یاد تھے۔ یاد رکھنے کی وجہ میں خود نہیں ہوں بلکہ سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی ٹیم ہے۔ میں جب بھی کال کروں تو بہت اچھے انداز میں بات کرتے ہیں اور یہی چیز ہے جو مجھے سچی کہانیاں ڈائجسٹ یاد رہتا ہے۔ میری باتیں لمبی ہو رہی ہیں مگر کیا کروں اتنے عرصے بعد آئی ہوں تو اب آپ سب کو یہ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہاں جی تو میں بات کر رہی تھی ڈائجسٹ کی اگر کوئی میری ڈائری کھول کر دیکھے تو حیران ہوگا کیونکہ اس میں بھی اس شمارے کا نام لکھا ہے میں نے۔ یہ الگ بات ہے کیوں اور کس وجہ سے لکھا ہے۔ کاشی بھیا! میں نے ایک کہانی لکھی ہے اور ساتھ ارسال بھی کر دی ہے اس کا لفظ لفظ سچ ہے۔ یقیناً میں اس کہانی کے ساتھ انصاف نہیں کر پائی شاید کیونکہ جو میں نے سنی وہ زیادہ دردناک ہے۔ سچ کہوں تو میرا اس سے بہت قریبی رشتہ ہے۔ اس سے پہلے کہ کاشی بھائی کے ہاتھ میں قینچی آ جائے میں اختتام کرتی ہوں۔''

☆ اچھی عائشہ! سلامت رہو۔ کہانی انشاءاللہ پڑھ کر رائے دیں گے۔ تبصرہ کہاں ہے؟ اتنے دن بعد آئی تھیں تو ٹریا پہ چڑھ کر بھی تبصرہ کر دیتیں۔ آئندہ غیر حاضر نہ ہونا۔

☜ بڑے دنوں بعد ہمیں لاہور سے یاد کر رہے ہیں زاہد حسین لکھتے ہیں۔ ''زندگی کی اک صبح روشن ہوئی اور تازہ شمارہ آفتاب جہاں تاب کی پہلی کرن بن کر صحن میں جلوہ گر ہوا۔ ''مقدر'' کو نہایت بہترین پایا اور ''چاندنی'' کے جمال میں محو ہونے کے بعد مختصر مگر نیک شگون کی مانند تھی کہانی۔ ''جائے سکون'' پڑھ کر جو سکون ملا وہ کمال ہے جی۔ ''ماں ری'' واقعی بڑی کہانی ہے جو ایک نوخیز مصنف کے قلم سے نکلی ہے۔ ''اک یہی حقیقت ہے'' بے حد پسند آئی ہے۔ ''مکافات عمل'' عبرت انگیز ثابت ہوتی ہے۔ ''بے دولت گھر کی باندی تھی'' جو ماجرا پیش آیا دیکھا اور ماتا کے غرور کا سر نیچا۔ یمین غزالہ نیہاں کا شکریہ کہ انہوں نے اپنی عفت و عصمت کو بچا لینے والی ''اکیلی عورت'' شاہینہ بیگم و شفاف آئینہ کی مانند پیش کیا ہے۔ تو یہ ملک کی ذرہ نوازی ہے کہ انہوں نے ''اصلی چہرہ'' سلاخوں کے پیچھے رابعہ اور باثیل کے ہمراہ دکھا دیا ہے قیدی عورت کا۔ حنا بشری خوش رہیں آپ نے عائشہ اور اس کے دوست کی داستان محبت جس طرح سے لکھی ہے اس میں بھرپور فن موجود ہے پختہ لکھاری ہونے کا۔ ممتاز احمد صاحب میرے من پسند قلمکار نے فرمایا ہے کہ ''کر بھلا سو ہو بھلا'' بالکل ٹھیک فرمایا ہے پر سیٹھ فضل کریم کی بیٹی کو بچانے کا معاملہ تو بعد میں آیا۔ پہلے تو نرگس جو کہ تلخ ترین حالات کی ماری معذور بھی تھی اس کو اپنانے کی نیکی بھی تو کم نہ تھی۔ لہٰذا دو آتشہ صلہ ملا ہے مرکزی کردار کو۔ سمجھنا یہ چاہیے کہ جس کام کی بنیاد درست ہوگی اس کا انجام کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ ''جرس'' یہ کہانی اور اس کے الفاظ تیر کی طرح آنکھ میں گئے۔ غربت افلاس بھوک قحط بیماری صحرا کی پیاس بھری کی حیات فاطمہ کی وفات یہ سب لکھنا آسان نہیں تھا مگر آفرین ہے محمد بلال فیض پر کہ انہوں نے یہ مناظر بھی دکھائے اور وزیر صاحب کی مردہ ضمیری بھی۔ ارم ناز نے ''کٹھ پتلی'' یا حوی مظلومہ صاحب نے دنیا کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اشرف نے جو کارنامہ کیا اور موصوف کو جو تحفہ ملا دونوں پر لعن طعن کے سوا کچھ نہیں لکھتا۔ شعبان حسن کا ''کارنامہ'' قدرے بہتر... [illegible] بہت بری شے ہے اور کسی کو صلاحیتوں سے محروم رکھ... کر اس کا خاتمہ کبھی بھی آتشدان کی اینٹوں تلے دب کر سیمنٹ کے لیپ پر ہوتا ہے۔ مریم مہربان ملک نے مہربانی کی ہے اور رعنا حسن خود و مجھے و فخر و تکبر کی دیوی ٹوٹ بکھر کے بے بسی کی زندگی گزار رہی ہے ''ندامت'' کے ساتھ۔ ''مفاد پرست'' شان کا ملو ٹھیک ٹھپا ہے رافع نے تحریر پسند آئی ہے۔ ''امتحان'' مولوی چراغ دین معقول نمبروں سے پاس ہوا۔ ''نصیب میں نہیں ہے جو'' ٹھیک تھی۔ انیلا امام بخش شکریہ ''رائٹ نمبر'' لگانے کا۔ ''رفوگر'' جیت آج کی عورت پر ختم ہوئی بہت خوب۔ ''دوسرا مکا'' خدا سب کو ان آفات سے دور رکھے پر ہماری طرف سے بھی آمین۔ فرحت صدیقی صاحبہ کی کاوش ہو اور قابل تعریف نہ ہو یہ کبھی ممکن نہیں۔ جاوید راہی صاحب آپ کی لبوں پر رقصاں مسکان کے ہم گرویدہ ہیں پکے۔ مونا لیزا ہو گی کوئی پر آپ...... خیر ''اجنبی محبوبہ'' جو خط سے موت تک پہنچی اس شمارہ کی بہترین کہانی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ بڑے اثر انگیز ہیں۔ منفرد سی یہ کاوش آپ بیتی بھی قرار پائی ہے۔''

☆ پیارے بھیا! کیا خوب احوال میں میلہ لگایا آپ کے اس تبصرے نے۔ خوش رہیے اور ہاں! یہ اتنے دن کی غیر حاضری چہ معنی......!

☜ بھائی ممتاز احمد اپنی محبتوں کے ساتھ سرگودھا سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''ماہ اگست کا پراسرار نمبر چار اگست کو موصول ہوا۔ پراسرار نمبر کے حوالے سے ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ اداریہ میں منزہ آپی نے عبدالستار ایدھی کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ احوال میں کاشی چوہان اپنی خوب صورت باتوں کے ساتھ سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کے انعقاد کی نوید سنا رہے تھے اور وہ

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

بھی لاہور میں۔ واہ جی واہ دل خوش ہو گیا۔ جی کاشی بھائی انشاء اللہ لاہور کراچی سے سبقت لے جائے گا۔ تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے آپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کر آپ کا بھرپور ساتھ دوں گا۔ احوال خوب صورت تبصروں کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ سب دوستوں نے خوب لکھا۔ سب سے پہلے ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ خواہ خط کی شکل میں ہوں یا کہانی کی صورت میں کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نواز کر میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اب میں مخاطب ہونا چاہوں گا۔ ایم اے راحیل، غزالہ کرن اور عمارہ ناز سے کہ آپ تینوں نے لکھا کہ مقصود احمد بلوچ کی کہانی کو پہلے بھی کہیں پڑھ چکے ہیں تو یہ بہتر ہوتا کہ آپ پورے سیاق و سباق اور حوالہ جات کے ساتھ لکھتے کہ کہانی کس ڈائجسٹ میں کب پڑھی مگر آپ لوگوں نے ادھوری بات لکھ کر لکھاری کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ جو کہ سراسر غلط ہے۔ اگر کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے تو کم از کم ایسی بے سروپا بات لکھنے سے گریز کریں اور احوال کے ماحول کو خراب نہ کریں۔ احوال کے آخر میں عبدالستار ایدھی کے نام لکھی گئی نظم دل میں اتر گئی۔ جی بڑے بھائی ملک صفدر عباس اعوان وعلیکم السلام! اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو پراسرار نمبر کے حوالے سے کہانیوں کا انتخاب بہت ہی لاجواب تھا۔ یقیناً تمام محترم لکھاری بڑی محنت سے خوب صورت کہانیاں تخلیق کرتے ہیں جس کی وجہ سے پرچے کا معیار اور گراف بلند ہوتا جا رہا ہے۔ تمام کہانیاں ایک سے ایک بڑھ کر تھیں۔ لائف بوائے۔ مون سون میں بھی کام دکھائے۔ بہترین کہانی تھی۔ فریب نظر، پھر سے زندہ ہو گئی۔ وہ فرشتہ، پاور آف لو، بس ذرا سی چھاؤں، وہ چنگیری بلی موضوع کے لحاظ سے نہایت عمدہ کہانیاں تھیں۔ مصنفین نے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح مجید احمد جائی کافی عرصے کے بعد ''بیری کا درخت اور وہ'' کے عنوان سے بہترین کہانی لے کر آئے۔ ''خمیازہ'' خوب صورت کہانی تھی۔ بندر کا پنجہ، فرعون کے مجرم، وہ میرا دولہا، مجھے بھرا گھر، میرا اچھا چھوڑ دو، وہ شکستن، سرسوں کا ساگ، آسیہ کون تھی اچھی کہانیاں تھیں۔ ''ہائیڈ پارک'' میں محمد فیاض محمود، محسن علی شامی، نبیل عظمی جاوید، شمشاد اور اسامہ بلال اعوان کے انتخاب بہت اچھے تھے پسند آئے۔ کاشف حسین عاجز اور ابراہیم شوبی کا کلام بہترین تھا۔ اب تک کے لیے بس اتنا ہی انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔''

☆ پیارے بھیا! خدا آپ سب کی محبتیں قائم رکھے، یہی ہمارا مان ہے۔ تبصرہ شاندار کیا آپ نے۔

☆ روڈہ تھل سے صدام حسین کی احوال میں یہ پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''کاشی صاحب کسی بھی ڈائجسٹ میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ امید کرتا ہوں جگہ دے کر خوش آمدید کہیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ سچی کہانیاں میرے ایک پیارے سے دوست نے متعارف کرایا۔ میں نے پہلی بار خریدا پہلی بار ہی پڑھا اور پہلی بار ہی اچھا لگا اور پہلی بار ہی خط لکھ رہا ہوں۔ واقعی سچی کہانیاں اپنی مثال آپ ہے۔ میرے دوست نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ اس نے جس طرح تعریف کی ہے ڈائجسٹ بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ محمد سلیم اختر، ضرغام محمود، محمد یوسف لغاری، فرزانہ نگہت، یاسمین غزالہ، ممتاز احمد، محمد بلال فیاض، ارم ناز، اعجاز احمد قمراں، بابر نایاب، سید شاہد حسین، رانا نعیم اللہ اور جاوید راہی ان سب لوگوں کی کہانیاں مجھے سب سے زیادہ اچھی لگیں۔ ان لوگوں نے بہت ہی اچھے انداز میں لکھا۔ ''تیر نیم کش'' میں سب کے سب اشعار بہت اچھے لگے۔ اب اجازت زندگی رہی تو آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔''

☆ پیارے بھائی صدام! خوش آمدید! لو تمہارا خط احوال کی زینت بنا اب اگلے ماہ آنا نہ بھولنا۔

☆ ایبٹ آباد سے یہ آمد ہے ہماری پیاری بہن ام منامل کی۔ لکھتی ہیں۔ ''سب سے پہلے تمام اسٹاف اور پڑھنے والوں کو السلام علیکم اور عیدالاضحیٰ کی بہت بہت مبارک باد۔ اتنے عرصے میں جو لوگ دنیا سے چلے گئے ان کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہوں جو شادی کے بندھن میں بندھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نوازا انہیں بہت بہت مبارک باد جو ایوارڈ کی دولت سے مالا مال ہوئے ان کے لیے مزید ترقی کی دعا کرتی ہوں۔ منزہ باجی کا اداریہ ہمیشہ کی طرح خوب ہے۔ اسماء اعوان ''لائف بوائے'' کے ساتھ اپنا رشتہ خوب نبھا رہی ہیں۔ امجد صابری جیسے عظیم قوال کی زندگی کی کہانی پڑھ کر بے اختیار آنکھیں نم ہو گئیں۔ امجد صابری کی یاد میں اک شعر لکھ رہی ہوں۔

ہر محفل بھی روئے گی، ہر دل بھی روئے گا ☆ جہاں ڈوبے گی میری کشتی وہ ساحل بھی روئے گا
اتنا پیار بکھیر کر جاؤں گا اس دنیا میں ☆ کہ قتل کر کے مجھے میرا قاتل بھی روئے گا

الگ الگ کہانیوں پر تبصرہ کرنے کی بجائے پورے رسالے پر ایک ساتھ ہی تبصرہ کر دیتی ہوں۔ یہ معاشرہ نہ مرد کا ہے نہ عورت کا۔ یہ معاشرہ تو اشرف المخلوقات انسان کا ہے لیکن جب انسان میں شیطان کی صفت نمایاں ہو جاتی ہے تو دنیا میں معاشرتی

سانحہ ارتحال

کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز (CPNE) کے نائب صدر اور ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ گروپ کے ایڈیٹر جناب عامر محمود کی والدہ بیگم محمود ریاض (مرحوم) رضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ انتقال فرما گئیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

برائیوں کی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ کہیں عورت مرد کے عتاب کا شکار ہوتی ہے تو کہیں مرد عورت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ کہیں غریب اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے امیر کو لوٹ رہا ہے تو کہیں امیر اپنے پیسے کے گھمنڈ میں غریب پر زندگی کا گھیرا تنگ کرتا نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر رسالے میں اکثر کہانیاں اسی موضوع کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ''اجنبی محبوب'' پڑھ کر سبق لینا چاہیے کہ کبھی بھی غصے میں کسی کو ایسی دھمکی نہ دیں جو بعد میں پریشانی کا باعث بنے۔ راہی صاحب کی تو قسمت اچھی تھی جو بچ گئے مگر ہر شخص قسمت والا نہیں ہوتا۔ آج ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو مختلف جیلوں میں ناکردہ جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں انہی الفاظ کے ساتھ اب اجازت دیں۔''

☆ اچھی بہن! سلامت رہو! تبصرہ پیارا تھا مگر مختصر! اور ہاں یہ ایبٹ آباد کے ڈاکخانے گلیشیئر بن گئے ہیں جو ڈاک اتنی تاخیر کا شکار ہے۔ میرا مطلب ہے پہاڑوں پر رہنے والی میری یہ بہن تبصرہ کیوں اتنا کم کم بھیجتی ہے۔

☆ دھڑکن بلوچ حیدر آباد قاسم آباد سے پہلی بار ہماری احوال بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''کاشی جی پہلی بار شرکت کر رہی ہوں امید ہے آپ اور پیارے قارئین اپنی بن بلائی مہمان کو ویلکم ضرور کریں گے۔ میرے پانچ بھائی ہیں۔ بہن کوئی نہیں اس لیے پورے گھر پہ میرا ہی راج چلتا ہے۔ اب چلتے ہیں سچی کہانیاں کی طرف تو جی سچی کہانیاں میرا فیورٹ رسالہ ہے۔ تین ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن کم عرصے میں کچھ زیادہ ہی پہچان لیا۔ قارئین کے پیار بھرے سوال کاشی جی کے محبت سے بریز جواب نے قلم کھینچنے پر مجبور کر ڈالا۔ سچی کہانیاں اتنا پیارا ہے کہ میرے پاس لفظ نہیں اس کی خوب صورت قارئین اور کاشی کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سچی کہانیاں کے سچے اور پیارے قارئین بہت اچھا لکھتے ہیں۔ مجید احمد جائی، فرزانہ نگہت، ارم ناز، ارم خان، شعبان کھوسہ، سدرہ انور علی، سید ملازم حسین، علی حسنین تابش، کیمرا خان، حاسم وقاص، جاوید راہی، تحسین جونیجو، پیاری کنزہ ملک۔ آپ لوگوں کے تبصرے، کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ سارے قارئین رسالے کی جان ہیں اور میں آپ سب لوگوں کی چھوٹی اور اچھی فین ہوں کیوں کہ میری عمر 16 سال ہے۔ اچھا قارئین باقی باتیں اگلے ماہ۔''

☆ ارے ارے گڑیا پہلے تو خوش آمدید اور اب تم ہم سب کی بھی چھوٹی سی بہن ہو۔ لاڈلی اب اس بھائی کا حکم ہے کہ ہر ماہ اس چھوٹی بہن کی سواری ہمارے احوال میں اترنی چاہیے۔

☆ کراچی سے ہماری بہن جنجل مہتلو کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''آپ کو اور سارے سچی کہانیاں کے اسٹاف کو اور منزہ بہن کو میری طرف سے سلام اور عید قربان مبارک ہو اور میں اپنی سندھی میں شاعری کی کتاب ''آکاش'' چھپوانے میں مصروف تھی اس لیے آپ کو خط نہیں لکھ سکی اب کوشش کر کے ہر ماہ تبصرہ اور خط لکھوں گی۔ انشاء اللہ میرا شعری مجموعہ چھپ کر آ گیا ہے آپ کو ضرور بھیجوں گی۔ آپ بہت ذہین ہیں ضرور مطالعہ کریں گے اور مجھے رائے سے بھی ضرور نوازیں گے۔ مینا تاج، امجد صابری کی وفات کا بہت بہت دکھ ہے۔ دکھ تو کوئٹہ میں وکلاء کی شہادت کا بھی بہت ہے، سچ بھیا کئی دنوں تک تو جیسے دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اک اداسی سی چھا گئی تھی خدا اے خدا اب ہمارے پاکستان سمیت کہیں بھی بم دھماکہ نہ ہو، آمین۔ آخر سب بھائی بہنوں کو سلام خدا سب کو سکون اور خوشی دے، آمین۔''

☆ پیاری آپی! سچ میں آپ کے تبصرے سے بہت خوش ہوئی۔ آکاش کی مبارک باد قبول فرمائیں اور ہاں مجھے آپ کی کتاب کا شدت سے انتظار ہے۔

☆ مٹھا ٹوانہ سے یہ پہلی پہلی آمد ہے محمد وسیم چدھڑ کی لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں کے سب قارئین اور سب رائٹرز کو میرا ڈھیروں پیار بھرا سلام۔ سچی کہانیاں میں میرا یہ پہلا خط ہے امید کرتا ہوں جگہ دے کر خوش آمدید کہیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ سچی

کہانیاں اچھا اور عمدہ میگزین ہے۔ یہ معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اس کی ہر تحریر کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ہر تحریر اپنی جگہ آپ بہت عمدہ اور اچھی لگتی ہے۔ میں بھی دوسرے میگزین بھی پڑھتا رہتا ہوں لیکن جب سے سچی کہانیاں لیا اور پڑھا تو یقین مانیں بہت بہت ہی اچھا لگا اور دل میں اتر گیا۔ سچی کہانیاں کے پاس بہت اچھے رائٹرز موجود ہیں جن کی بدولت سچی کہانیاں نکھرتا جارہا ہے۔ سچی کہانیاں کے سب کے سب لکھاری بہت ہی اچھے انداز میں لکھتے ہیں۔ میں کس کس کا نام لوں۔ یہ سب لوگ اسی طرح لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سچی کہانیاں پاکستان کا نمبرون ڈائجسٹ بن جائے گا۔ (کیا اب بھی کوئی شک ہے؟) میرا یہ مختصر سا خط آپ کی خدمت میں حاضر ہے اور امید کرتا ہوں مثبت انداز میں اپنی محبت میں اظہار کریں گے۔ میں ایک عدد شعر بھی بھیج رہا ہوں پلیز پلیز وہ بھی لگا دیجیے گا نوازش ہوگی۔ اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، آمین۔''

☆پیارے وسیم! خوش آمدید! خط پورا لگا دیا۔ اب تو خوش ہونا؟

● فلک شیر تابش شاہ گڑھ رحیم یار خان سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں عرض کرتے ہیں۔ ''پہلی دفعہ سچی کہانیاں خریدا کیونکہ اس کے ٹائٹل نے کافی متاثر کیا۔ دراز بالوں والی حسینہ کافی دلکش تھی اور دوسری بات ستمبر کا یہ شمارہ ہر لحاظ سے بہترین تحریروں پر مشتمل تھا۔ پڑھ کر پکا ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ اس جریدے میں کچھ نہ کچھ شیئر کرتا رہوں گا۔ ''احوال'' میں کافی ساتھی ہیں جو مجھے جانتے ہی ہوں گے کیونکہ ہم کئی اور جریدوں میں بھی اکٹھے لکھتے رہے ہیں۔ بہرکیف اب تو یہ رسالہ بھی ہماری سرشت میں شامل ہو چکا ہے۔ ''مقدر'' میں مدیراعلیٰ نے جو کہا سچ کہا مگر یہ پاکستانی عوام..... اف توبہ! سدھرنے والی نہیں ہے۔ کتنی جیسے چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی شاید؟ احوال میں دوستوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سب نے اچھے اچھے تبصرے کیے۔ ایم اے راحیل، مجید جاگی، خواجہ حسین جاوید، نٹ کھٹ تحسین کے شاندار تبصرے تھے۔ آپ کی موہنجوڈرو پر نظم پڑھ کر کچھ پریشانی ہوئی کیونکہ کراچی میں اتنی بارشیں پہلے تو کبھی نہ تھیں۔ مجھے سائنسدانوں کی وہ پیشن گوئی یاد آگئی کہ کچھ عرصے بعد سمندر کراچی کو لپیٹ میں لے لے گا، اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ ''.... الف بوا....'' ہلکی پھلکی تحریر بھلی تھی۔ احمد سجاد بابر نے امجد صابری پر مفصل لکھا جو کہ قابل داد ہے۔ بارہ کی بارہ سچ بیانیاں خوب سے خوب تر تھیں۔ ''شعلہ ساماں'' تحریریں بھی کم نہ تھیں۔ تین مرد تین کہانیاں، خوب صورت انداز میں تحریر کی گئیں۔ حکایتیں پڑھیں تو مزہ دوبالا ہوگیا۔ ''مسئلہ یہ ہے''، ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' بہترین سلسلے ہیں۔ سفرنامہ اور ناول زیر مطالعہ ہیں۔ انشاء اللہ آپ سے ملاقات رہے گی۔''

☆پیارے فلک شیر! خوش آمدید! اب سے پہلے تو اپنی تسلی کرلو تبصرے کے ساتھ اقتباس، اشعار اور سارے کوپن بھی ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہو مگر شرط ہے کہ رسالہ تازہ ترین ہو۔

● ملک علی رضا شار کالونی فیصل آباد سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''اس ماہ کا شمارہ بھی ہر ماہ کی طرح اعلیٰ تحریروں سے مزین تھا۔ اس کی تمام تحریریں اور سلسلے لاجواب ہوتے ہیں جن میں منزہ سہام صاحب کا اداریہ سب پر سبقت لے جاتا ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ تحریر اپ ڈیٹ ہوتی ہے۔ دوسرا کسی بہت سنجیدہ مسئلے پر چیف ایڈیٹر صاحبہ کی نظر ہوتی ہے۔ رائٹر بھی کمال کے رائٹر ہیں جو پراسرار نمبر میں کہانیاں ارسال کرتے ہیں۔ ''رشتے ناتے'' عرفان حسین کی تنقیدی اور تحقیقی تحریر تھی جسے پڑھ کر کافی حقائق سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ منزل کہاں تھی، ہیرو، نام بھی نہ رہے گا، قسط کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ شعبہ زندگی کے حوالے سے بہت سی معلومات اس بار پڑھنے کو ملیں۔ خطوط میں استاد محترم ریاض حسین شاہد، بشریٰ کنول، محمد شعیب، محترمہ شازیہ گل، اقرا سیف، مجید جاگی، رانا حبیب الرحمن، بلال احمد، شبانہ نسیم بہت خوب۔ آخر میں سب قارئین کو بڑی عید کی بڑی خوشیاں مبارک ہوں۔ دعا ہے سچی کہانیاں ہمیشہ ترقی کی تمام منزل آسانی سے طے کرے۔''

☆پیارے علی رضا! تمہارے تبصرے نے مسرور کیا۔ بس اپنی محبت اسی طرح قائم رکھنا۔

● ہمارے بہت پیارے ساتھی اور ریگولر قاری خضر حیات روڈ تھل سے لکھتے ہیں۔ ''ستمبر کا شمارہ ایک دوشیزہ کے چمکتے دمکتے اور خوب صورت چہرے کے ساتھ انتیس اگست کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی پیارا تھا۔ اس نے تو پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ شمارہ بہت زبردست اور سپرہٹ تھا۔ پیارے کاشی اتنا خوب صورت انداز میں شمارہ نکالنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ آپ کی محنت، محبت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کی محنت لگن کو سلام۔ شمارے میں جتنی کہانیاں شامل تھیں سب کی سب بہت بہت زبردست، اچھی عمدہ اور ساتھ ساتھ سبق آموز بھی تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں میں سب کہانیاں لکھنے

خواتین کی محبوب قلم کار

'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

"دامِ دل" ...... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی...... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو......

"دامِ دل" ...... کہانی ہے اُس ماں کی ...... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

"دامِ دل" ...... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"دامِ دل" ...... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ...... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ 'دوشیزہ' ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

والوں کو بھرپور انداز میں سلام پیش کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ بالکل اسی طرح لکھتے رہیں۔ پیارے کاشی صاحب یہ آپ کی محنت، محبت اور لگن کی وجہ سے ہے کہ سچی کہانیاں کے پاس بڑے بڑے اچھے اور قابل رائٹرز موجود ہیں۔ عشق نمبر کا اعلان کر کے آپ نے تو ہمارے دل جیت لیے ہیں امید کرتا ہوں دیگر شماروں کی طرح شمارہ "عشق نمبر" بھی اپنی مثال آپ ہوگا اور بہت جلد آ جائے گا۔ اب اجازت زندگی رہی تو آئندہ پھر آپ سے بات ہوگی۔ میری دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، آمین۔"

☆ پیارے خضر! یقین کرو تمہاری محبت نے آنکھیں نم کر دیں اس میں محنت کے علاوہ آپ سب کی محبت بھی شامل ہے۔

◄ کراچی سے ہماری بہن فرح انیس لکھتی ہیں۔ "اگست کا شمارہ زبردست تھا جس کی تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ کاشی بھیا آپ کا شکریہ آپ نے میری تحریر کو جگہ دی۔ ستمبر کا شمارہ پہلی تاریخ کو موصول ہوا۔ احوال میں سب ہی کے تبصرے پسند آئے۔ تمام احوالیوں کو آداب اور نئے آنے والوں کو خوش آمدید، سدرہ کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ نزاہت افشاں سوری پیپرز کی مصروفیت کے باعث آپ کو جواب نہیں دے سکی تھی۔ ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں اور باقی پڑھنے والے آپ سب کیسے ہیں۔ محمد سلیم اختر کی تحریر پسند آئی۔ سچ ہے پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہر شخص ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ضرغام محمود کی تحریر بھی اچھی تھی اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پر بجلیاں۔ اللہ سب کو حسد جیسی بری بیماری سے محفوظ رکھے، آمین۔ محمد یوسف لغاری کی تحریر بھی پسند آئی برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ حنا بشریٰ کی تحریر بہت پیاری لگی۔ محمد بلال فیاض کی تحریر پڑھ کر حکمرانوں کی بے حسی پر ہمیشہ کی طرح افسوس ہی ہوا۔ ارم ناز، ممتاز احمد، نادیہ ملک، جواد احمد اور جاوید راہی کی تحریریں عمدہ تھیں۔ ایم اے راحت کا ناول زبردست جا رہا ہے۔ "زہر عشق" بھی ماشاءاللہ شاندار طریقے سے جاری ہے۔ "تیر نیم کش" میں سب کے اشعار اچھے لگے۔ رضوانہ کوثر کا شعر بہت زبردست لگا۔"

☆ پیاری فرح! اللہ کرے پیپرز کا رزلٹ بہت شاندار آئے۔ تحریر پڑھ کر بتائیں گے باقی خدا پر بھروسا رکھو۔

◄ رحیم یار خان سے ڈاکٹر حاجی عمران خان کی احوال میں پہلی پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ "اے بلبل! باغ خوش بیانی آداب میں قوت اظہار سے محروم ہوں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ محفل میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں۔ سچی کہانیاں کے بغیر نئے ماہ کا آغاز کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ معاشرے کی جو سچائیاں یہاں بیان کی جاتی ہیں وہ تو ہمارے معاشرے میں اور کہیں بھی نہیں بیان کی جاتیں اگر شمارے کے ایک ایک پہلو کی تعریف کروں تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ مجھے تبصرہ کرنے کی توفیق دے، آمین۔ شمارہ لاجواب اور آپ باکمال۔ ایک گزارش ہے بتا دو یا تبصرہ کیسے کرتے ہیں۔"

☆ اچھے عمران! خوش آمدید! لاؤ کان ادھر لاؤ میں بتاؤں تبصرہ کیسے کرتے ہیں۔ جو تم نے لکھا وہ ہم نے لگا دیا باقاعدہ تبصرے سے نکھار خود بخود آ جائے گا۔

◄ کراچی سے ہماری پیاری آنٹی نفیسہ فضل لکھتی ہیں۔ "میری طرف سے آپ سب کو عیدالاضحیٰ بہت بہت مبارک تمام اسٹاف لکھاری اور قارئین کرام کو دلی عید مبارک۔ حسب وعدہ اس بچے کی چھوٹی سی روداد پیش نظر ہے مگر وہ میرے رنج والی؟ (جد) اس مرتبہ تبصرہ نہیں کر سکتی کیونکہ ابھی پرچہ نہیں پڑھا میں اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھی۔"

☆ اچھی آنٹی! آپ کی مجبوری کے تحت آپ کو اس ماہ رعایت دی گئی ہے۔ اگلے ماہ آپ کا پورا تبصرہ ہمارے پاس ہو۔

◄ رفعت R.H بہاول نگر سے عرض گزار ہیں۔ "میں کہاں اس قابل کہ اہل علم کی محفل میں آنے کی خواہش بھی کروں، مجھے تو بس کسی کا اسرار کھینچ لایا ہے۔ میں نے انسانی زندگی کی اصل صورت یہاں پائی ہے۔ سچی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہے۔ زندگی میں بس مخلص لوگوں کا ساتھ نہ چھوٹے اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ دور حاضر میں یہ رسالہ اپنا ثانی نہیں رکھتا اور زندہ دل انسان کاشی صاحب تو خیر، نک کا انعام ہیں اہل ادب کے لیے۔ "احوال" میں خواجہ حسین جاوید صاحب نے کمال کا تبصرہ کیا ہے اور سونیا خان ادی زرینہ، سجدہ صابر کے خطوط لاجواب تھے۔ مجید احمد جائی، خضر حیات کے خط بھی اچھے تھے۔ کاشی اگر میں کہانی ارسال کروں تو آپ کب تک شفقت فرمائیں گے۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خط لکھنا آتا نہیں اور پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ اس میں قصور میرا نہیں کاشی جی کا ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں! بس اہل دل سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج میں اہل دل کی محفل میں حاضر ہوئی ہوں۔ سچائی کو جس قدر سچی کہانیاں میں بیان کیا جاتا ہے میرے نزدیک معاشرے میں اور کہیں بھی نہیں کیا جاتا۔ احوالی برادران کا انداز گفتگو بہت ہی شیریں ہے اور کہانیاں ہمارے معاشرے کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہیں۔ پہلی بار حاضر ہوئی ہوں اس لیے کم بول رہی ہوں۔ پیارے پیارے کاشی بھیا یاد ضرور رکھنا۔ اب اجازت۔"

☆ پیاری رفعت! تم نے جو لکھا سر آنکھوں پر۔ کہانی بھیج دو پڑھ کر رائے دیں گے۔ بس احوال میں شمولیت ہر ماہ برقرار رہے۔

سانحہ ارتحال

ہمارے ہر دل عزیز قاری اور لکھاری ساتھی احمد سجاد بابر کی خوش دامن صاحبہ اور برادرِ نسبتی گزشتہ ماہ بقضائے الٰہی وفات پاگئے۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحومین کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔

☜ رضا زیدی صاحب لاہور سے پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''اس خط کے لکھنے کی غرض و غائیت یہ ہے کہ آپ سے ادبی رابطہ استوار کیا جائے۔ میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ مجھے چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے شعراء حضرات۔ جناب حبیب جالب صاحب (مرحوم) کے شاگرد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میری تحاریر (شاعری) تواتر سے مختلف جرائد میں شائع ہورہی ہیں۔ میں ظلم و بربریت کے خلاف آج بھی قلم کے ذریعے نبرد آزما ہوں۔ گزشتہ تیس سال سے عوامی انقلابی نظمیں، سیاسی و معاشرتی کالم اور افسانے لکھ رہا ہوں جو کہ الحمدللہ شائع ہورہے ہیں۔ آپ کے ڈائجسٹ سچی کہانیاں ایک دوست کے توسط سے پڑھنے کے لیے مل جاتا ہے۔ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ میں ایک پینشنر ہوں کسی ادارے کی مالی معاونت سے قاصر ہوں۔ اپنی تخلیقات بلا معاوضہ ارسال کرتا ہوں۔''

☆ پیارے بھائی! خوش آمدید! آپ کی آمد نے ہمیں محظوظ کیا۔ آپ کی شاعری سر آنکھوں پر۔ انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

☜ چمن آباد سے ہمارے بھائی خواجہ حسین جاوید لکھتے ہیں۔ ''شمارہ اس بار خلاف توقع جلد مل گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق جاذب نظر تھا۔ ''مقدر'' محترمہ منزہ سہام صاحبہ نے بجا فرمایا۔ اگرچہ محفلِ احوال خوب تھی لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کی شدید کمی محسوس ہوئی۔ میرے پیارے بھائی محترم اویس اویکی صاحب اگر میرے ساتھ ناراض ہیں تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ان تمام احباب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن کی پہلی پہلی آمد تھی۔ مجید جانی نے یاد رکھا شکریہ۔''

☆ پیارے بھائی! ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ اہل قلم بہت صبر و حوصلے والے ہوتے ہیں۔ یہ کیا۔ آپ تو تین ماہ میں ہی ہمت ہار گئے۔ کامیابی ان ہی کے قدم چومتی ہے جو ثابت قدم ہوں ہمیں بھی یہ خبر نہ تھی کہ دو قدم چل کر ہم سفر ساتھ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔

☆ گلفشاں کالونی فیصل آباد سے غزالہ کرن کی آمد ہے لکھتی ہیں۔ ''تمام احوالیو کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام قبول ہو۔ سنائیے آپ سب کیسے ہیں؟ ستمبر کا شمارہ ورجہ تاریخ کو مل گیا اس بار ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ کہانیاں بھی بہت معیاری تھی۔ احوال میں کافی رونق لگی ہوئی تھی۔ مسکان بھٹی نے لکھا کہ غزالہ کرن حسد کے تیر برساتی نظر آئیں تو میں پوچھنا چاہوں گی کہ کس بات کا حسد؟ مجھے جھوٹی باتیں اور خوشامد کرنا ہرگز نہیں آتا اگر کسی کی تحریر پر سچائی پرمبنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار کرنا آپ کو حسد نظر آتا ہے تو درحقیقت یہ آپ کے اندر کی خود پسندی اور جلن ہے۔ جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنا انتہائی گھٹیا پن ہے اگر کسی میں مثبت تنقید سننے کا حوصلہ ہے تو وہ کبھی اچھا لکھاری نہیں بن سکتا۔ احوال میں کاشی چوہان نے بہت خوب لکھا۔ ان کی سو سے زیادہ تخلیقات شائع ہوچکی ہیں۔ درجن بھر ایوارڈ حاصل کرنے کے ساتھ دو شماروں کی ایڈیٹر شپ کرنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو طفل مکتب سمجھتے ہیں تو یہ ہوتا ہے بڑا پن، اعلیٰ ظرفی اور ادب سے منسلک سچا اور اچھا لکھاری ہونا۔ مجھے امید ہے کہ میری باتیں سمجھ میں آگئی ہوں گی۔ احسن ابرار رضوی، عشال احمد نواب، احمد سجاد بابر نے امجد صابری قوال اور ان کے خاندان کے پس منظر میں لاجواب تحریر لکھی۔ ارم ناز کی کہانی ''کھڑکی'' کیا غضب کی کہانی تھی۔ عورت نے اپنے خاوند سے بہت بھیانک انتقام تو لے لیا مگر اپنی عزت و آبرو گنوا کر اپنی عاقبت اور آخرت برباد کردی۔ جب دولت گھر کی باندی تھی۔ اکیلی عورت، اصلی چہرہ بہت عمدہ تخلیقات تھیں۔ ''مکافاتِ عمل'' نصیحت آموز بہت اچھی کہانی تھی۔ رونین لائف، جعلی عاملوں اور ڈھونگی بزرگوں کے شاطرانہ شعبدے بازیوں کی چالوں سے پردہ اٹھاتی منفرد کہانی تھی۔ کر بھلا سو ہو بھلا، خیر خواہی، محنت، ہمت اور نیک نیتی کا درس دیتی بہت شاندار کہانی تھی۔ رفوگر، پانی کا پھول اچھی کہانیاں تھیں۔ رائٹ نمبر ایک عامیانہ کہانی تھی۔ ہائیڈ پارک میں شہزاد خان اور رضوانہ کوثر کے انتخاب بہت لاجواب تھے۔ اب اپنے خط کا اختتام کرتی ہوں اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔''

☆ اچھی غزالہ! تمہارا خط من و عن لگا دیا ہے۔ کاش کہ تمہاری طرح ہر قاری دل اور دماغ کے ساتھ، ہوش میں رہے تو کیا ہی

غضب ہو۔ خوش رہو۔

٭ سجدہ صابر بورے والا سے عرض کرتی ہیں۔ ''سب سے پہلے تو میں کاشی بھائی آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ دوبارہ مجھے سچی کہانیاں میں جگہ دی۔ اس کے بعد آپ نے کہا تھا کہ دوبارہ کتنے ماہ بعد حاضر ہوگی۔ اب آپ خود اندازہ کر لینا کہ میں کتنے ماہ بعد حاضر ہوئی ہوں۔ اس دفعہ ستمبر 2016ء کا سچی کہانیاں مورخہ 31 اگست کو ملا۔ احوال میں سب لوگوں کے تبصرے پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ہر بندہ دوسرے کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑا ہوا ہے جو کہ بہت غلط بات ہے۔ ادب میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ اس دفعہ کہانیوں میں چاندنی، اکیلی عورت، جرس، کھڑکی، پانی کا پھول اور آخر میں زہر عشق جو اس رسالے کی وہ کہانی جو ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتی ہے۔ اگر وہ ہڈی نہ ہو تو انسان ادھورا ہوتا ہے جس ماہ زہر عشق اسٹوری نہیں ہوتی سچی کہانیاں ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ اللہ کاشی بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے آمین۔ احوال کی محفل میں مجید احمد جائی، ایم اشفاق بٹ، مسکان بھٹی، عابدہ طارق اور آخر میں شگفتہ ناز کے تبصرے بہت شاندار تھے۔ احوال کی محفل میں مقصود احمد بلوچ کو غیر حاضر پایا۔ تیر نیم کش میں ابوہریرہ بلوچ، عبدالعزیز جی آکے اشعار پسند آئے۔ اب تک اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی۔''

☆ پیاری سجدہ! چندا مقصود کا خط اس بار سب سے پہلے ہے بس اب تم نے غیر حاضر نہ ہونا ہے، خوش رہو۔

٭ عمارہ ناز کمالیہ سے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''ماہ ستمبر کا شمارہ انتہائی دلکش اور خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہو رہی ہوں۔ دراصل تین ہفتوں کے لیے اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلی گئی تھی تو جس کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکی۔ احوال میں کاشی چوہان بھائی نے بہت خوب صورت باتیں کیں۔ سب سے پہلے میں یہ بات عرض کردوں کہ جولائی میں شائع کہانی ''قسمت'' سے ملتی جلتی کہانی پڑھ چکی ہوں۔ میرے پاس دو ڈھائی سو کے قریب مختلف رسالے تھے جو کہ میرے لاہور جانے کے بعد گھر والوں نے ردی میں فروخت کر دیے جس کا مجھے بہت دکھ اور افسوس ہے۔ اسی بات پر گھر والوں سے لڑائی بھی ہوئی ورنہ ثبوت کے طور پر وہ رسالہ آپ کو بھیج دیتی۔ باقی مقصود بلوچ صاحب آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ یہ اتفاق مماثلت بھی ہو سکتی ہے لاکھوں کے حساب سے کہانیاں لکھی جا چکی ہیں تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی کہانی سے مماثلت ہو جائے۔ باقی میں نے جو لکھا وہ نیک نیتی سے لکھا کسی کی دل آزاری میرا مقصد نہیں تھا۔ اپنی رائے کے اظہار کا حق سب کے پاس ہے۔ پیارے بھائی قاسم خان بلوچ آپ میرا تبصرہ اور خط دل وجان سے پڑھتے ہیں آپ کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں تو آپ کی یہ بہن آپ کی بہت ممنون و مشکور ہے۔ قاسم بھائی اپنی بہن کو دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔ احسن ابرار رضوی، عیشل احمد ذیب، مجید احمد جائی، مسکان بھٹی آپ کو میری باتیں، خط تبصرہ اچھا لگا بہت مشکور ہوں۔ سب سے پہلے امجد صابری قوال کا زندگی نامہ پڑھا بہت قابل معلومات حاصل ہوئیں۔ ''جائے سکون'' دل کو موہ لینے والی کہانی تھی۔ بہت اچھی لگی۔ اک تلخ حقیقت، مکافات عمل، جب دولت حرص کی باندی تھی، اکیلی عورت، اصلی چہرہ بلاشبہ بہت عمدہ کہانیاں تھیں۔ ''کر بھلا سو ہو بھلا'' نیکی اور بھلائی کا درس دیتی اس ماہ کی سب سے بہترین نمبرون کہانی تھی۔ کھڑکی میں عورت کے انتقام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''ندامت'' نے درس دیا کہ غرور کا سر نیچا۔ ''رفوگر'' ایک عورت کی ہمت اور جدوجہد کی داستان تھی۔ ''اجنبی محبوبہ'' شاندار کہانی تھی۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔''

☆ اچھی عمارہ! اب احوال سے غیر حاضر نہ ہونا۔ تبصرہ زبردست کیا تم نے۔

٭ ایک زمانے بعد حیدر آباد سے ہمارے ساتھی وفا صدام حسین غازی تنیو احوال کا حصہ بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ ''بڑی مدت بعد ''احوال'' میں شرکت ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ کچھ ذاتی مسائل تھے۔ اب کے بار ایسا نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ زندگی ایسی گزرتی جا رہی ہے کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ دن، سال مہینہ علم نہیں کہ کب سانسوں کی ڈور ٹوٹے اور جسم سے روح کا رشتہ ٹوٹے (ارے اچھی اچھی باتیں کرو بھائی یہ کیا......) موت کب آئے (کیا ڈرانے آئے ہو؟) اس لیے خوش رہیں، جئیں اور جینے دیں۔ کاشی بھائی آپ کی جگہ کبھی ناصر رضا صاحب ہوتے تھے اللہ انہیں خوش رکھے، انہی سے احوال آباد ہوتا تھا۔ اب آپ ہیں آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ یہ ہے آج کا سچی کہانیاں۔ بہت خوب صورت سوچ ہے آپ کی۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اس طرح احوال میں مسکراتے رہیں آمین ثم آمین۔ آخر میں ایک شعر

چلو اتنا تو کام آیا ہنر اپنا ☆ ☆ لوگوں سے چھپایا ہر غم اپنا
دل میں ہر اک راز کو رکھا دفن ☆ ☆ بھول گیا محبت میں جو دیکھا تھا اک سپنا

☆ پیارے صدام! خوش آمدید! یار تم لوگوں کے دم سے احوال آباد ہوتا ہے یقین کرو، مجھے اپنا ایک شعر تمہاری آمد پر یاد آ رہا ہے۔ ''تیرے جانے

سچی کہانیاں کا یادگار 'عشق نمبر'

محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے

بلکہ ہم تو کہتے ہیں

عشق کا تجربہ ضروری ہے

ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

عشق نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟

یہ واردات ہوئی تو آپ عشق کی ہتھکڑی میں قید ہوئے یا بس دیکھتے ہی دیکھتے، عشق نے آپ کو کسی اور جہان میں پہنچا دیا۔

سچی کہانیاں کے صفحات پر اگلے ماہ...... یعنی ماہِ نومبر میں 'عشق کی وارداتیں، عشق کی گھاتیں، عشق کی فتح اور عشق کی ناکامی سے جڑی وہ کہانیاں، جن سے ابنِ آدم اپنی زندگی میں ضرور گزرا ہوگا۔

جی ہاں! سچی کہانیاں کا ماہِ نومبر کا شمارہ **عشق نمبر** ...... ہوگا

ایجنٹ اور ہاکر حضرات نوٹ فرمالیں

سچی کہانیاں کا ماہ نومبر کا شمارہ ''عشق نمبر'' ہوگا

نومبر 2016ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کررہا/کررہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

نومبر 2016ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: .... تعداد صفحات: ....

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

فون/سیل نمبر: ....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

نومبر 2016ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: .... مصنف: ....

دوم، عنوان: .... مصنف: ....

سوم، عنوان: .... مصنف: ....

نام: .... شہر: ....

سے دو کی ہوئی تھی" نبض جان تک مری تھمی ہوئی تھی۔ خوش رہو اور ہر چیز ہر دو ہمیں تمہاری محبت کی سند کے طور پر تبصرہ چاہیے۔

☆ تلہ گنگ سے ہمارے ریگولر قاری سلیمان شبیر لکھتے ہیں۔ "ماہ ستمبر کا شمارہ 27 اگست کو ملا۔ منزہ آنٹی نے "مقدر" بہت اچھا لکھا۔ کاش ہمیں پھر قائداعظم جیسا رہنما مل جائے، آمین۔ "احوال" میں سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ اسماء اعوان "رائف بوائے" میں پھر ایک خوب صورت کہانی لے کر آئیں۔ امجد صابری شہید کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ اس دفعہ کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح کاشی بھیا کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ محمد سلیم اختر، ضرغام محمود، جواد احمد، محمد یوسف بخاری، سید ملازم حسین شیرازی، فرزانہ نگہت، سیمیں غزالہ نیہاں، نادیہ ملک، بنت حوا، شعبان کھوسہ، ارم ناز، مریم مہربان ملک، اعجاز احمد قمرال، بابر نایاب، مور شاہد حسین، انیلا امام بخش، نسیم سکینہ صدف، رانا نعیم اللہ، فرحت صدیقی سب کی کاوشیں پسند آئیں۔ "کر بھلا، سو بھلا" بھائی ممتاز احمد کا ایک اور شاہکار تھا۔ حنا بشریٰ کی "موتی آئی لو یو" بھی ایک بے زبان کی محبت کی انوکھی داستان تھی۔ جاوید راہی صاحب "اجنبی محبوبہ" بہت پسند آئی اور ایڈیسن اور لیس مسیح کا "سوال" تو ہمارے معاشرے کی اصل تصویر دکھاتا ہوا جواب تھا۔ ایم اے راحت صاحب کا زرد لومڑی، بادبان اور زہر عشق کا کیا کہنا۔ محمود شام کا سفرنامہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ "ہائیڈ پارک" اور "تیر نیم کش" میں بھی سب کا انتخاب اچھا تھا۔ باباجی کو اللہ پاک جزائے خیر دے، آمین۔"

☆ پیارے سلیمان! تبصرہ زبردست رہا اور تمہاری توجہ دلانے پر ہم نے لکھاریوں کو تنبیہ کر دی ہے۔

☆ منڈی بہاؤ الدین سے پہلی بار تنزیلہ عرف تانی احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "سلام کے بعد عرض گزار ہوں میرا نام تنزیلہ عرف تانی ہے اور تانی میرا نِک نیم ہے۔ میرا تعلق ضلع منڈی بہاؤ الدین سے ہے۔ میرے شوہر بیرون ملک ہوتے ہیں تو بوریت اور تنہائی کا حل یہ نکالا کہ مختلف ڈائجسٹ پڑھنا شروع کر دیے مگر رفتہ رفتہ صرف سچی کہانیاں ہی پڑھتی ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر حاظ سے یہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اس میں شائع ہونے والی کہانیاں دوسرے ڈائجسٹوں کی نسبت بہت بہتر ہوتی ہیں۔ کہانیوں کے ساتھ احوال بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ کاشی چوہان صاحب خطوط کے جوابات بہت برجستہ اور عمدہ دیتے ہیں تو میرا بھی دل چاہا کہ احوال کا حصہ بنوں۔ اب دیکھتی ہوں آپ سب کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ زرد لومڑی، بادبان اور زہر عشق میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ میں پورا مہینہ بہت تسلی اور باریک بینی سے ہر تحریر کو پڑھتی ہوں۔ کہانیوں پر تنقید نہیں کروں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سے مصنف کی دل آزاری ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی خاص تکنیکی نقص نظر آیا تو آگاہ کرتی رہا کروں گی تاکہ مصنف اپنی اگلی تحریر میں ایسی کوئی غلطی نہ کرے۔ ستمبر کے شمارہ میں شائع ہونے والی ارم ناز کی کہانی "کھڑکی" بہت عمدہ رہی۔ مصنفہ نے حقائق پر مبنی تحریر لکھی یہ بالکل سچ ہے کہ جب بے جا پابندیاں، ظلم، جبر، بے اعتمادی ہو تو عورت کے اندر اس قسم کے انتقام کی چنگاریوں کا سلگنا ایک فطری امر ہے اور عورت لاکھ پہروں پردوں میں بھی بہت کچھ کر گزرتی ہے۔ جب دولت گھر کی باندی تھی فرزانہ نگہت کے قلم سے لکھی گئی تحریر بہت عمدہ تھی ایسے کہتے ہیں کہ خدا دولت کے ساتھ ایمان اور شرافت بھی دے۔ ملازم حسین شیرازی کے قلم نے مکافات عمل ایک سبق آموز کہانی رقم کی۔ انسان کو اس کے جرم کی جلد یا بدیر سزا مل کر رہتی ہے۔ "کر بھلا سو ہو بھلا" ممتاز احمد کے قلم سے لکھی تحریر دل کو چھو گئی۔ واقعی جو لوگ دوسروں کا بھلا سوچتے ہیں قدرت ان پر مہربان ضرور ہوتی ہے جو کسی کے لیے اچھا کرتا ہے درحقیقت اس اچھائی کا بدلہ اسے ہر صورت ملتا ہے۔ جاوید احمد راہی کی "اجنبی محبوبہ" بھی خوب رہی۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش اور اچھے سلسلے ہیں۔ اب تک کے لیے بس اتنا ہی اب اگلے مہینے حاضری کی بھرپور کوشش کروں گی۔"

☆ پیاری تنزیلہ! خوش آمدید تم نے تو زبردست تبصرہ کر دیا لڑکی! اب ہمیں ایسا زبردست تبصرہ ہر ماہ چاہیے۔ کرو وعدہ اپنے بھائی سے اب۔

☆ فوزیہ فرید احمد گوجر خان سے ہمیشہ کی طرح مختصر ترین تبصرے کے ساتھ موجود ہیں، لکھتی ہیں۔ "میں اپنی تحریر "وہ پراسرار وجود" کے نام سے ارسال کر رہی ہوں۔ یہ بھی پچھلی تحریروں کی طرح بالکل سچی تحریر ہے۔ یہ واقعہ میری کزن کے ساتھ پیش آیا تھا اور امید کرتی ہوں کہ یہ بھی شائع ہو جائے گا اس کے بعد میرے پاس دو اور سچے واقعات موجود ہیں جو انشاء اللہ اگلی بار بھیجوں گی اس کے کردار ابھی بھی موجود ہیں تب تک کے لیے اجازت، تحریر کی اشاعت کے لیے شکریہ۔"

☆ اچھی بہن! کاش کہ میری حسرت پوری ہو جائے اور آپ کی طرف سے تفصیلی تبصرہ آ جائے۔ خوش رہو۔

☆ لاہور سے ہماری بہت پیاری بہن حنا بشریٰ لکھتی ہیں۔ "سب سے پہلے کاشی بھیا آپ کے پھوپھا جان کے انتقال کا پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ محمد اقبال زمان کے بہنوئی، مینا تاج کے لیے بھی مغفرت کی

دعائیں۔ عبدالستار ایدھی صاحب مرحوم کے لیے بہت سی دعائیں، اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے، آمین۔ عبدالغفار عابد صاحب کی والدہ کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے (آمین۔ جونیجو سسٹرز اور مور شاہد حسین کی دادی کے لیے مغفرت کی دعائیں۔ سرورق بہت شاندار تھا رسالہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ کہانیوں میں سب سے بہترین کہانی ''فرعون کے مجرم'' تھی۔ بہت دلچسپ اور منفرد۔ فریب نظر، وہ پھر سے زندگی ہوگئی اور پاور آف لو بہترین تحریریں تھیں۔ بس ذرا سی چھاؤں، رب کا انصاف، Victim کون؟ اور چنکبری بلی بھی پراسرار تحریریں اور نصیحت آموز بھی۔ ثمینہ طاہر کی خمیازہ اور صداقت حسین کی بندر کا پنجہ، وہ میرا دولہا ہے، بھیدا مجرا گھر، میرا بچا چھوڑ دو، وہ کنگن، بیری کا درخت اور وہ، سرسوں کا ساگ، آخری شرارت، آسیہ کون تھی؟ جائز اور رات کے مسافر سب بہت دلچسپ تحریریں تھیں۔ سب نے بہت محنت کی اور رسالے کو چار چاند لگائے۔ میری کہانی کو اتنے بہتر انداز میں شائع کرنے پر بہت مشکور ہوں۔ کاشی بھیا آپ کی مہربانی ہے کہ ہماری عام سی کہانیوں کو آپ خاص بنا دیتے ہیں۔ شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ سرورق دلکش تھا۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ بہت متاثر کن تھا۔ رضوانہ کوثر کی ہمشیرہ کی مغفرت و بخشش کے لیے دعا گو ہوں۔ مرحومہ کے درجات بلند ہوں، آمین۔ شگفتہ شفیق صاحبہ اور صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ کو بہت بہت مبارک باد اللہ تعالیٰ خوشیوں کو قائم دائم رکھے، آمین۔ احوال کی رونق کاشی بھیا کے دم سے ہے۔ خصوصاً آخری خط اس کے بارے میں کیا کہوں مگر آپ کے جوابات نے خاصا محظوظ کیا۔ آپ کی تازہ ترین نظم کافی سبق آموز تھی۔ آپ کی حساس طبیعت کی عکاس۔ ''احوال'' میں تحسین جونیجو، سلیمان بشیر کے تبصرے متاثر کن تھے۔ رسالے پر تبصرہ یعنی کہانیوں پر بات سے پہلے سید محمد ابو آزاد صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحومہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہوں۔ امجد صابری مرحوم کے متعلق جان کر مزید دکھ ہوا کہ اتنا اچھا انسان اس قدر بے دردی سے قتل کیا گیا۔ ''چاندنی'' حساس تحریر تھی۔ ''ایک تصویر ایک کہانی'' ناقابل فراموش تھی۔ جائے سکون، ماں ری، ایک یہی حقیقت ہے، مکافات عمل، جب دولت گھر کی باندی تھی، اکیلی عورت، اصلی چہرہ، روشن الف تمام کی تمام متاثر کن تحریریں تھیں۔ ممتاز احمد صاحب کی کر بھلا سو ہو بھلا، بہت خوب صورت تھی۔ ''جرس'' بے حد دکھی تحریر تھی۔ ارم ناز کی تحریر ''کھڑکی'' منفرد تھی۔ ''کارنامہ'' اور ''ندامت'' عبرت انگیز تحریریں تھیں۔ مفاد پرست، امتحان، نصیب میں نہیں ہے جو اچھی تھیں۔ انیلا امام بخش نے رانگ نمبر خوب لکھا۔ ''رفوگر'' اور ''پانی کا پھول'' بہت حساس تحریریں تھیں۔ ''دوسرا مکا'' بھی اچھی تھی۔ ''سوال'' واقعی ایک نشتر تحریر تھی۔ ''اجنبی محبوبہ'' اور ''زہر عشق'' کے بارے میں ویلڈن ایک بار پھر۔ ''ہائیڈ پارک'' خوب تھا۔ تمام شمارہ مجموعی طور پر بہت زبردست تھا۔ مزید کچھ کہنا خط کو مزید طویل کر دے گا۔ سدرہ انور علی کو صحت یابی پر بہت مبارک باد اللہ صحت اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔

☆ پیاری بشریٰ! تم نے زبردست تبصرہ لکھ کر دل خوش کر دیا خوش رہو۔

☆ ہماری بہن ام ناول کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''ستمبر کا لاجواب رسالہ ہاتھوں میں ہے۔ منزہ صاحبہ کی تحریر ''مقدر'' اچھی سوچ پر مبنی تھی۔ سب احوالیوں کو پیار بھرا سلام اور آپ کی تازہ نظم لاجواب۔ قوم کے شیر جوان امجد صابری صاحب کی تصویر اور ان پر لکھی تحریر پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ کہانیاں چاندنی، جائے سکون، ماں ری، موتی آئی لو یو، کر بھلا سو ہو بھلا، کارنامہ، ندامت، مفاد پرست، امتحان، نصیب میں نہیں ہے جو، رانگ نمبر، رفوگر، دوسرا مکا سب بہترین تھیں۔ ایڈیسن صاحب کے سوال بہترین رہے۔ جاوید راہی صاحب ہمیشہ ایک پرتجسس سچ بیتی لاتے ہیں مگر ''اجنبی محبوبہ باکمال'' رہی۔ شاید اس لیے بھی کہ راہی صاحب بھی اس کا حصہ بنے اور بخیریت اس مشکل سے نکل بھی آئے۔ میرے دو پسندیدہ رائٹر جناب محترم ممتاز بھیا ان کی سادہ سی تحریر ہمیشہ دل میں اتر جاتی ہے۔ میری جانب سے ان کی خدمت میں بہت سا سلام عرض کر دیجیے۔ دوسری میری پسندیدہ رائٹر محترمہ ارم ناز ہیں اس مرتبہ بھی ان کی تحریر ''کھڑکی'' بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ باقی تمام سلسلے وار بھی خوب ہیں۔ کاشی بھیا سال کے آغاز میں جن ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تھا کیا وہ دیے جا چکے ہیں؟ ایک عدد کہانی پیش خدمت ہے کسی قریبی اشاعت میں لگا کر انتظار کی زحمت سے بچا لیں۔''

☆ پیاری بہن! تبصرہ زبردست کہا۔ جلد آپ کی خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔ ایوارڈ تقریب انشاء اللہ ماہ نومبر میں لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔

☆ قمر شہداد کوٹ سے ہمارے مور شاہد حسین لکھتے ہیں۔ ''ستمبر کے شمارے میں اپنی تحریر ''نصیب میں نہیں ہے جو'' دیکھ کر آپ کے لیے دل سے بے اختیار دعائیں نکلیں۔ اس نوازش کا بے حد شکریہ۔ رب سائیں آپ کو بے پناہ محبتوں و چاہتوں اور خوشیوں سے نوازے آمین۔ اس بار پرچہ جلد ہی مل گیا۔ امید ہے آئندہ بھی جلد ملے گا۔ سرورق قابل تعریف ہے۔ منزہ سہام ''مقدر'' بہترین اداریہ۔ اپنوں کی محفل واحوال عروج پر تھی۔ چند نئے چہرے نظر آئے۔ ''بھلی کرے آیا'' خوش آمدید۔ اشفاق احمد رفیق، مسکان بھٹی، اویس اویسی،

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

منی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہِ نومبر میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا **لاہور**...... **کراچی** سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

نوٹ: تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان اگلے ماہ کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔

عابدہ طارق، شگفتہ ناز آپ کے تبصرے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سدرہ انور علی بہنا آپ کہاں ہیں۔ ولی دعائیں۔ عشال احمد نواب، ڈاکٹر خادم حسین خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ مجید احمد جائی اور صائمہ مجید (بھابی)، آپ کے لیے پرخلوص دعائیں، اوی زرینہ جونیجو والسلام، بے حد شکریہ۔ اوی تحسین جونیجو ہمیشہ خوش وسلامت رہیں۔ کاشی بھائی آپ کی نظم ''موہنجودڑو'' بے مثال تھی۔ اسماء اعوان ''لائف بوائے'' منفرد تحریر رہی۔ احمد سجاد بابر امجد صابری کا زندگی نامہ لائے، زبردست۔ محمد سلیم اختر ''چاندنی'' ضرغام محمود ''جائے سکون'' جواد احمد ''ماں رہی'' دل کی آنکھ سے پڑھی۔ ایک یہی حقیقت، مکافات عمل، جب دولت گھر کی باندی تھی، اکیلی عورت، اصلی چہرہ، روشن زائف، اچھی کاوشیں تھیں۔ حنا بشریٰ ''موتی آئی لو یو'' ممتاز احمد ''کر بھلا ہو بھلا'' محمد بلال فیاض ''جرس'' ایک سے بڑھ کر ایک تحریریں تھیں۔ دانیال شمسی ایک تصویر ایک کہانی بہت خوب۔ ایم اے راحت ''زرد لومڑی'' بہت دلچسپ تھی۔ ارم ناز ''کھڑکی'' شعبان کھوسہ ''کارنامہ'' مریم مہربان ''ندامت'' بہت اچھی تھیں۔ محمود شام ''بھارت میں بلیک لسٹ'' معلومات میں اضافہ کرگئی۔ مرد کہانیاں ''مفاد پرست'' اور ''امتحان'' پسند آئیں۔ مور شاہد حسین ''نصیب میں نہیں ہے جو'' قارئین کی عدالت میں پیش ہے۔ نعمان اسحاق ''بادبان'' اگلی قسط کا انتظار ہے۔ رائٹ نمبر، رفوگر، دوسرا نکاح، پانی کا پھول، سوال تمام حکایتیں اچھی تھیں۔ جاوید راہی، اجنبی محبوبہ، ہمیشہ کی طرح منفرد تحریر رائے۔ کاشی چوہان ''زہر عشق'' پسندیدہ سلسلہ۔ ''مسئلہ یہ ہے'' رسالے کی جان ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' زبردست سلسلہ ہے۔ اب اجازت تمام چاہنے والوں کو پرخلوص سچی پکی دعائیں خدا حافظ۔''

☆پیارے مور! بس اسی طرح اپنی آمد برقرار رکھنا۔ تبصرہ اچھا لگا تمہارا۔

☆بھائی عبدالغفار عابد احوال میں چیچہ وطنی سے حاضری لگوا رہے ہیں۔ ''امید ہے مزاج گرامی شگفتہ ہوں گے۔ عرصے بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اس عرصے کے دوران وہ عظیم ہستی بھی ساتھ چھوڑ گئی جس کی دعاؤں کے صدقے زندگی کے بے ترتیب لمحات کو سکون مل رہا تھا۔ والدہ صاحبہ 5 جون کو ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب آپ لوگوں کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ اگست کا شمارہ پہلے کی نسبت بہت عمدہ۔ محترمہ منزہ کا اداریہ عبدالستار ایدھی مرحوم کے نام تھا۔ اس عظیم شخص کا صرف جسم انسانی تھا صفات ساری فرشتوں والی تھیں۔ احوال کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ اسماء اعوان پوری ذمہ داری کے ساتھ لائف بوائے والوں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ محترم جاوید راہی کی ''فریب نظر'' کی تعریف کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں۔ حنا بشریٰ نے وہ تحریر لکھی جس کی معاشرے کو ضرورت تھی۔ زندگی کا اولین مقصد دوسروں کے لیے جینا ہی تو ہوتا ہے۔ صداقت حسین ساجد نے اپنی تحریر میں لالچی لوگوں کا ذکر کیا۔ سلسلے وار ناول ''زرد لومڑی'' کی چوتھی قسط پڑھنے سے معلوم ہوا کہ انتقام کی آگ شیطانیت کو ہوا دیتی ہے۔ مہر پرویز دولو آپ محنت جاری رکھیں۔ حاسدین کا شور آپ کی کامیابی کی واضح دلیل ہے۔ وقاص حسین نے اپنی تحریر ''جائزہ'' میں واضح کیا کہ محبت کی جنگ ہر حال میں جیتنی چاہیے کچا گھڑا تو غنیمت ہے۔ محبت کا دریا تو پار کرنے والے محض جذبوں سے عبور کرتے ہیں۔ محمود شام کا سفرنامہ بھارت کا اصلی چہرہ دکھا رہا ہے۔ کاشی بھیا آپ کا ممنون ہوں کہ میری والدہ مرحومہ کے لیے آپ نے تعزیتی کلمات لکھے۔ سبھی ساتھیوں کے لیے خلوص بھرا اسلام۔''

☆پیارے غفار! تبصرے کا شکریہ! یہ حاسدین کا شور...... ارے بھائی خدا نے دو کان کس لیے دیے ہیں۔ پتا ہے نا۔ امید ہے سمجھ گئے ہو گے۔

☆یہ چیچہ وطنی سے آمد ہے ہماری نئی ساتھی ماریہ ناز کی۔ لکھتی ہیں۔ ''میں ماہنامہ سچی کہانیاں کی خاموش قاری ہوں۔ کافی عرصے سے سوچ رہی تھی کہ احوال کے لیے خط لکھوں لیکن کوئی نہ کوئی بات اس سلسلے میں مانع رہی۔ آج آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہوں۔ احوال کی رونق آپ کے اخلاق سے چمک دمک رہی ہے۔ کہانیوں میں محترم جاوید راہی کی تحریر ''فریب نظر'' ٹاپ پر رہی۔ لالچ انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ حنا بشریٰ کی تحریر ''وہ فرشتہ'' اس معاشرے کی بھلائی کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ انکل محمود شام کا سفرنامہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سعدیہ عابد کی کہانی ''میرا پیچھا چھوڑ دو'' پڑھ کر بھی دل خوش ہو گیا۔ مہر پرویز دولو نے ایک جاندار تحریر لکھ کر اپنے آپ کو اچھے رائٹروں میں شامل کرلیا ہے۔ مجید احمد بھائی کی تحریر نے بور کیا۔ اس کے ساتھ ہی اجازت۔''

☆اچھی ماریہ! خوش آمدید! اب ہر ماہ اس احوال کی احوالی بننے کا وعدہ بھی لے لو بہنا۔

☆چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے پیارے ساتھی فیصل ندیم بھٹی عرض گزار ہیں۔ ''ماہ ستمبر 2016ء کا شمارہ اس بار تو 31 اگست کو ہی مل گیا تھا۔ منزہ سہام مرزا کا اداریہ ''مقدر'' حقیقت آشکار کر رہا تھا۔ ''احوال'' میں حسن ابرار رضوی کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ ''احوال'' میں نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید جن میں مسکان بھٹی صاحبہ، اشفاق احمد رفیق، عابدہ طارق، شگفتہ ناز صاحبہ میری کہانی، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم کو پسند کرنے کا شکریہ۔ مسکان بھٹی یہ شام کے بھٹیاں کہاں واقع ہیں؟ کنزہ ملک، مجید احمد جائی، صائمہ مجید، قاسم خان، تحسین جونیجو،

بس دعا چاہیے

برصغیر کے نامور لکھاری اور ہمارے ساتھی ایم اے راحت صاحب گزشتہ ماہ شدید دل کے عارضے میں مبتلا ہوگئے۔ قارئین سے راحت صاحب کی صحت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔ ان کی صحت یابی کے لیے ادارہ دل سے دعا گو ہے۔

عابدہ طارق کے خطوط اور تبصرے بہترین تھے۔ ''لائف بوائے'' کہانی کی شاندار کامیابی ہے۔ امجد صابری مرحوم کی زندگی کے احوال و واقعات پڑھ کر ان کی اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ثبوت ہے۔ حقیقت ہے کہ آپ عشق رسول کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ امداد میری کرنے آجا نار سول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعات پڑھ کر عشق رسول میں آنکھوں سے اشک رواں ہیں۔ ''چاندنی'' سیم اختر۔ میں شاہ جہاں دوسرے مردوں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ بالکل سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ''جائے سکون'' ضرغام محمود۔ حسد کی آگ میں تپتی کہانی ہے۔ کنول کا سلمیٰ کا چچی کو معاف کر دینا بہت بڑی بات ظاہر ہوتی ہے۔ ''ماں ری''، ''ایک یہی حقیقت ہے''، ''مکافات عمل''، ''جب دولت گھر کی باندی تھی''، ''اکیلی عورت'' سیمیں غزالہ نیہاں، ''اصلی چہرہ'' روٹین لائف، موتی آئی لو یو اچھی کہانیاں ہیں۔ ''کر بھلا سو ہو بھلا'' ممتاز احمد کی کہانی سبق آموز بہترین کہانی ہے بھیا آپ کی تو ہر کہانی میں سبق کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ ''جرس'' ایک تصویر ایک کہانی۔ بہترین کہانیاں ہیں۔ ''زرد لومڑی'' ایم اے راحت دلچسپی کے مراحل میں ہے۔ کھڑکی، کارنامہ، ندامت اچھی کہانیاں ہیں۔ ''زہر عشق'' کی بہترین قسط ہے۔ ''مسئلہ یہ ہے'' میں بابا جی ہزاروں انسانوں کو مسائل حل کروانے کے لیے اپنی کوششیں کر رہے ہیں۔ ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ''تیر نیم کش'' بہترین سلسلہ ہے۔ پچھلے ماہ کا منزہ سہام مرزا کا اداریہ ''ایدھی چلے گئے'' واقعی بالکل ایدھی صاحب جیسی شخصیت صدیوں بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ''فریب نظر''، ''وہ پھر سے زندہ ہوگئی''، ''وہ فرشتہ''، ''پاور آف لو''، ''بس ذرا سی چھاؤں'' اور Victim کون؟ اچھی تحریریں تھیں۔ ''رب کا انصاف'' ممتاز احمد کی بہترین کہانی جس میں حسد کا انجام دکھایا گیا ہے۔ ''وہ چتکبری بلی'' اچھی کہانی تھی۔ ''زرد لومڑی'' ایم اے راحت کا سلسلہ بہترین قسط پڑھنے کو ملی۔ ''مسئلہ یہ ہے'' بابا جی مصیبت زدہ افراد کو بھلائی کرتے ہوئے جب نظر آتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ سلسلہ ''ہائیڈ پارک'' میں اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ کاشی بھیا! واقعی آپ نے تو انتظار کی گھڑیاں ختم کرا دی اس پہلا سچی کہانیاں رائٹر تقریب کا سن کر بہت خوشی ہوئی اور وہ بھی پنجاب میں پاکستان کے دل لاہور میں۔ کاشی بھیا خوش آمدید۔ انشاء اللہ لاہور میں رائٹرز ایوارڈ شاندار ہوگا۔ جناب ایوارڈ تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ قدم بڑھاؤ کاشی بھیا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

☆ پیارے فیصل! تم سب کی محبت نے ہی ہمیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ تمہارا ساتھ ہی ہماری کامیابی ہے۔

☆ کوہاٹ سے سید ملازم حسین شیرازی لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کا بہت انتظار رہتا ہے۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ سے آنکھیں دروازوں پر جمی رہتی ہیں۔ شام کے سائے ڈھلنے سے تھوڑی ناامیدی ملتی ہے۔ جب تک رسالہ نہیں ملتا آنکھیں پیارے شمارے کی منتظر رہتی ہیں۔ جس حوالدار کو رسالہ لانے کے لیے بھیجتا ہوں بقول اس کے اخبار فروش کی بڑی میز پر 15/20 مختلف ڈائجسٹ رسالے قرینے سے سجے ہوتے ہیں ان سب میں سچی کہانیاں جگمگا رہا ہوتا ہے اس کی چمک سے دوسرے رسائل ماند پڑ جاتے ہیں۔ ''ماہ ستمبر کا شمارہ اعزازی وصول پایا۔ بہت بہت شکریہ۔ جیل کی ان اندھیری اور تاریک کوٹھریوں میں محصور قیدی کی کو دیے سکتے ہیں۔ دلی دعا ہے رب العزت آپ کو اور آپ کے ادارے کو اسی طرح خوشیاں بانٹنے اور دوسروں کے دکھوں میں شرکت کی استطاعت کو دوام بخشے۔ سرورق تیکھی نظروں سے دیکھتی دوشیزہ نے سرورق کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنا ڈالا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے صحیح فرمایا۔ ''شہید امجد صابری'' دوسروں کو خوشیاں بانٹنے والا ظلم و بربریت کا شکار ہوگیا۔ ظالموں نے ترس بھی نہ کھایا۔ کہانیاں نہایت دلچسپ اور شگفتہ تحریروں سے مزین ہیں۔ ''چاندنی'' از محمد سلیم اختر کی بہترین کاوش ہے۔ ''جائے سکون'' ضرغام محمود عبرت ناک کہانی ہے۔ ''اکیلی عورت'' سیمیں غزالہ نیہاں بہترین کہانی۔ ''ایک یہی حقیقت'' بہت خوب۔ ''جب دولت'' فرزانہ نگہت عبرت ناک کہانی تھی۔ ''اصلی چہرہ'' نادیہ ملک کی ایک نفسیاتی کہانی جس کی چاشنی محسوس کی جاسکتی ہے۔ ''روٹین لائف'' بنت حوا۔ ''کھڑکی'' ارم ناز، شک و شبہات کا آخری نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے جو انتقام اور نفرت کو اجاگر کرتا ہے۔ ''کر بھلا ہو بھلا'' ممتاز احمد۔ بہترین کہانی تھی۔ ''کارنامہ'' شعبان کھوسہ۔ مشرق ہو یا مغرب ایسے واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں گھر گھر کی کہانی تھی یہ۔ ''مفاد پرست'' غلط طریقے سے زندگی گزارنے والے اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ''اجنبی محبوبہ'' جاوید راہی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ''زہر عشق'' Marvellous and Miraculous۔ ''زرد لومڑی'' دلچسپیوں سے مہماتی سلسلہ۔ مسئلہ یہ ہے، تیر نیم کش، ہائیڈ پارک۔ باقی کہانیاں دلچسپ ہیں۔ طوالت کے پیش

نظر ہاتھ روکنا پڑتا ہے۔ ''احوال'' میں سب احوالیوں کے تبصرے پراثر اور دلچسپ ہیں۔ جن مہربانوں نے یادآوری کی تبصرہ پسند فرمایا ان کا بہت شکریہ۔ احوالیوں میں حسن ابرار رضوی، خادم حسین کھیڑا، سونیا خان، مجید احمد جائی، مراد خان، محمد قاسم خان بلوچ، تحسین جونیجو، سلیمان شبیر، نفیسہ فضل دیگر احوالیوں کے تبصرے نہایت شاندار، جاندار اور شگفتگی سے معمور۔ کاشی صاحب جہاں جہاں میرٹ کا استحصال ہوتا ہے ساری محنت، لگن جدوجہد دم توڑ دیتی ہے قلم کی حرمت عبادت ہے اس کی حفاظت کرنا باعث شرف وافتخار ہے۔ خدا کرے ہمارے خود ساختہ لکھاری اس کا پاس رکھیں۔ میرٹ کی کسوٹی پر پورا اترنے کی کوشش کریں۔ سچی کہانیاں ہمارے ملک میں بہت پسند کیا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی خوبی تصحیح وتنقیح سے مبرا ہونا ہے۔ حوادث روزگار کے طوفان کی گزند اور وحشت وگھٹن کی فضا میں گرفتار جب کہ سچی کہانیاں کا مطالعہ کرتے ہیں تو قدرے سکون پاتے ہیں۔ اللہ پاک دن دگنی رات چوگنی کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔ سب کو سلام۔''

☆ پیارے بھائی! اگر کوئی ناراضگی ہوتی تو پرچا آپ تک کیسے پہنچتا۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔ آپ کی کہانیوں کا بے چینی سے انتظار ہے۔

● ایم یعقوب احمدانی ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں۔ ''چند مجبوریوں کی وجہ سے گزشتہ ماہ حاضری نہ دے سکا۔ سوری ہماری محبت پرچے اور آپ سے برسوں سے ہے۔ (ارے......) اللہ ہمیشہ ساتھ نبھائے۔ میں پہلے غزل کا شکریہ ادا کروں گا اور احوال میں بھی دوست شامل تھے اور اسٹوریز بھی بہت پیاری تھیں۔ ڈائجسٹ لیا تھا گھر سے کراچی آرہا تھا۔ جب کراچی اترا تو ڈائجسٹ سیٹ پر بھول گیا۔ پرچے پر تبصرے کے لیے معذرت میرے معزز بھائی ممتاز احمد، شعبان کھوسہ، عبدالغفار عابد، ابوہریرہ بلوچ، اعجاز احمد اور پیاری سدرہ انور علی جھنگ، شفق شہزادی، ارم ڈی جی خان، منعم اصغر، فرح انیس جی، عمر حیات شاکر عظمیٰ شکور، مومنہ بتول، یوسف لغاری، ایم افضل آزاد، عظمیٰ، نجف علی، نیاز احمد، علی نواز، کاشف کمال، رانا شہزاد، سپاہی محمد عاصم لعل احمدانی، ملازم حسین، غلام شبیر، محمد شاہد سب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بقر عید مبارک اور کاشی جی آپ کو اور تمام لکھاریوں کو بھی بہت بہت عید مبارک۔ عید میں گوشت بانٹ کر کھانا بھی ورنہ پیٹ میں درد ہوجائے گا۔ آخر میں فرح انیس جی ارم جی سلام قبول ہو۔ والسلام۔ اب اجازت اللہ سب کو خوش رکھے، آمین۔''

☆ پیارے یعقوب! اس سے پہلے کہ ہم تمہارا خط لگانا بھول جائیں عید مبارک اور ہاں اگلے ماہ تبصرہ بھرپور ہو، ورنہ......!

● یو اے ای، راس الخیمہ سے ہماری نئی احوالی شاہدہ ذاکر کی پہلی آمد ہے، لکھتی ہیں۔ ''کچھ عرصہ قبل ایک دوست کے پاس سچی کہانیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو فوراً ہی دل کو بھا گیا۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے رنگارنگ لوگوں کی محفل سجی ہے اور سبھی اپنی اپنی آپ بیتیاں سنا رہے ہیں چونکہ تمام واقعات روزمرہ زندگی سے وابستہ ہیں اور انداز تحریر بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے لہٰذا اپنے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔ ''احوال'' نہایت دلچسپ محفل ہے۔ جس میں تمام احوالی بہت خلوص اور اپنائیت سے شرکت کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے کہا کہ یہ ایک رائٹر میکر رسالہ ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بھی برسوں پرانی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ نوک پلک سنوار کر کسی شمارے کا حصہ بنا دیں گے۔ خط اور کہانی کے لیے پیشگی شکریہ۔ اگلے خط کے لیے اجازت۔''

☆ اچھی بہن! خوش آمدید! آپ کی محبتوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ کی کہانی سچی کہانیاں کے صفحات پر ہوگی۔ اب ایک وعدہ آپ بھی ہم سے کیجیے کہ اب آپ باقاعدہ سے احوال میں حاضر ہوا کریں گی۔

● اسلام آباد سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی نٹ کھٹ، عظمیٰ شکور احوال میں براجمان ہیں۔ لکھتی ہیں۔ بھادوں کی چبھتی دھوپ میں سچی کہانیاں ملا۔ مت پوچھیں دل خوش ہوگیا۔ سانولی سلونی ماڈل سرورق پر بھلی لگی۔ منزہ سہام کی سچی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ واہ کیا بات ہے۔ کتنا سچ بولتی ہیں منزہ صاحبہ۔ پھر ''احوال'' کی محفل نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ رنگوں جیسی باتیں جیسے برسات برس رہی ہو۔ بہت اچھا لگا۔ امجد صابری صاحب کے بارے میں بہت کچھ جانا آہ وہ اب ہم میں نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محمد سلیم اختر کی لکھی تحریر پڑھی۔ کمال کی کہانی تھی۔ سب مرد تو خوش ہوگئے ہوں گے یہ کہانی پڑھ کر اور شکر یہ ہے کہ آخر میں انہیں چاندنی مل بھی گئی مطلب ہیپی اینڈ Good۔ لو پھر خوفناک کہانی ''جائے سکون'' ضرغام محمود کے قلم سے آزاد ہونے والے لفظ پراثر مگر ڈرا دینے والے تھے۔ خیر شکر ہے جادو ختم ہوا اور لڑکی آزاد ہوئی۔ آپ کی تحریر اچھی تھی کہ علاج خود کریں اور دین کے طریقوں پر یہ عمل کریں واہ اجواد احمد کی تحریر ''ماں ری'' ایک سبق آموز اسٹوری تھی۔ کہانی پڑھتے بار بار سائرہ پر غصہ آتا رہا مگر آخر یہ اس کے اکیلے پن پر دکھ بھی ہوا، ہاں نا تکلیف ہوتی ہے مجھے کسی کو دکھ میں دیکھ کر۔ ''اک یہی حقیقت ہے'' محمد یوسف لغاری کی تحریر مجھے کچھ تشنہ لگی یہ اسٹوری۔ اتنی جلدی مر گئے ماجد صاحب یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ راہ راست پر آکر زندہ رہتے اور ایک حسین زندگی گزارتے۔ خیر یوسف صاحب کی مرضی۔ ''اکیلی عورت'' ثمین غزالہ نیہاں اف ڈراتی رہیں آپ آخر تک۔ میں نے سوچا اب جانے کیا ہونے والا ہے اس خاتون کے ساتھ۔ سانس تھا

پراسرار کہانی نمبر 3

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 اور پراسرار نمبر 2 کے بعد پراسرار نمبر 3

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کردیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کردیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ دسمبر کا شمارہ، پراسرار نمبر 3 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

کر رکا جو تا تھا کہ یہ بلند خیر اس خاتون کی حفاظت فرما اور میری دعا قبول ہوئی شکر۔ محترمہ بچ گئیں سو تھینکس ٹیکس غزالہ نیہان "موتی آئی لو یو" یہ میں نے نہیں کہا بلکہ حتا بشریٰ کی اسٹوری کا نام ہے۔ قسم سے کتنا کچ ہوتی ہیں۔ دنیا میں انسان سے زیادہ جانور وفادار ہے۔ اگر وفا چاہیے تو انسان موتی کو گھر میں رکھے قسم سے۔ سوچ رہی ہوں میں بھی ایک موتی لے ہی آؤں۔ توبہ یہ ایڈیٹر صاحب ایسے کیوں گھور رہے۔ تبصرہ مختصر ہی تو کیا میں نے۔ میں چار لفظ "ہائیڈ پارک" پر لکھ دوں تو چلتی ہوں میں۔ ویسے بھی گرمی جان کو آ رہی ہے۔ "ہائیڈ پارک" جانا ہی پڑے گا تازہ ہوا کے لیے۔ سمیعہ واہ بہت خوب ہائیڈ پارک کو سجا دیا آپ نے "تیر نیم کش" میں خود کو ڈھونڈتی رہی میں کافی سوچ بچار کے بعد یاد آیا او ہو میں نے تو کوئی شعر بھیجا ہی نہ تھا۔ میں بھی ناں..... ! ایڈیٹر صاحب اتنے خلوص سے تبصرہ پڑھنے کا شکریہ آپ کی مسکراہٹ بتاتی ہے کہ میری کہانی بھی شائع کریں گے۔ دعائیں بہت ساری آپ کے لیے۔ سچی کہانیاں کو میرا پیار۔"

☆☆ پیاری لڑکی! شکر ہے تمہارا تبصرہ تو آیا۔ ورنہ ہم تو سمجھے خدانہ کرے دشمنوں کے منہ میں خاک قسم سے..... اب ہر ماہ آنا ورنہ سب ناراض ہو جائیں گے۔

☆ ہمارے مستقل قاری ساتھی نزاہت افشاں صبورہ، فتح جنگ سے لکھتے ہیں۔ سلام عقیدت کاشی جی اللہ پاک آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ماہ ستمبر کا شمارہ پانچ ستمبر کو ملا۔ سرورق چونکہ کبھی بھی میرے مزاج کا نہیں آیا سو سرورق پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا (حیرت ہے!) اداریہ منزہ سہام صاحبہ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہمارے سیاستدان سنجیدہ ہو کر صرف ایک کام کرتے ہیں وہ ہے کرپشن۔ "احوال" میں کاشی جی نے ٹھیک کہا کہ میرٹ بہترین ہتھیار ہے۔ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، کنزہ ملک، مجید احمد جائی، صائمہ بھابی، سونیا خان، محمد قاسم بلوچ، مراد خان، عمران مظہر، سب کے تبصرے زبردست تھے۔ محترمہ تحسین جو نجو تیمور لنگ کی طرح مار دھاڑ کرتے ہوئے آئیں اور گزر گئیں۔ مسکان بھٹی سسٹر خوش آمدید۔ آتی رہا کریں یہ خلوص والوں کی محفل ہے۔ سجدہ صابر آپ کو خوش آمدید۔ جائے سکون، چاندنی، جب دولت گھر کی باندی تھی، ماں ری، مکافات عمل، اصلی چہرہ، کر بھلا سو ہو بھلا، امتحان، ندامت اور پانی کا پھول سب بہترین تحریریں تھیں۔ "ہائیڈ پارک" اور "تیر نیم کش" بھی خوب رہے۔ پھر پرانے احوالی غائب ہیں۔ امید ہے کہ وہ سمجھ گئے ہوں گے گزارش ہے کہ لوٹ آئیں آپ۔ گزشتہ ماہ کے رسالے میں آپی منزہ کا اداریہ "ایدھی بھی چلے گئے" اچھا لگا۔ یقیناً ہم ایسے لوگوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر نے کہا ہے کہ "ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم" کاشی جی آپ نے کہا کہ اچھا شعر امانت کی طرح ہوتا ہے جب کہ میرے نزدیک تو اچھا شعر اولاد کی طرح عزیز ہوتا ہے۔ احوال میں ممتاز احمد، صائمہ مجید، سید ملازم حسین شیرازی، فیصل ندیم بھٹی، میری غزل اور تبصرہ پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے تبصرے بھی بامعنی ہیں۔ کراچی سے آنٹی نگہت غفار، آنٹی نفیسہ فضل آپ جیسے لوگوں سے رونق احوال زندہ و پائندہ ہے۔ حسن ابرار رضوی، مجید احمد جائی، ملک صفدر عباس یاد کرنے کا شکریہ۔ ویسے میرا نام تقریباً سب کو ہی بہت پسند ہے۔ احوال کے آخر پر ایدھی صاحب کے حوالے سے کاشی جی کی آزاد نظم اچھی لگی۔ کہانیوں میں فریب نظر، وہ فرشتہ، رب کا انصاف، خمیازہ، آخری فرعون، فرعون کے مجرم اور وہ میرا دولہا ہے۔ بہت پسند آئیں۔ "پاور آف لو" کہانی بہت اچھی لیکن عنوان انگریزی میں..... اس کا نام "قوت محبت" بھی ہو سکتا ہے۔ (ارے.....) آپی منزل خان کراچی اس بار غیر حاضر تھیں۔ کراچی سے میری بہت ہی پیاری ایلڈر سسٹر فرح انیس آپ غیر حاضر کیوں رہتی ہیں؟ ویسے آپ سے ناراض ہونے کو جی چاہتا ہے مگر پھر سسٹر کسے کہوں، کیونکہ میری کوئی سسٹر نہیں اس لیے آپ کو سسٹر کہہ کر میں یہ کمی پوری کر لیتا ہوں۔ "تیر نیم کش" میں سب کے اشعار اچھے لگے۔ "ہائیڈ پارک" اس بار "تیر نیم کش" سے الگ تھا۔ شہدائے کوئٹہ کے لیے سب قارئین کرام سے دعاؤں کی درخواست پر غالب کا شعر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ حاضر ہے۔

آگے آتی تھی حال وطن پر ہنسی ☆☆ اب کسی بات پر نہیں آتی

تمام دوستوں اور کاشی سے دعاؤں کا طلب گار اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔ بشرطیکہ زندگی رہی تو۔"

☆☆ بہت پیارے نزاہت! تمہاری محبت سر آنکھوں پر۔ انگریزی اور اردو کے ہیر پھیر سے نکل کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کہانی پر نام کون سا سوٹ کر رہا ہے۔ اب یہ نا کہنا کہ سوٹ کی جگہ.....؟

☆ ثناء اللہ سنی، بہاولپور سے پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "کاشی صاحب یہ میری پہلی آمد ہے۔ کاشی صاحب سرورق لاجواب تھا اور دوستوں کے خط کمال کے تھے۔ آپ کی نظم انمول تھی۔ "تیر نیم کش" اعلیٰ ذوق کی عکاسی کر رہا تھا۔ "ہائیڈ پارک" شیشہ تھا اور کہانیاں تو حقیقت پر مبنی تھیں اور آپ کے کچھ جواب کرارے تھے اور میں بھی آپ کے کرارے جواب لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

سانحہ ارتحال

سابق ایڈیٹر'سچی کہانیاں' مینا تاج (مرحومہ) کے والد گزشتہ ماہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ ادارہ مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔ اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

فیصل ندیم بھٹی، ممتاز احمد، مجید احمد جائی، بھابی صائمہ مجید، ایم افضل آزاد، علی اصغر انصاری، ناظم حسین شاہد اور بہن غزالہ کرن کے تبصرے بہت خوب تھے۔ تیر نیم کش اور ہائیڈ پارک بہت اچھا سلسلہ ہے۔ بھائی جان آپ کی محترمہ اور لگن شمارے کو دن بہ دن نکھار رہی ہے۔ محترمہ منزہ سہام نے ایدھی صاحب کے متعلق بہت اچھا لکھا ہے۔''

☆پیارے سے سی! خوش آمدید، ہمارے جواب تھے کوئی پاپڑ تو نہیں تھے جو تمہیں کرارے لگے۔ خیر ذرا سنبھل کر۔ تمہارا تبصرہ ہمیں امید ہے، بہت جلد احوال کی جان بننے والا ہوگا۔

☆مہوش بٹ ساہیوال سے پہلی بار ہماری احوالی بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''پیارے بھیا کاشی چوہان دعا ہے سدا خوش رہو اور سچی کہانیاں دن رات ترقی میں آگے بڑھتا رہے۔ کاشی بھیا میں دو سال سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ یقین کریں یہ رسالہ ہر لحاظ سے اچھا ہے اس میں کہانیاں اور تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں پراسرار نمبر بہت ذوق وشوق سے پڑھتی ہوں۔ ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے خوب مزا آتا ہے۔ اگست کا پیارا پیارا شمارہ تین تاریخ کو ملا۔ سب کام چھوڑ کر پہلے رسالے کو دیکھا لوگوں کے تبصرے خوب اچھے لگے۔ خاص طور پر عمارہ ناز، ممتاز احمد، مجید احمد جائی، کنزہ ملک ان لوگوں کے تبصرے خوب پسند آئے۔ اگست کے شمارے میں اس بار پانچ کہانیاں پہلی کچھ زیادہ خاص تھیں پہلی کہانی ''فریب نظر'' جاوید راہی۔ دوسری کہانی ''رب کا انصاف'' ممتاز احمد جی، تیسری کہانی ''وہ فرشتہ'' حنا بشری کی ''وہ چتکبری بلی'' نادیہ ملک کی اور ''بس ذرا سی چھاؤں کی تھی'' محمد قاسم خان بلوچ کی یہ کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ان لوگوں نے کمال کی کہانیاں لکھیں۔ ان لوگوں کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ظاہری بات ہے یہ لوگ مبارک باد لینے کے صحیح حقدار ہیں۔ ''زہر عشق'' کاشی بھیا کا بہترین ناول ہے۔ آخر میں سب کو بہت ساری دعائیں۔''

☆اچھی سی گڑیا! خوش آمدید! دو سال سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ اتنی لیٹ تبصرہ کیوں بھیجا بھئی۔ اب ہر ماہ پابندی سے احوال میں حاضر ہونا۔

☆لاہور سے یہ آمد ہے ہماری لکھاری ساتھی ثمینہ طاہر بٹ کی۔ لکھتی ہیں۔ ''اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ ایدھی صاحب بھی چلے گئے۔ امجد صابری جیسے چہرے کو بھی ہم سے چھین لیا گیا۔ بھائی عبدالغفار صاحب کی والدہ ماجدہ۔ تحسین جونیجو اور زرینہ جونیجو کی بڑی بھاوج اور منور حسین کی دادی صاحبہ کی رحلت کی اطلاع سچی کہانیاں کے ذریعے ملی۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کے لواحقین کو صبر کی طاقت عطا فرمائے (آمین)۔ ایدھی صاحب اور امجد صابری صاحب کے لیے منزہ آپی اور کاشی سر کے جذبات نے آنکھیں نم کردیں۔ احوال میں سب احوالیوں کے حال احوال اور خیالات جان کر ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ کچھ پرانے ساتھی اور کچھ نئے دوست۔ سب سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے اور ہمیشہ خوش رہیں۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف۔ اگست کا شمارہ پراسرار نمبر 2 تھا اور بہت بے مثال رہا۔ بہت عرصے بعد مسلسل دو شمارے اسرار اور مافوق الفطرت کہانیوں سے مزین پڑھنے کو ملے۔ مزہ آ گیا۔ دو دنوں میں سارا ڈائجسٹ پڑھ چکی ہوں۔ اس سے آپ میرے انہماک کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے لائف بوائے مون سون۔ مون سون کے موسم کے حوالے سے بہت اچھی تحقیق رہی۔ ویلڈن اسماء اعوان صاحبہ۔ جاوید راہی صاحب کے قلم نے اس بار فریب نظر سے پردہ اٹھایا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ محمد سلیم اختر کی ''وہ پھر سے زندہ ہوگئی'' ایک اچھی کاوش رہی۔ ''فرشتہ'' حنا بشریٰ کی کہانی مجھے سب سے اچھی لگی۔ دوست تو انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''پاور آف لو'' ضرغام محمود صاحب کی بہت عمدہ کہانی۔ یاسر کی پاور آف لو کو ہمارا سلام۔ محمد قاسم خان بلوچ کی ''بس ذرا سی چھاؤں ہی تو لی تھی'' اللہ کے نام میں اس کے کلام میں اتنی طاقت ہے کہ کوئی بھی چیز اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ ماہ وش طالب کی ''Victam کون؟'' ٹھیک تھی۔ حکیم بی بی کو اپنی کوششوں سے آخر کار ندا اور نیناں کو رہائی دلوانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ ''انصاف'' ممتاز احمد صاحب کی کہانی بھی عمدہ رہی۔ نادیہ ملک کی ''وہ چتکبری بلی'' اچھی کاوش کے زمرے میں آتی ہے۔ ویلڈن نادیہ ملک۔ صداقت حسین

ساجد صاحب کا ''بندر کا پنجہ'' لالچ کا انجام کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا۔ کاشف کے لالچ نے اس کے اکلوتے بیٹے کی جان لے لی۔ ایم اے راحت صاحب کا ''زرد لومڑی'' ہمیشہ کی طرح بے مثال۔ راحت صاحب کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ بنت حوا کی ''فرعون کے مجرم'' مصری عہد کی خوب صورت کہانی۔ ویلڈن بنت حوا۔ ''آخری فرعون'' ملک صفدر عباس اعوان صاحب نے مصر کے آخری شہزادے کی کہانی سنائی۔ محمود شام صاحب کا سفر نامہ جاری ہے اور یہ قسط بھی پچھلی اقساط کی طرح لاجواب رہی۔ ''میرا دولہا'' فرح انیس کی سرگزشت خوب تھی۔ فوزیہ فرید احمد کا ''بھید بھرا گھر'' ہاں ہوتے ہیں کچھ گھر ہانٹیڈ اس لیے بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ نیا گھر لیتے وقت ہر طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہیے اور نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی وہاں قرآن پاک کی پڑھائی ضرور کرانی چاہیے۔ سعدیہ عابد کی ''میرا پیچھا چھوڑ دو'' سزا اور جزا کی اچھوتی کہانی۔ شیما عبدالقیوم کی ''وہ کنگن'' لالچ اور دھوکے بازی کی کہانی۔ خون کے رشتوں کی خون کے رشتوں کے ساتھ محبت کی آڑ میں دشمنی اور حسد کی کہانی۔ بہت خوب۔ مجید احمد جائی صاحب کا ''بیری کا درخت اور وہ'' بھی اچھی کاوش رہی۔ ماریہ یاسر کا ''سرسوں کا ساگ'' بھی عمدہ کاوش رہی۔ مبارک باد۔ احتشام شامی کی ''آخری شرارت'' اف یہ بچے بھی نا ں! واقعی بعض اوقات ایسی ایسی شرارتیں کر جاتے ہیں کہ سب کے رونگٹے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہر پرویز احمد کی ''آسیہ کون تھی'' پراسرار قوتوں اور پراسرار مخلوق کی کہانی۔ اچھی تھی۔ وقاص حسین صاحب کی ''جائز'' تارا غلط کہتی تھی کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ فیصل نے تارا کے تمام مظالم کا جواب اسی کے انداز میں دیا۔ پتا نہیں اس نے بھی جائز کیا یا ناجائز۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہر حال کہانی اچھی تھی اور ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا صاحب کی ''رات کے مسافر'' بھی اچھی تھی۔ اوور آل سارا شمارہ ہی بہت زبردست رہا۔ ہائیڈ پارک کی سیر بھی بہت مزے کی تھی اور ''تیر نیم کش'' میں سارے تیر ہی ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگے۔ لیس جی کاشی سر یہ تو ہو گیا اگست کے شمارے پر میرا تبصرہ۔ اب جاتے جاتے آپ کا اور منزہ آپی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے ''خمیازہ'' کو شمارے میں جگہ دی۔''

☆بہت پیاری ثمینہ! تبصرہ کر کے دل جیت لینے کا فن کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے مگر آپ ان میں شامل ہیں۔

☆لاہور سے مختصر آمد اعجاز احمد فقراں کی، لکھتے ہیں۔ ''جناب کیا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے اسٹاف کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ سب کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور آپ کا ادارہ دن رات ترقی کی منازل طے کرتا رہے، میں آپ کو اپنی تحریریں بھیج رہا ہوں۔ علاوہ ازیں میری جو تحریریں آپ کے پاس زیر غور ہیں ان کو بھی شائع کر کے شکریہ ادا کرنے کا موقع عطا فرمائیں۔ تحریریں شائع کرنے پر آپ کا آپ کے ادارے کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔''

☆پیارے بھائی! تبصرہ کہاں گیا؟ پلیز یار تبصرہ تفصیلی لکھیں تاکہ ہم آپ کی تحریر سے سیراب ہو سکیں۔

☆راولپنڈی سے پہلی بار ہمارے احوال میں شرکت کر رہے ہیں فراز قیوم بٹ، لکھتے ہیں۔ ''ابھی کچھ دن پہلے میں نے رواں سال کا ایک سچی کہانیاں ڈائجسٹ پڑھا اور اتفاق سے سچی کہانیاں پہلی بار میری نظر سے گزرا اور مجھے بہت زیادہ پسند آیا اور تحریروں نے دل کو چھوا میں نے کچھ لمحے سوچ کر فیصلہ کیا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی زندگی کا سب سے خوب صورت واقعہ آپ کے ڈائجسٹ کی نذر کروں جو واقعہ تھا تو میری زندگی کا سب سے خوب صورت واقعہ لیکن کچھ ہی دنوں میں میری زندگی کا سب سے دل خراش اور ناقابل فراموش واقعہ بن گیا جس کو میں چلتی سانسوں تک نہیں بھلا سکوں گا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ کوئی تحریر لکھ کے کسی ڈائجسٹ کو اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری اس چھوٹی سی کاوش کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے ڈائجسٹ میں جگہ دیں گے۔''

☆اچھے بھائی فراز! خوش آمدید! انشاء اللہ آپ کی تحریر جلد شائع ہوگی۔ بس تھوڑا سا انتظار مگر بھیا ایک وعدہ کرو اگلے ماہ سے اس احوال میں ہمیشہ حاضر رہو گے، وعدہ نا؟

☆ہماری بہن فرزانہ گل کوٹ مومن سے عرض گزار ہیں۔ ''اس بار شمارہ چند دن کی تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل پر بلی آنکھوں والی دوشیزہ جس کے دائیں گال پر چھوٹی سی بالوں کی لٹ تھی ٹھوڑی پر تل اور مسکراہٹ بجی تھی مگر اس کے عین نیچے لمبے لمبے نوکیلے دانتوں والی چڑیل اپنے شکار کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی تو میں نے ڈر کے مارے ٹائٹل ہی پلٹ دیا کہ کیا خبر یہ چڑیل رات کو خواب میں ڈراتی نہ رہے۔ خداوند عالم عبدالستار ایدھی صاحب کے درجات بلند فرمائے، (آمین)۔ احوال میں خطوط کی تعداد کافی تھی سب لوگوں نے اچھے تبصرے لکھے۔ کاشی بھائی جان میں ویسے پراسرار کہانیاں نہیں پڑھتی کیونکہ پڑھ کر مجھے ڈر لگتا ہے تو اس لیے کم ڈراؤنی کہانیاں پڑھیں جن میں سب سے پہلے نادیہ ملک کی ''وہ چتکبری بلی'' پڑھی جو کہ اچھی کہانی تھی۔ ثمینہ طاہر بٹ کی ''خمیازہ'' میں قارئین کو اچھا پیغام دیا گیا کہ خدا کی مخلوق خواہ انسان ہو یا جانور تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہیے۔ فرح انیس کی ''وہ میرا دولہا ہے'' پڑھ کر کپکپی طاری ہو گئی۔ ممتاز احمد کی لکھی کہانی ''رب کا انصاف'' ایک سبق آموز کہانی تھی۔ لائف بوائے شیمپو کی کہانی بہت پسند آئی۔ مجید احمد جائی بڑی دیر بعد پراسرار کہانی

لے کر آئے۔ بھائی جان آخر میں آپ کی ایک بار پھر ممنون ہوں کہ آپ نے حوصلہ افزائی کی تو اب میں بھی ایک کہانی لکھ رہی ہوں بہت جلد ارسال کر دوں گی۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔"

✿ بہن فرزانہ! کہانی فوراً لکھ کر بھیج دو تبصرے کا شکریہ۔

☆ کراچی سے ہماری ساتھی کرن شبیر لکھتی ہیں۔ "السلام علیکم کاشی بھیا! کیسے ہیں بھئی ہم آپ سے بہت خفا ہیں نہ کہانی کا کچھ اتا نہ خط کا کچھ پتا۔ بہت ناانصافی ہے لیکن ہم ناراضگی کو پرے رکھ کر احوال کا حصہ بننے چلے آئے۔ پھر سے پر اسرار محبت بہت خوب رہا۔ جاوید راہی کی "فریب نظر" بلاشبہ شمارے کی جان تھی۔ باقی خاص کہانیاں بھی متاثر کن رہیں۔ "بندر کا پنجہ" عبرتناک کہانی رہی۔ "فرعون کے مجرم" بنتِ حوا کا انداز تحریر بہتر رہا۔ قدرت کے راز وہی جانے۔ "آخری شرارت" مختصر مگر جامع تحریر رہی۔ منفرد کہانی اپنے عنوان کے عین مطابق رہیں۔ اوورآل پر اسرار نمبر 2 آپ کی اور آپ کی پوری ٹیم کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے لیے اتنا خوب صورت شمارہ ترتیب دینے کے لیے تہہ دل سے سب احوالیوں کی طرف آپ کا بے حد شکریہ۔ خدا تعالیٰ آپ کو اسی طرح کامیابی سے نوازے۔ پرانی کہانیاں لگتا ہے ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی ہیں؟ اپنا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

✿ پیاری کرن! تبصرہ لیٹ ملا تھا۔ اگلے ماہ شائع کر دیا گیا تھا۔ اب یہ دوسری بار تبصرہ آیا۔ لو یہ بھی شامل اشاعت ہوا کہانیاں بھی جلد شائع ہوں گی۔

☆ فیصل آباد سے بشریٰ کنول کچھ اس طرح عرض کر رہی ہیں۔ "اس بار اگست کا شمارہ پر اسرار نمبر 2 تھا۔ میں جادو ٹونے، بھوت پریت اور چڑیلوں والی کہانیاں نہیں پڑھتی کیونکہ کچھ خوف سا محسوس ہوتا ہے تو لہٰذا اس بار صرف احوال ہی پڑھا ہے۔ اس بار ہمیں ممتاز احمد، صائمہ مجید، خواجہ حسین، نزابت افشاں اور فیصل ندیم بھٹی نے یاد کیا۔ ویلکم کے ساتھ میرے خط کو پسند کیا تو آپ سب کا بے حد شکریہ۔ میرے شہر میں رہنے والی غزالہ کرن نے شاندار بڑے کھڑاک سے دی۔ بڑے ونگ تبصرے کے ساتھ۔ بڑی تیز ہو بھئی لگتا ہے کافی ڈائجسٹ پڑھتی ہو۔ عمارہ ناز نے اچھا تبصرہ لکھا۔ ویسے فیصل آباد کے مکینوں نے کافی رونق لگائی احوال میں (سن لو پاکستانیو!) مجموعی طور پر سچی کہانیاں کا معیار بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ کاشی بھیا آپ کی محنت نظر آتی ہے۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی اللہ پاک سب کو خوش و خرم رکھے اور سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔ اب اکتوبر کے شمارے میں ملاقات ہوگی۔"

✿ اچھی بشریٰ! یہ احوال تم سب کے تبصروں ہی سے سجتا ہے۔ جم جم آؤ۔

ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری اور آپ کی ملاقات پہنچی اپنے اختتام کو۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اگر خدا نے چاہا تو...... اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔

مصلحت کے چھاتے میں......

پیڑوں کے گرنے کی آوازیں گونج رہی ہیں
جڑیں رو رہی ہیں
بین پڑ رہے ہیں
عورتیں زیور نوچ رہی ہیں
صرافہ بازار سج رہے ہیں
انسانوں کے جنگل میں
انسان بک رہے ہیں
ہر بار اسٹیبلشمنٹ کے بعد
اس مٹی کے نیچے سے
"بچے" بلک رہے ہیں
اور
اُس مٹی کے اوپر
تاج محل بن رہے ہیں
پیڑ سب گرنے سے پہلے
زندہ باد! زندہ باد کہہ کر جل رہے ہیں
کچھ اِدھر بہک رہے ہیں
کچھ اُدھر بہک رہے ہیں
مگر بادشہ گر!!
مصلحت کے چھاتے میں
اب بھی چھپ رہے ہیں

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

لائف بوائے... صحت مند بنائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

جاڑے کے دن قریب آ رہے تھے۔ برسات کے بعد سے جاڑے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر سال لحاف کی روئی تبدیل کرا کر استعمال کرنے سے بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ ایک تو لحاف اپنی گرمائش کو برقرار رکھتے ہیں دوسرا روئی کی بھی عمر میں ہر برس نئے سرے سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں ابھی اسٹور سے لحاف نکال ہی رہی تھی کہ 'بھولی' ممیاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔

ارے چونکیے نہیں۔ بھولی میری بھیڑ ہے۔ میں اپنی بھولی کا بالکل اپنی 'ڈولی' کی طرح خیال رکھتی ہوں۔

'ڈولی' میری بیٹی...... میری آنکھوں کا نور...... میرے اور فیصل کے باغ کی انمول کلی...... ہماری اکلوتی بیٹی...... خدا نے ہمیں اولاد کی دولت سے نوازا تو ڈولی کی صورت ایک ہی پھول ہمارے دامن میں مہکا مگر اس مالک کا احسان ہے۔ ہمارے لیے ہماری زندگی بس 'ڈولی' ہی ہے۔

ڈولی گاؤں کے پرائمری اسکول سے پانچ کلاسیں پاس کر چکی ہے اور اب وہ چھٹی کلاس میں پڑھ رہی ہے۔ لیں میں بھی باتوں میں لگ گئی۔ ڈولی کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔

''میں میں...... میں......'' بھولی ممیا رہی ہے۔ اسے بھی ڈولی کا انتظار ہے۔ میں اب روٹی ڈالنے جا رہی ہوں۔ ڈولی بستہ پھینکتے ہی بھوک بھوک پکارنے لگے گی۔

☆......☆......☆

میں ڈولی ہوں...... اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد...... میری امی اور ابو میرے لیے دنیا کی ہر خوشی ڈھیر کر دینا چاہتے ہیں لیکن کچھ چیزیں خدا کے اپنے اختیار میں ہوتی ہیں۔ بندہ ان چیزوں کے حصول میں

بے بس ہوتا ہے۔ روزی اور رزق کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو خدا عنایت کرتا ہے۔ وہ ہے صحت، صحت جیسی انمول چیز شاید میری قسمت میں نہیں۔ صحت اچھی نہیں تو کچھ بھی اچھا نہیں۔ صحت کی خرابی ہی نے میرے بال بڑھنے نہ دیے اور میں نے بچپن سے اپنے سر پر ایک اسکارف بندھا دیکھا...... اور یہ اسکارف ہی میرا سب سے اچھا دوست بن گیا۔ مجھے کتنی اچھی لگتی ہیں میری ہم جماعت لڑکیاں، جب وہ اپنی لمبی لمبی چوٹیاں لہرا کر اٹھلاتی ہیں۔ کھلے بالوں کو ہلاتی ہیں مگر...... میں اُس سے اپنا دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ مالک کے کام ہیں یہ سب...... کس کے نصیب میں کیا ڈال دے...... ارے ہاں میری ایک ہی سب سے اچھی دوست ہے اور وہ ہے میری سہیلی 'بھولی' بھولی میری بھولی سی صورت والی بھیڑ...... میرے لیے کچھ برس پہلے ہی لائی گئی تھی۔ اب تو بھولی کے چار بھولے بھولے گولو گلو بچے بھی ہیں۔ بھولی میری صحت کے لیے تازہ دودھ کے لیے لائی گئی تھی۔ بھولی کی صبح شام کی میرے لیے یہ سیوا بھی میری صحت پر خاطر خواہ اثر نہ ڈال سکی۔

میں کبھی کبھی بھولی کے اوپر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس کے بھرے بھرے بالوں والے جسم کو دیکھتی تھی تو بھی میرے دل سے ہوک سی اٹھ جایا کرتی تھی مجھ سے اچھے تو اس بھولی کے بال ہیں...... خدا نے اسے اتنے حسین بال دیے ہیں۔ کیا تھا جو میرے بھی بال خوبصورت ہوتے...... شکوہ دل میں آ ہی جاتا تھا۔

☆......☆......☆

میرا نام حور بانو ہے۔ سنا تھا کہ لوگ گاؤں سے شہر ہجرت کرتے ہیں۔ مگر میرے ساتھ معاملہ ہی کچھ اور ہوا...... میں سوشیالوجی میں ماسٹرز کرنے کے بعد اپنی بچپن کی طے شدہ نسبت کے مطابق بیاہ کر عظیم احمد کی ہمراہی میں گاؤں آ گئی۔ شادی سے پہلے میں ٹیچرز بھرتی کا ٹیسٹ دے کر آئی تھی۔ شادی کے فوراً بعد میری تقرری کے احکامات آ گئے۔ انٹرویو وغیرہ کے بعد میرے موجودہ ہوم ٹاؤن (سسرال) میں میرا تبادلہ بطور HST (ہائر اسکول ٹیچر) کر دیا گیا۔

گاؤں کے ماحول میں مجھے ایڈجسٹ ہونے میں بہت مشکلات پیش آ رہی تھیں مگر سوشیالوجی کی تعلیم نے میرے تمام مسائل کا حل نکال دیا۔ اب میرا اِس گورنمنٹ مڈل اسکول میں خوب دل لگتا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اس نئے سیشن میں آنے والی فصیحہ فیصل کچھ زیادہ ہی ریزرو رہنے والی بچی تھی۔ مگر کیوں......؟

بچیاں تو ہنستی بولتی ہی اچھی لگتی ہیں مگر فصیحہ......! یہ سب سے الگ تھلگ بھلا کیوں رہتی ہے۔ سر پر اسکارف بھی یوں ہوتا جیسے بڑی کلاس کی لڑکیاں لگاتی ہیں۔ میرا نظریہ تھا کہ اسکول کی اس لائف کو سب بچیاں بے فکری سے انجوائے کریں گی تو تعلیم حاصل کرنے میں اُن کو بہت لطف آئے گا اور پڑھائی میں لگن کے ساتھ ان کے اندر کے جوہر باہر آ کر ایک بہترین اسٹوڈنٹ میں ڈھل جائیں گے۔

میرے لیے فصیحہ ایک پہیلی سی بن گئی تھی

اور میں جلد اس پہیلی کو بوجھنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

''میری گڑیا! آج اتنی دیر لگا دی۔'' صفیہ نے ڈولی کو چومتے ہوئے اسکول سے پندرہ منٹ لیٹ ہونے پر استفسار کیا تھا۔

''سوری امی! اسکول میں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا...... سچ میں امی میرا دل کرتا ہے کہ کلاس ختم ہی نہ ہو اور مس حور ہمارے سامنے رہیں۔'' ڈولی مس حور بانو سے از حد متاثر تھی۔ پرائمری اسکول میں تو وہ سمجھو جان چھڑاتی تھی مگر اب جب سے پانچ کلاسیں پاس کر کے مڈل اسکول میں آئی تھی۔

مس حور بانو اس کی کلاس ٹیچر تھیں اور وہ سب کی فیورٹ ٹیچر تھیں۔ اُس نے اکثر محسوس کیا تھا کہ اُن کی شفقت اس پر کچھ زیادہ تھی مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ اُسے کسی سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ اتنی کمزور سی بچی کو دیکھ کر لوگ مذاق اڑاتے تھے۔ اور اسے اپنا مذاق بننا قطعاً پسند نہ تھا۔

''کہاں کھوگئی میری گڑیا!'' صفیہ نے قریب آ کر بیٹی کا اسکارف اتارا تھا۔ اُس کے بال عجیب گھاس جیسے اُگتے تھے۔ صحت تو جیسے تھی ہی نہیں۔ بھولی کو بھی ڈولی کے لیے خریدا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا تھا کہ بھیڑ کا دودھ بھی شفا کے ساتھ ساتھ صحت بخش ہوتا ہے۔

''امی جان! کیا میں ایسی ہی رہوں گی ہمیشہ۔'' ڈولی نے اپنے سوکھے کمزور جسم پر نظر ڈالتے ہوئے حسرت سے کہا تھا۔ اُس کی بات سن کر صفیہ کے چہرے پر ایک سایا سا لہرا گیا تھا اور آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

''میری گڑیا! انشاء اللہ، اللہ تجھے بھی صحت دے گا۔ تین وقت پیٹ بھر کر کھانا کھایا کرو۔ سب کچھ عمر کے ساتھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' صفیہ طفل تسلیاں دیتی ہوئی بولی تھی۔

''سب کچھ تو وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا مگر امی......!'' وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے اپنے اسکارف پر نظر ڈالتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''امی! یہ بال...... یہ سوکھے گھاس جیسے بال بھلا کس طرح ٹھیک ہوں گے۔ ان بالوں کی نشوونما کے لیے بھی یہی عمر ہوتی ہے ورنہ ساری عمر بال ایسے ہی رہیں گے۔'' ڈولی یہ بول کر درزیدہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی تھی۔

''یوں ناامید نہیں ہوتے میری بچی...... تیری صحت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا چلو تم کھانا کھالو۔'' صفیہ اُسے اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

اسکول میں آج بہت گہما گہمی تھی۔ بالوں کے متعلق آگاہی دینے والی لائف بوائے شیمپو ٹیم اپنے وزٹ پر تھی۔ وہ سب کے بال چیک کر کے شیمپو سے دھو کر ٹیسٹ کر رہے تھے اور پروجیکٹر کے ذریعے ایک ڈاکومنٹری فلم چلاتے اور بتاتے کہ بچوں کی صحت کے لیے صفائی ستھرائی کی کتنی اہمیت ہے۔ حور بانو کافی دیر سے محسوس کر رہی تھیں کہ کچھ Missing ہے اور پھر پتا چلا کہ فصیحہ وہاں موجود نہیں تھی۔ حور بانو فوراً وہاں سے نکلیں اور فصیحہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر بڑے درخت کے پیچھے بنی بینچ پر اُسے جا ہی لیا۔

"فصیحہ آپ اِدھر کیوں بیٹھی ہو بیٹا......؟"

"مس بس ایسے ہی...... مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا وہاں...... اس لیے میں اِدھر چلی آئی۔" اُس نے اسکارف والا سرا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز بیٹا...... ایسے نہیں کرتے...... سب مل کر پارٹی سپیٹ کرتے ہیں۔" حور بانو سمجھانے لگیں۔

"مس آپ نہیں سمجھتی ہیں...... میں اپنا سر نہیں دھلوا سکتی ٹیسٹ کے لیے۔"

"کیوں بیٹا...... بولو کیا بات ہے؟"

"مس وہ میرے بال......" اتنا کہہ کر فصیحہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"اسکارف اُتارو...... کیا ہوا ہے تمہارے بالوں کو......" حور بانو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ اُس کا سر دیکھنے پر مصر ہو گئیں۔

مجبوراً فصیحہ کو اسکارف اُتارنا پڑا۔ حور بانو پہلے تو اس کے کمزور جسم کو دیکھ کر ہی اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو رہا کرتی تھیں اب جو اس کا سر دیکھا تو گھاس پھوس جیسے بالوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

"تم نے کوئی ٹریٹمنٹ لی بیٹا......"

"مس یہ گاؤں ہے۔ میری امی اور ابو میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بھولی کو بھی میرے لیے خریدا تھا انہوں نے...... مس اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے بھلا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"بھولی...... یہ کون ہے فصیحہ......"

"مس مجھے پیار سے ڈولی کہتے ہیں نا اس لیے میرے لیے حکیم صاحب کے کہنے پر بھیڑ کا تازہ دودھ استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی تو جو بھیڑ لی ابو نے، اُس کا نام ہم نے بھولی رکھ دیا تھا۔"

حور بانو اُسے لے کر کلاس میں آئیں۔ اور اُسے تلقین کی کہ پریشان نہ ہو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد حور بانو اس ٹیم کی ایکسپرٹ میڈم سنبل کے پاس تھیں۔

"میں آپ کا مسئلہ سمجھ گئی ہوں۔ آپ بچی کو ذرا بلوائیے۔" ہیئر ایکسپرٹ میڈم سنبل نے حور بانو کا فصیحہ کے لیے پریشان ہو کر مسئلہ کی جانکاری لینے کے بعد کہا تھا۔

کچھ دیر بعد فصیحہ اُن کے سامنے تھی۔ سنبل صاحبہ نے فصیحہ کا اسکارف اُتار کر اس کے سر کا معائنہ کیا اور اس کے کمزور جسم کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"میڈم آپ بھی میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔" فصیحہ آنسو پیتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں بیٹا...... میں مذاق نہیں اڑا رہی بلکہ اس لیے مسکرائی تھی کہ تمہاری کمزوری کی اصل وجہ خوراک نہیں بلکہ صفائی ہے۔ تمہارے بال اس حالت میں اس لیے ہیں کیونکہ تم لوگ جراثیم سے بھرپور پانی استعمال کرتے ہو۔ بال صحت مند ہوں تو آدھی بیماری وہ خود ہی ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے تمہیں اپنے بالوں کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر میڈم سنبل نے بیگ سے ایک شیمپو کی بوتل نکال کر مس حور بانو کو دی۔

"یہ کیا ہے میڈم!"

"یہ ہے علاج اس کمزوری کا...... لائف بوائے شیمپو نیا لائف بوائے شیمپو روغن بادام

اور دودھ کی طاقت کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ جو بالوں کی صحت کا ضامن ہے۔ بالوں کو قدرتی تحفظ دیتا ہے۔ بالوں کو مضبوط توانا اور گھنے کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنے بالوں کے کمزور ہونے سے پریشان ہیں تو اپنی پریشانی لائف بوائے شیمپو کے سپرد کر کے آرام کریں۔ لائف بوائے شیمپو اپنا کام آپ ہی آپ کرلے گا۔''

''مگر میڈم یہ تو میرے بالوں پر کام کرے گا۔ میرے کمزور جسم کا اس سے کیا تعلق......'' اب فصیحہ لائف بوائے شیمپو کی بوتل پکڑے میڈم سنبل سے سوال کر رہی تھی۔

''گڈ کوئسچن...... آپ اس شیمپو کو بالوں میں باقاعدہ استعمال کریں۔ آپ کے بال نشوونما پانے لگیں گے اور ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ ٹریٹمنٹ اسٹارٹ ہو گیا۔ پھر یہ نشوونما پاتا ہوا حصہ جسم کے باقی حصوں پر بھی اثر دکھائے گا۔ آپ کے بال صحت مند ہوتے ہی آپ کو اَن دیکھا ہیلتھ دیں گے اور آپ دیکھتے ہی دیکھتے اس کمزوری سے چھٹکارا پالیں گی۔ میرا خیال ہے باتیں ہم سب بہت کرتے ہیں اور عمل کم...... اب یہ باتوں کا وقت نہیں بیٹا عمل کا وقت ہے۔ جاؤ اور لائف بوائے شیمپو کے کمال دیکھو۔''

میڈم سنبل سے رخصت لے کر حور بانو اور فصیحہ کلاس میں آگئیں۔

''فصیحہ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آج تمہاری خدا نے سن لی ہے اور وہ دن دور نہیں جب تمہیں اس اسکارف سے نجات بھی مل جائے گی۔''

حور بانو نے یقین سے کہا اور فصیحہ کو لگا۔ جیسے اس کی دعا قبول ہوتے ہی ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا تھا۔

☆......☆......☆

صفیہ نے حور بانو کے کہنے کے مطابق جب پانی کو اُبال کر جراثیم سے پاک کر کے فصیحہ کے بالوں پر لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کیا تو شروع میں کوئی فرق نہ پڑا مگر پھر آہستہ آہستہ جیسے جادو ہو گیا۔ فصیحہ کے بال بہت تیزی سے نشوونما پانے لگے تھے۔ تین ماہ کے بعد تو جیسے فیصل اور صفیہ اپنی بیٹی کے بال بھی پہچان نہ سکتے تھے کہ یہ سوکھی گھاس، لہراتی ہوئی فصل میں کیسے تبدیل ہوگئی۔ ادھر بال گھنے ہو رہے تھے اور ادھر میڈم سنبل کے کہنے کے عین مطابق فصیحہ کا کمزور جسم بھی کچھ بھر گیا تھا۔

صفیہ کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ وہ اپنی بچی کے لیے تارے تک توڑ کر لاسکتی تھی مگر صحت کا حصول صرف ایک لائف بوائے شیمپو کی بوتل تھا۔ واقعی لائف بوائے شیمپو نے ثابت کر دیا تھا کہ لائف بوائے...... صحت مند بنائے۔

اور آج اسکول میں حور بانو فصیحہ کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں بلکہ اب وہ اس انٹرنیشنل کوالٹی کے شیمپو کو اپنے گاؤں بھر کے گھروں کی بچیوں اور بچوں کو استعمال کرتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ لائف بوائے شیمپو نے اپنی افادیت سے ثابت کر دیا تھا کہ لائف بوائے شیمپو ہر گھر کی ضرورت ہے اور بالوں کے تمام مسائل حل کر کے صحت کی طرف پہلا قدم بھی ہے۔

☆☆☆......☆☆☆

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے کوسوں دور بیابان
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

وی آئی پی



محمد سلیم اختر

اپنی مٹی سے ہٹ کر چلنے والوں کے لیے ایک آئینہ تحریر

وہ اگست کی ایک گرم شام تھی۔ جب عدالت خان کا باپ انتقال کر گیا۔ عدالت خان بلدیاتی الیکشن کے حوالے سے ہونے والی پارٹی کی میٹنگ میں ضلعی آفس گیا ہوا تھا۔ باپ کے انتقال کی خبر ملتے ہی وہ اسی رات



لوٹ آیا۔ صبح اس کے آبائی گاؤں سے اس کا چچا فیض عالم بھی اس کے گھر پہنچ گیا۔ باپ کے فوت ہو جانے کے غم کے ساتھ ساتھ یہ سوال اٹھا کہ عدالت کے باپ خانو کا جنازہ کہاں سے اٹھایا جائے اور اسے دفن کہاں کیا جائے۔ عدالت کے چچا کا اصرار تھا کہ میت آبائی گاؤں لے جائی جائے اور گاؤں ہی کے قبرستان میں دفن کیا جائے مگر عدالت کی رضا مندی اس کی بیوی رضیہ کی رضا مندی سے مشروط تھی۔ جو جنازہ بھی کالونی کے پارک میں پڑھوا کر کالونی کے قبرستان میں ہی دفنا نا چاہتی تھی۔

''دیکھو عدالت!'' اس کا چچا اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''ہماری ساری برادری وہاں ہی رہتی ہے بھائی صاحب کی جان پہچان کے لوگ، ان کے لنگوٹیے حکیم ولی داد۔ حاجی اسلم بھی ابھی تک پرانے محلے میں ہی رہتے ہیں۔ تمہاری ماں کی وفات پر گاؤں والوں نے کس قدر تعاون کیا تھا۔ خوشیا بٹ کے بیٹوں کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ''عدالت خان! ماں جی کی میت ایمبولینس میں نہیں جائے گی۔'' اور وہ چلچلاتی دھوپ میں جنازہ کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں لے گئے تھے۔''

عدالت خان، چچا فیض عالم کی باتیں سن کر کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور اس کی بیوی رضیہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔

''دیکھو ناں چچی جان! اب گاؤں میں کوئی کیسے واپس جا سکتا ہے؟ خیر سے عدالت کا اب ایک مقام اور نام ہے۔ پورے شہر میں اس کے دوست احباب اور پارٹی ورکر پھیلے ہوئے ہیں۔ کون جانا پسند کرے گا گاؤں کی گندی گلیوں میں۔ بس جنازہ اسی کالونی سے اٹھے گا اور یہی مناسب ہے۔ برادری والوں کو چاہت ہو گی تو خود بخود پہنچ جائیں گے اسی طرح جیسے آپ اور چچا جان آئے ہیں۔''

☆......☆

عدالت کا گاؤں شہر کے قریب ہی تھا۔ اس کا تعلق کمہاروں کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ خانو اور چچا فیض عالم یہی کام کرتے تھے۔ ان کے مٹی کے بنے برتنوں کی شہرت دور دور تک تھی مگر دالو (عدالت) کو اس کام سے نفرت تھی۔ وہ پکی پکائی کھانے کا عادی تھا اور باپ کا ہاتھ کم ہی بٹاتا تھا اور آوارہ دوستوں کے ساتھ مل کر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ اس کا باپ اس کی ان عادتوں سے تنگ تھا اور بہت کڑھتا رہتا تھا۔ دالو اب جوان ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے مگر وہ تو ان پڑھ تھا۔ نوکری ملنی اس کے نصیب میں نہ تھی۔ اس کے نصیب میں مٹی کے برتن بنانا ہی لکھا تھا مگر وہ اس کام سے دور ہی بھاگتا تھا۔ اس نے قد کاٹھ خوب نکالا تھا۔ اس کا شمار گاؤں کے گبھرو جوانوں میں ہوتا تھا۔ رضیہ اس کی برادری کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں کے گھر والوں کو بھی ان کی چاہت کا علم تھا اور وہ اس رشتے پر رضا مند بھی تھے مگر رضیہ کے والدین کی یہ شرط تھی کہ جب تک دالو کمانے نہ لگے تب تک وہ رضیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔

ان دنوں بھی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہو رہے تھے اور انتخابی مہم زور و شور سے جاری تھی۔ اس حلقے میں ایم این اے کا جلسہ ہونا تھا۔ پارٹی ورکر جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے علاقے کے لوگوں کو قائل کر رہے تھے۔ مخالف پارٹی کا امیدوار بھی کمزور نہ تھا، حلقہ میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ دونوں امیدواروں کے جلسے کامیاب جا رہے تھے۔ جلسے میں موجود لوگوں کی تعداد ایک جیسی ہی لگتی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ کئی لوگ دونوں امیدواروں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اپنی خوشی سے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر لوگوں کو کرایہ پر لایا جاتا ہے۔ وہ دونوں امیدوار بھی ایسا ہی کر رہے تھے۔ ان میں دالو بھی شامل تھا۔ اسے جلسہ میں شرکت کے لیے پانچ سو روپے دیا گیا تھا۔ دالو کی خوشی کی تو انتہا ہی نہ تھی۔ اسے مفت میں پانچ سو روپے مل گئے تھے۔ پارٹی ورکر نے دالو سے کہا کہ اگر وہ جلسہ میں نعرے لگائے گا تو اسے مزید پانچ سو ملیں گے۔ دالو اس پر بھی راضی ہو گیا۔ پارٹی ورکر نے دالو کو دو تین نعرے زبانی یاد کرا دیے تھے۔ جلسے کے دوران جب دالو نے نعرے لگائے۔

''ملک ارمان آوے ہی آوے۔ ملک ارمان زندہ باد۔'' تو جلسے میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا۔ کیونکہ ایک تو دالو کی آواز اتنی بلند تھی کہ اسپیکر کی بھی ضرورت نہ تھی اور اس پر اس کا نعرے لگانے کا انداز اس قدر بھرپور اور اثر انگیز تھا کہ بار ہا دالو سے نعرے لگوانے کی فرمائش ہونے لگی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دالو ملک ارمان کے ہر جلسے کی ضرورت بن گیا۔ دالو کی جیب اب نوٹوں سے بھری رہنے لگی۔ ملک ارمان نے اسے پارٹی ورکر بنا دیا اور اس کو اپنی انتخابی مہم میں مستقل طور پر شامل کرلیا۔ دالو کی خوش قسمتی کہ ملک ارمان جیت گیا۔

دالو کے بھی دن پھر گئے۔ ملک ارمان نے دالو کو اپنے شہر والے دفتر میں بلوالیا اور اس کو کچھ ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اس کو ماہانہ تنخواہ بھی ملنے لگی۔ یوں دالو کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا۔ اس کی مالی حالت بہتر ہوگئی اور صفیہ سے اس کی شادی بھی ہوگئی۔ پھر جب ملک ارمان کو کابینہ میں شامل کیا گیا اور اسے وزیر بنا دیا گیا تو دالو...... دالو سے عدالت خان بن گیا اس کے دن پھر گئے۔ اس نے ایک کالونی میں کرائے پر گھر لیا۔ رضیہ اور ماں باپ کو بھی شہر لے آیا۔ اب تو عدالت خان کے اطوار ہی بدل گئے۔ وہ اپنے رشتے داروں کو خاطر میں ہی نہ لاتا۔ رضیہ بھی اس کے ہی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے آپ کو اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں شمار کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج عدالت خان اپنے باپ کی میت کو گاؤں کے قبرستان کے بجائے شہر کے قبرستان میں دفن کرنا چاہتا تھا کیونکہ ان دونوں نے گاؤں والوں سے ہر تعلق ختم کرڈالا تھا۔

☆......☆

گھر کے سامنے والے گراؤنڈ میں شامیانے لگنے شروع ہوگئے تھے۔

رضیہ نے صبح سویرے ہی بڑے کمرے اور ڈرائنگ روم کے پرانے پردے تبدیل کردیئے تھے۔ نئی بیڈ شیٹس بھی بچھا دی تھیں۔ صوفوں اور تکیوں پر خوب صورت پھولدار کور چڑھا دیئے گئے۔ ڈرائنگ روم میں بڑے صوفوں اور آرام کرسی کے درمیان رکھی ہوئی میز پر عدالت خان کی ملک ارمان کے ساتھ اتری ہوئی تصویر سجا دی گئی۔ رضیہ بے چینی کے عالم میں بار بار پوچھتی تھی۔

''عدالت! لوگ آئیں گے نا آئیں گے نا...... تمہیں یقین ہے نا۔ عدالت؟''

''ہاں بھئی تمام دوستوں کو ٹیلی فون کردیئے ہیں۔ اخبار میں بھی مع تصویر خبر لگ چکی ہے۔''

''عدالت! وہ جو کونے والے گھر میں مہتاب خان رہتے ہیں۔ ان کے والد کی وفات پر تو بہت سارے لوگ آئے تھے۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئی تھیں۔ کس شان سے جنازہ اٹھا تھا۔ کئی دنوں تک لوگوں کا آنا جانا لگا رہا تھا۔''

رضیہ بولے جارہی تھی اور عدالت کے ماتھے پر پسینے کی لکیریں پھیلنے لگی تھیں۔ عدالت وزیر بہبود آبادی ملک ارمان کے سیکریٹری سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ وزیر صاحب کا پرائیویٹ سیکریٹری نواز گھر سے دفتر کے لیے نکل چکا تھا اور اس کے دفتر کے سارے ٹیلی فون مصروف مل رہے تھے۔ نواز اور عدالت کی اچھی ہیلو ہائے تھی۔ بالآخر نواز کا فون مل گیا۔

''نواز صاحب! ابو چل بسے۔''

''ہاں میں نے اخبار میں پڑھ لیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میں تمہیں ٹیلی فون کرنے والا تھا۔ جنازہ کتنے بجے اٹھایا جائے گا؟''

''چار بجے...... یہیں میرے ہاں سے۔ ایک بات ہے نواز دیکھو تم چاہو تو ایسا ہوسکتا ہے کیا تم ملک ارمان کو لا سکو گے؟ ان کو میری پارٹی کے لیے خدمات یاد ہوں گی۔ نواز! جنازے کا وقت آگے پیچھے ہوسکتا ہے بس تم کسی طرح ان کو میرے ہاں ضرور لانا۔''

''ہاں ہاں...... میں کوشش کروں گا لیکن ابھی ان کی مصروفیات کا پروگرام فائنل نہیں ہو پایا۔ جوں ہی پروگرام مرتب ہوا میں تمہیں مطلع کردوں گا۔ تم یقین رکھو میری پوری کوشش ہوگی۔ وزیر صاحب آئیں گے۔''

جوں ہی فون بند ہوا رضیہ، عدالت کا بازو تھام کر وزیر صاحب کی آمد کا پوچھنے لگی۔

''امید ہے۔''

"عدالت! میرا دل کہتا ہے جنازہ بڑے پروقار طریقے سے اٹھایا جائے گا۔"

عدالت جو ڈرائنگ روم کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ چھوٹی تپائی باہر نکال دی گئی کمرے کی ترتیب میں قدرے ردوبدل کر دیا گیا۔

"ہاں ناصر! سنو۔" عدالت نے اپنے عم زاد سے کہا۔ "تمہیں تصویریں بنانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ وزیر صاحب دائیں جانب سے اس کمرے میں داخل ہوں گے اور اس بڑے صوفے پر براجمان ہوں گے اور میں میز کی بائیں جانب صوفے والی کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور سامنے چچا فیض عالم ہوں گے تمہیں یہ سب کچھ کور کرنا ہوگا۔ دیکھو تصویر صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ بڑی احتیاط اور نفاست سے کام کرنا ہوگا۔ نروس مت ہو جانا۔ یہ تصاویر اخبار کو بھی بھجوانی ہوں گی اور ہاں وزیر صاحب کی ملاقات کے دوران کوئی بچہ اندر داخل نہیں ہوگا۔

☆......☆

ملنے والوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ عدالت کا ایک دوست قبر کی کھدائی کے سلسلے میں قبرستان گیا ہوا تھا۔ چچا کا بیٹا رحیم داد کفن اور پھولوں کی چادر لینے گیا ہوا تھا۔ ناصر نے غسال سے بات کر لی تھی شامیانوں کے اندر دریاں بچھا دی گئی تھیں اور کرسیاں اطراف میں قرینے سے رکھ دی گئی تھیں۔ پارکنگ کے لیے خاصی جگہ تھی۔ لوگوں کا ہجوم زیادہ ہونے کی صورت میں چھوٹی گراؤنڈ میں بھی پارکنگ کرائی جا سکتی تھی۔ ماں کی وفات پر عدالت کو تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ کئی جاننے والے محض گاؤں میں سڑک نہ ہونے کی وجہ سے جنازے میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ عدالت تمام انتظامات سے مطمئن تھا۔ اس کو اب نواز کے فون کا انتظار تھا تا کہ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت کا اعلان کیا جا سکے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز کا فون آ گیا۔

"بھئی صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ وہ آنا چاہیں گے مگر چار بجے ممکن نہ ہو سکے گا۔ چار بجے وزیر صاحب نے آرٹس کونسل میں ایک نمائش کا افتتاح کرنا ہے۔ پانچ بجے منسٹری کے ہڑتالی عملے سے مذاکرات ہیں اور ساڑھے پانچ بجے تک علاقے کے کونسلروں کے ساتھ ایک غیر رسمی ملاقات ہے۔ ساڑھے چھ بجے ہی آنا ممکن ہوگا۔"

"ٹھیک ہے نواز! جنازہ ساڑھے چھ بجے ہی اٹھایا جائے گا لیکن اب پروگرام فائنل رکھنا۔ تم تو سمجھتے ہو ناں۔ بڑی سبکی ہوگی۔"

کالونی کی مسجد سے عدالت کے والد کی وفات کا اعلان ہوا کہ جنازہ ان کی رہائش گاہ سے ساڑھے چھ بجے اٹھایا جائے گا۔"

تمام کالونی میں بات پھیل گئی کہ وزیر بہبود آبادی ملک ارمان جنازے میں شرکت کے لیے آنے والے ہیں۔ دوستوں، رشتے داروں کو ایک بار پھر تاکید کر دی گئی کہ سبھی حضرات وقت پر آ جائیں نماز جنازہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے پڑھا دی جائے گی۔"

☆......☆

رضیہ کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں مدھم تو نہ ہوئی تھیں مگر ذہنی دباؤ خاصا کم ہو گیا تھا۔ ایک سال قبل وہ اس کالونی میں منتقل ہوئے تھے تو کسی نے بھی ان کو قابل توجہ نہیں جانا تھا۔ آس پاس رہنے والوں میں سے کوئی بھی تو ملنے نہ آیا تھا۔ عدالت اور رضیہ اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی محسوس کرتے تھے۔ رضیہ اپنے پڑوسیوں سے ملنے جلنے کی بہت کوشش کر چکی تھی مگر کسی نے بھی اس کو گھاس نہ ڈالی تھی۔ کیونکہ وہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ رہتے تھے۔ پائے خان اور گریڈوں کے مارے لوگ۔ ان کے نزدیک عدالت اور رضیہ کی بھلا کیا حیثیت تھی۔ اس لیے رضیہ کا چہرہ اکثر اترا سا رہتا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب عدالت کے دوست آئے تھے مگر ابھی تک شامیانے کے اندر خاصی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔

رحیم داد کا بیٹا کریم داد بھاگتا ہوا اندر آیا اور بولا۔ "چچا عدالت! وہ آ گئے وہ آ گئے۔"

"کون......! وزیر صاحب؟ وقت سے پہلے ہی۔ نواز ساتھ ہے ناں۔ دیکھو ناصر کو بلاؤ اسے کہنا کیمرہ بھی لیتا آئے۔"

"نہیں چچا! وہ دادا ابو کے دوست حاجی اسلم اور خوشیا بٹ آئے ہیں۔"

حاجی اسلم اور خوشیا بٹ نے عدالت کو دیر تک گلے لگائے رکھا۔ تسلیاں دیں۔ خوشیا بٹ تو عدالت کو دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ''او عدالت پتر! یہ کیا ہو گیا ہے؟ تو نے اطلاع ہی نہیں دی۔ یار! خانو ہماری بیلی تھا۔ لنگوٹیا تھا۔ ہم ایک ساتھ کھیلے ہیں، تیرے ابے کو کیا ہو گیا تھا او ساڈا بیلی چلا گیا۔ ساڈا سنگی۔ ہن ساڈی واری اے۔''

خوشیا پہلوان زور زور سے سر اور سینہ پیٹنے لگا۔

عدالت نے ناصر کے کان میں آہستگی سے کہا۔

''یار! اس بٹ کو ایک کونے میں بٹھا دو اور خدا کے لیے اسے چپ کراؤ۔ یہ کوئی جھگڑوں کا محلہ تو نہیں ہے یہ نہ ہی آتا تو بہتر تھا۔''

☆......☆

میت کو غسل دے کر دالان میں رکھ دیا گیا۔ چچی زبیدہ پریشانی کے عالم میں اندر باہر ہو رہی تھیں۔

''رضیہ! مسئلہ کیا ہے؟ جنازہ کیوں نہیں اٹھایا جا رہا؟ بھئی کل شام کی موت ہوئی ہے۔ پھر شام ہونے والی ہے۔ میت کا پیٹ بھی پھول رہا ہے اور حکم بھی یہی ہے کہ مردے کو جلد از جلد دفنا دیا جائے۔''

چچا فیض عالم بھی بار بار کہہ رہے تھے۔ ''جنازہ اٹھایا جائے۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ سبھی لوگ آ چکے ہیں اب کس کا انتظار ہے۔ اب گاؤں سے اور کوئی نہیں آئے گا۔''

''بس ایک وی آئی پی کو آنا ہے۔'' رضیہ آہستہ سے بولی۔ ''وزیر صاحب آنے والے ہیں۔''

☆......☆

چھ بج چکے تھے مگر وزیر صاحب کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ انتظار کرتے کرتے سات بجے جنازے کو ساتھ کے گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔

''حضرات! یہ سفرِ آخرت ہے۔ مٹی ہی ہماری منزل ہے اور مٹی ہی میں ہم سب کو جذب ہو جانا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ یہ دولت، یہ شہرت اور یہ رتبہ سب ناپائیدار ہیں۔ اللہ ہمیشہ رہنے والا اور رحم کرنے والا ہے سب تعریفیں اس عظیم ذات کے لیے ہیں بس اس کی اطاعت کرو۔ اس کے آگے جھک جاؤ اور نیک عمل کرو۔''

امام کی آواز گونج رہی تھی۔ جماعت نماز کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اتنے میں ہوٹر کی آواز سنائی دی۔

''مولوی صاحب ٹھہریئے۔'' عدالت قطار سے باہر نکل آیا۔ ناصر بھی پیشوائی کے لیے بھاگا اور پھر واپس آ کر خبر دی۔ ''نہیں بھائی! کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ کوئی ٹریفک سارجنٹ تھا۔ وہ دوسری طرف نکل گیا ہے۔''

جنازہ اٹھا لیا گیا۔ ''کلمۂ شہادت۔''

جنازے میں گاؤں کے بہت سے لوگ شامل تھے۔ رشتہ دار، برادری والے بھی مگر کالونی میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ خوشیا بٹ پہلوان کے بیٹوں نے جنازہ کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ خوشیا کے آنسو اب بھی خشک نہیں ہو رہے تھے۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔

ابھی جنازہ چند قدم ہی چلا تھا کہ عدالت کے گھر سے کسی نے آواز دی۔ ''نواز کا فون ہے۔''

عدالت بھاگ کر گھر آیا اور فون کان سے لگا لیا۔

نواز کہہ رہا تھا۔

''عدالت بھائی! میں معافی چاہتا ہوں۔ وزیر صاحب نہیں آ سکتے۔ انہیں وزیراعظم نے کال کر لیا ہے وہ اب شاید کسی دن تمہارے ہاں آئیں۔''

فون عدالت کے ہاتھوں سے گر گیا اور وہ بے سدھ ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ان کو آنا چاہیے تھا کسی کو تو آنا چاہیے تھا۔ جنازے کے ساتھ ایک بھی وی آئی پی نہیں تھا ایک بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں نواز بھی نہیں۔''

''عدالت! حوصلہ کرو۔ ایسا ہو جاتا ہے رب کو یہی منظور تھا۔ صبر کرو۔'' رضیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کلمۂ شہادت۔ کلمۂ شہادت۔'' جنازہ چل پڑا تھا۔

عدالت لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور آہستہ آہستہ جنازے کے پیچھے چلنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پاؤں پتھر ہوئے جا رہے ہیں اور کالونی کے گھروں کی کھڑکیوں سے قہقہے نکل رہے ہوں۔ خوشیا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور عدالت کو دیکھ کر رک گیا۔ عدالت کی نظر خوشیا پر پڑی تو وہ جا کر اس کے گلے لگ گیا۔

''خوشیا چاچا۔'' عدالت بھیگی آواز میں بولا اور پھر وہ دونوں جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ دالو کو حقیقی VIP مل گیا تھا۔

☆☆☆

سیاہی پھیلی ہے ہر طرف

اُمِ مناہل

اُس کرموں جلی کی بپتا، جس نے اپنے آشیاں کو آپ پھونکا تھا

میرا جنم بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) کے شہر ڈھاکہ میں 1958ء کو ہوا۔ میرے بابا جان انڈیا کے شہر امروہہ کے رہنے والے تھے جب کہ امی مقبوضہ کشمیر کے ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں حسن میں اپنی مثال آپ تھیں اس لیے نانا نانی نے ان کا نام حور بانو رکھا ہوگا۔ میرے بابا جان دادا جان کے ساتھ ان کے دوست کے بیٹے کی شادی میں کشمیر گئے تھے وہیں بابا جان نے امی کو دیکھا پسند کیا اور شادی کی ضد کر بیٹھے۔ چند ملاقاتوں اور چھان بین کے بعد یہ رشتہ طے پا گیا اور چند ہی ماہ میں امی دلہن بن کر بابا جان کے گھر آ گئیں۔ یہ 1945ء کا دور تھا۔ تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ افراتفری کا عالم تھا اور ہر طرف بٹوارے کی آگ لگی ہوئی تھی مگر شکر ہے ہمارے آباؤ اجداد باحفاظت ڈھاکا ہجرت کر گئے۔

☆......☆

شادی کے بعد میرے ماں باپ کے گھر اولاد کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر دوسرے برس نئی بیٹی کی آمد ہوتی گئی۔ یوں بیٹے کی آس میں پوری سات بیٹیاں میرے والدین کے آنگن میں اتر آئیں اور ہر بیٹی کی پیدائش پر میری ماں کو دادی پھوپھیوں کی طرف سے طلاق کی دھمکی ملتی رہی ساتویں نمبر پر جب میری پیدائش ہوئی تو دادی بری طرح سے بپھر گئیں ان کا اشتعال دیکھنے والا تھا۔ وہ ہر قیمت پر امی کو طلاق دلوانا چاہتی تھیں اور اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتیں مگر بابا کی ثابت قدمی دادی کے فیصلے پر حاوی ہو گئی۔ بابا کہتے "اگر میرے نصیب میں بیٹا ہوا تو حور بانو سے ہی ہو جائے گا اور اگر نہیں ہوا تو میں اللہ کی رضا میں خوش ہوں۔ نہ میں حور بانو پر سوتن لا سکتا ہوں اور نہ ہی طلاق دینے کا تصور کر سکتا ہوں۔"

بابا کی محبت امی کے آنسوؤں کو خشک کر دیتی۔ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں اور یہ رحمت اللہ تعالیٰ بے دریغ میرے ماں باپ پر لٹا رہا تھا مگر میری دادی پھوپیاں نہ جانے کیسی تھیں جنہیں اللہ کی رحمت سے چڑ تھی۔ تقدیر کے فیصلے تدبیر کے فیصلوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ تقدیر کا صرف ایک فیصلہ تدبیر کے ہزار فیصلوں کی نفی کر دیتا ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

بابا کی محبت امی کے لیے مشعل راہ بنی تو اللہ کو میرے ماں باپ پر رحم آ ہی گیا۔ میرے بعد شرجیل کی پیدائش امی کے رستے زخموں پر مرہم ثابت ہوئی۔ سب سے زیادہ تو دادی پھولے نہ سمائیں۔ شرجیل کی پیدائش پر دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں۔ خوب لنگر تقسیم ہوا۔ بابا نے یتیم خانوں میں دیگیں اور یتیموں، بیواؤں میں جوڑے تقسیم کیے۔ خوب نیاز نذر کی گئی۔ امی بتاتی تھیں پورے پندرہ دن تو خواجہ سراؤں نے دھمال ڈالا تھا۔ بابا اکلوتے تھے اور چار پھپیاں تھیں۔ دادا کی دُعا کہ میں اپنی زمینیں تھیں جو انہیں ہجرت کے بعد کلیم میں ملی تھیں۔ اس لیے ہمیں معاشی طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بھائی کی خوشی دادی کے لیے عارضی ثابت ہوئی۔

شرجیل ابھی پچیس دن کا ہی ہوا تھا دادا ایک رات ایسے سوئے کہ انہیں صبح کا سورج دیکھنا ہی نصیب نہیں ہوا۔ موت کا فرشتہ رات کے نہ جانے کون



سے پہلے ان کی روح قبض کر لی گئی۔ دادی کو تو چپ کی مہر لگ گئی ابھی تو وہ شرجیل کی خوشی صحیح سے منا بھی نہ پائی تھیں کہ دادا انہیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ شاید انہیں اللہ نے ناشکرے پن کی سزا دی تھی کہ پوتے کی خوشی غم میں بدل گئی۔ شرجیل کے بعد دو بھائی اور دنیا میں آئے مگر وہ مقام نہ پا سکے جو شرجیل نے پایا تھا بھائیوں کے بعد دو بہنیں مزید آ گئیں۔ اس طرح نو بہنیں اور تین بھائی محلے بھر میں ہمارا گھر ایک درجن بچوں والا گھر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دادا کے انتقال کے بعد دادی بھی ایک دن خاموشی سے ہم سب کو روتا چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ دادی کی قبر کی مٹی تو خشک ہو گئی مگر میری ماں کی آنکھ سے جو آنسو بہے وہ کبھی خشک نہ ہوئے۔

☆......☆

بچپن سے ہی مجھے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا جہاں اسکول جانے کا ٹائم ہوتا میں طبیعت خرابی کا بہانہ بنا دیتی۔ امی سمجھتیں میں واقعی بیمار ہوں۔ وہ میری جھوٹی تکلیف دیکھ کر محبت سے مجبور ہو کر اسکول کی چھٹی کرا دیتیں مگر اس وقت نہ امی جانتی تھیں کہ وہ میری محبت میں کیا غلط کر رہی ہیں کیونکہ طبیعت روز روز تو خراب نہیں ہوتی، میرے تو آئے دن کے بہانے تھے اور نہ مجھے پتا تھا کہ امی کیسے میری غلطیوں کو شہ دے رہی ہیں اور انسان کے لیے تعلیم کتنی ضروری ہے لہٰذا میں رو رو کر اور پروموٹ ہو ہو کر پانچویں تک پہنچی اور پانچویں میں تمام مضامین میں فیل ہو جانے کی وجہ سے تعلیم کو خیر باد کہہ کر گھر بیٹھ گئی۔

میں سارا دن گڑیاں کھیلتی رہتی۔ گڑیوں کے کھیل کی وجہ سے گھریلو کام میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ میں ہر وقت گھر کی صفائی ستھرائی میں لگی رہتی۔ امی میرا کام دیکھ کر صدقے واری جاتیں، امی کی محبت دیکھ کر میں چھوٹے بہن بھائیوں کو اپنے بڑے پن کا نشانہ بناتی یہیں سے میرے اندر احساس برتری نے جنم لیا۔

ہمارے گھر میں عورت کی اکثریت تھی اور پھر حکمرانی بھی عورت کی ہی چلتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہم سب بہنوں میں غرور، غصہ، گھمنڈ، احساس برتری اور ہر بات میں ''میں'' آتی چلی گئی۔ بڑے ہونے پر بھائی بھی ہمارے رنگ میں رنگ گئے کہتے ہیں شادی ہو جانے کے بعد بہن بھائیوں میں وہ محبت نہیں رہتی جو شادی سے پہلے ہوتی ہے مگر ہم بہن بھائی تو ماں باپ کے سامنے بھی کبھی مل جل کر نہیں رہے۔ میری تو خاص کر کسی بہن بھائی سے بنتی ہی نہیں تھی ان لڑائی دنگوں کے دوران میں گالی گلوچ پر آ جاتی۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے میری شخصیت بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ہمارے ان لڑائی جھگڑوں کو امی بہن بھائیوں کی محبت سے تشبیہ دیتیں۔ امی کی اسی لاپروائی کی وجہ سے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے رویوں میں پختگی آتی گئی مگر ہماری ان حرکتوں پر کبھی ماں نے نظر ثانی نہیں کی۔

☆......☆

ہم بہن بھائی یونہی اپنا بچپن ہنستے کھیلتے ڈھاکہ کے حسین مناظروں میں گزار رہے تھے کہ 1971ء کے فسادات شروع ہو گئے۔ پھر جب حالات بد سے بدتر ہوئے تو بابا نے مغربی پاکستان ہجرت کا ارادہ کیا۔ ڈھاکہ کے اتنے کشیدہ حالات میں جانے کس طرح جوان بیٹیوں کو لے کر ہمارے والدین مغربی پاکستان پہنچے یہ الگ داستان ہے۔

جیکب آباد پہنچ کر امی جو تھوڑا بہت جمع پونجی لائی تھیں اس پیسے سے بابا نے جنرل اسٹور کھول لیا۔ ہم بارہ بہن بھائی جنگ کے اجڑے ہوئے میرے ماں باپ اپنا سب کچھ ڈھاکہ میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ نئے سرے سے گھر بنانے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے تینوں بڑی بہنوں نے نوکریاں کرنا شروع کیں۔ جب گھر کے حالات میں بہتری آئی تو امی کو بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہوئی۔ بابا نے آہستہ آہستہ کر کے تین بیٹیوں کو تو رخصت کر دیا۔ اب صفیہ آپا کی باری تھی پھر صبیحہ ذکیہ اس کے بعد میری آتی مگر میری ان تین بہنوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ وہ بولیں آپ چھوٹی بیٹیوں کی شادی کر دیں۔ جب تک بھائی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے ہم اپنی شادیاں نہیں کریں گے۔ بھائیوں کا

تو صرف بہانہ تھا اصل میں نوکری کے نخرے اور پیسے کے لالچ نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ حالانکہ بھائیوں کی پڑھائی پر تو بابا کا پیسہ لگ رہا تھا اور بابا کا اسٹور بھی خوب چل رہا تھا۔ گھر کے حالات اس حد تک سدھر چکے تھے کہ بابا اس سستے دور میں با آسانی اپنی تمام بیٹیوں کو رخصت کر سکتے تھے۔ امی ہر پل رو رو کر بہنوں سے التجائیں کرتیں کہ وہ شادی کر لیں تا کہ ان کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد بیٹوں کے سر پر سہرا سجا سکیں۔ گھر میں ہر وقت تو تو میں میں کی کھچڑی پکتی رہتی اور ظاہر ہے ایسے گھر میں کون اپنی بیٹی کے نصیب پھوڑتا۔ گھر کی اس حالت پر امی کی آنکھیں ہمیشہ نم ہی رہتیں۔ بہنوں کی ضد اور انا پرستی کی وجہ سے بابا خاموش ہو گئے اور صفیہ آپا کے لیے آئے ہوئے شاکر بھائی کے رشتے کو میرے لیے جانچنے لگے۔ جب شاکر، بابا کے معیار پر پورے اتر گئے تو انہوں نے شاکر کے ماں باپ سے میرے لیے بات کی۔ شاکر کے ماں باپ کو میرا گھرانہ بہت پسند آیا تھا۔ وہ فوراً راضی ہو گئے۔ یوں دونوں طرف کی رضامندی سے میں بیاہ کر شاکر کے گھر آ گئی۔ شاکر بھی میرے جیسے تھے میں پانچویں فیل تھی شاکر بھی آٹھ جماعتوں سے آگے نہیں بڑھ پائے تھے۔ وہ آر اور زری کا کام کرتے تھے۔ ان کا اپنا کارخانہ تھا۔ شادی کے بعد جب مجھ پر شاکر کے پیسے کا ادراک ہوا تو میں ہواؤں پر اڑنے لگی اور غرور کے نشے میں ڈوب کر اپنی بہنوں پر اپنے پیسے کا رعب ڈالتی حالانکہ اصل دولت تو تعلیم اور اخلاق ہوتا ہے اور ان میں سے ایک دولت بھی میرے پاس نہیں تھی۔ شاکر چار بھائی اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ بہنیں چھٹی کا دن میکے میں ہی گزارتی تھیں۔ یعنی یہاں بھی بھرا پرا کنبہ تھا۔ گھر میں ہر وقت بچوں کا شور برپا رہتا۔ میں نے جس گھر کا خواب دیکھا تھا انسانوں کے ہجوم میں اس کی بیل سر منڈھے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ادھر میں بھی تنگ نظر اور پس ذہن کی مالک تھی کچھ میکے کا بگاڑ تھا کچھ زبان کی تیزی اور طبیعت کی بیزاری کہ میری سسرال میں کسی سے نبھ نہ سکی۔ آئے دن میرا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا ہی رہتا رہی سہی کسر شادی شدہ نندیں پوری کر دیتیں۔ شاکر تو تھے ہی میری مٹھی میں اس لیے ساس نندوں کے خلاف زہر اگلنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لہٰذا شادی کے دوسرے ہی برس سسرال والوں سے جھگڑا کر کے الگ گھر میں شفٹ ہو گئی۔

بذات خود اقتدار بہت بڑی چیز ہے۔ بہت سے لوگ گھر کا اقتدار مل جانے کے بعد اپنے آپ کو ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا راج ہنس تصور کرتے ہیں مگر جب تھک کر گرتے ہیں تو انہیں کوے کی طرح اپنی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ اپنے ذاتی گھر کا خمار بعض انسانوں پر نشہ بن کر چڑھتا ہے۔ اپنی ملکیت کا احساس انسان کو غرور اور گھمنڈ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔

اپنے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد میرے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے اور پھر پہلے ہی سال پہلوٹھی کے بیٹے نے آ کر میرے غرور کو مزید تسکین بخشی۔ دنیا کے افق پر بدلتے ہوئے دھنک کے رنگوں کی طرح میری زندگی میں بھی ایک کے بعد ایک رنگ آتے چلے گئے۔ گھر الگ کرنے کے بعد میں نے کبھی سسرال کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ شاکر کبھی اپنی ماں سے ملنے چلے جاتے مگر مجھے یہ بات بھی گوارا نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ میری پابندی کی وجہ سے شاکر کے جانے میں کمی آ گئی۔ بیٹے کے بعد دس سال کے عرصے میں میں پانچ بیٹیوں کی ماں بن گئی اور ہر بیٹی کی پیدائش پر بیٹے کی آس دم توڑتی گئی۔ بہرحال میں اپنے گھر سے پر امید تھی کہ اللہ نے ایک بیٹا تو دیا تھا۔ جب میں اپنے گھر پر نظر ڈالتی میرا شوہر میرا بیٹا میرا گھر، پیسہ، بیٹیاں ہر خوشی میرے پاس تھی اور جب میں اپنی بہنوں پر نظر ڈالتی کسی کا بیٹا نہیں، کسی کی بیٹی نہیں، کوئی اولاد کی نعمت کو ترستی، کسی کا گھر نہیں، کسی کے پاس پیسہ نہیں، کوئی تو جوانی میں بیوہ ہو گئی تو کوئی بن بیاہی اپنے باپ کے گھر کو سپورٹ کرنے کے لیے بڑھاپے کی طرف سفر کر رہی تھی تو میں اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے اپنے آپ کو بہت اعلیٰ تصور کرتی اور بہنوں پر بھی طنز کا کوئی

وار خالی نہ جانے دیتی۔

☆......☆

88-1987ء کا زمانہ تھا۔ ایک دفعہ پھر سندھی مہاجر فسادات شروع ہو چکے تھے مگر اب فرق یہ تھا 47ء میں ہندو مسلم 1971ء میں مہاجر بنگالی اور اب سندھی مہاجر آپس میں لڑ رہے تھے۔ کیا قسمت تھی میرے ماں باپ کی جن کے نصیب میں صرف ہجرت کرنا ہی لکھی تھی۔ جوان بیٹیوں کے ساتھ اور سفر کی صعوبتیں...... بہرحال ایک دفعہ پھر بابا جان ہجرت کر کے حیدر آباد شفٹ ہو گئے اور اپنے دوست کے توسط سے بہنوں کا ٹرانسفر حیدر آباد کرالیا۔

ہم لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے کہ شرجیل نے چھپ کر کورٹ میرج کر لی۔ بابا تو کسی حال میں شرجیل کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے امی کی لاکھ منتیں کرنے کے باوجود شرجیل کو گھر سے نکال کر ہر قسم کا قطع تعلق کر لیا اور ہم سب پر بھی ملنے پر پابندی لگا دی۔ اس کے بعد بابا مرتے مر گئے مگر شرجیل کی شکل نہ دیکھی۔ زندگی کے اٹھارہ برس بیٹے کی جدائی میں گزرے۔ یہاں بھی امی کی آنکھیں بیٹے کی یاد میں ہر وقت برستی ہی رہتیں مگر شوہر کے حکم کے آگے بے بس ہو جاتیں۔ شرجیل کی اس حرکت کے بعد امی بیمار رہنے لگیں۔ شرجیل گھر کا بڑا بیٹا تھا امی بابا کو اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور شرجیل نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اٹھارہ برس بعد ایک دن اچانک بابا کسی سے کچھ کہے بغیر دنیا سے منہ موڑ گئے۔ کاش وہ ایک بار صرف شرجیل سے ملنے کی خواہش کر کے اسے معاف کر دیتے تو امی اپنی زندگی کے بقایا دن سکون سے گزار لیتیں مگر اس میں بابا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ بابا تو شرجیل کو اس وقت معاف کرتے جب شرجیل ان سے معافی مانگتا وہ تو اٹھارہ برس بعد بھی اپنے اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات ایک باپ بیٹے کے لیے کیا ہوگی کہ باپ کے جنازے کو بیٹا کندھا بھی نہ دے سکا۔ یہ تھی منتوں بھری وہ اولاد جس کو امی بابا نے تڑپ تڑپ کر اپنے رب سے مانگا تھا، جس کو امی اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ اس لیے ماں باپ کو ہر دم صدموں سے باندھے رکھا اور بیٹے سے کیا شکایت کریں امی بابا کو تو بیٹیوں سے بھی کوئی سکھ نہ مل سکا۔ پھر بہنوں کی ضد اور انا نے گھر کی خوشیوں کو نگل لیا۔

ان ہی دنوں یکے بعد دیگرے میرے ساس سسر کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال میں بھی میں دنیاداری کے لیے شریک ہوئی۔ ساس سسر کے انتقال کے بعد میں نے سسرال والوں سے بالکل ہی قطع تعلق کر لیا اور شاکر جو کبھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے بہانے بہن بھائیوں کو بھی دیکھ آتے تھے۔ وہ بھی ختم ہو گیا۔ ساس سسر کے انتقال کے بعد میں پرسکون ہو گئی۔ یہ جانے بغیر کہ کل میری بھی بہو آئے گی۔ میں بھی ساس بنوں گی۔ تب میری بہو کے میرے بارے میں کیا خیالات ہوں گے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ میں اپنی زندگی میں مگن رہی۔ بڑھتے وقت اور فیشن کی بھرمار نے شاکر کے کاروبار کو مزید وسعت دی۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوئی تو میری گردن مزید اکڑ گئی۔ میری بے حسی اور غلط تربیت کی وجہ سے بچیاں بھی دن بدن میرے رنگ میں رنگتی جا رہی تھیں۔ دولت کے لالچ میں مجھے کسی رشتے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہر رشتے کو دولت کے ترازو میں تولنا میری عادت بنتی جا رہی تھی۔ شرجیل تو اپنی زندگی میں مست تھا۔ اس کی بیوی ہم بہنوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ اتنا میٹھا بول کر وار کرتی کہ ماں سمیت ہم سب بہنیں دل مسوس کر رہ جاتیں لہٰذا ہم ماں بہنوں کے وار سہنے کے لیے دونوں چھوٹی بھابیاں رہ جاتیں ان کے میکے کی کوئی خوشی ایسی نہیں تھی جس میں ہم نے انہیں خوشی سے شریک ہونے دیا ہو۔ بھابیاں ہمیشہ روتی ہوئی میکے جاتیں اور روتی ہوئی واپس آتیں۔ میں بلاوجہ بھابیوں کی شکایت بھائیوں سے کر کے ان پر میکے جانے کی پابندی لگوا دیتی۔ بھابیاں اپنے ماں باپ کی شکل دیکھنے کو ترس جاتیں۔ ہم بہنیں بھائیوں کے اتنے کان بھرتیں کہ بھائی بھابیوں کو مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور بات بات پر طلاق دینے کی دھمکی دیتے۔ اس کے علاوہ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

میں بھابیوں کو ستانے کا ایک اور طریقہ اختیار کرتی۔ میں اپنے گھر میں تقریب کے بہانے بھابیوں سے ان کے جہیز کے برتن مانگتی۔ وہ خوشی خوشی دے دیتیں مگر جب وہ برتن واپس جاتے تو اپنی صحیح حالت میں واپس نہیں جاتے۔ میں جان بوجھ کر وہ برتن توڑ دیتی اور کہتی ایسے ہی آئے تھے اور انہیں بے پناہ غریبی کے طعنے مارتی۔ بھابیاں دل مسوس کر رہ جاتیں۔

مجھے لڑکے اچھے لگتے تھے اور یہاں بھی مجھے بے صبری سے بھتیجے کا انتظار تھا لیکن ہر بھاوج کی طرف سے بیٹی کی پیدائش پر انہیں بیٹے نہ پیدا کرنے کے طعنے مار کر ان کے زخموں کو چھیڑنا قدم قدم پر طنز اور ہر بات میں کیڑے نکالنا میرا مشغلہ بن گیا۔ یہ جانے بغیر کہ کل میری بھی بیٹیاں رخصت ہوں گی۔ ان کے ساتھ ایسا ہوا تو میں کیا کروں گی۔ آج مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں اور میں بھی تو بیٹیاں پیدا کر رہی ہوں مگر اس وقت میں بہت خوش تھی کیونکہ سسرال اور میکے دونوں پر بھرپور سکہ چل رہا تھا۔ میں خدا کے خوف اور آخرت کے حشر سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن، اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ عورت تو سدا کی ناشکری ہی ہوتی ہے۔ تقدیر پر صبر و شکر کرنے کی بجائے اپنی ناکامی کا الزام دوسری عورت پر ڈال دیتی ہے۔

☆......☆

ہم بہنوں کی اذیت بھری باتیں سہتے سہتے ایک دن چھوٹی بھابی کو معمولی بخار آیا اور چند دن بیماری کی تکلیف اٹھانے کے بعد تین چھوٹی چھوٹی بچیاں چھوڑ کر ہر تکلیف سے آزاد ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ چھوٹی بھابی کے انتقال کے کچھ عرصے بعد منجھلی بھابی کو بھی اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر ٹی بی جیسی مہلک بیماری لگ گئی۔ اس پر بھی میں نے بس نہیں کیا بھابی کو وہ بے نقط سناتی کہ ماں باپ نے بیمار بچی ہمارے پلے باندھ دی۔ بیماری کے دنوں میں ناٹک کرنے کے طعنے مارتی۔ بھابی خاموش ہو کر رہ جاتیں ان کی خاموش نگاہیں اس وقت تو مجھے بہت تسکین دیتی تھیں مگر آج یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کی وہی چپ مار مجھے مار گئی۔ اپنی بیماری سے لڑتے ہوئے منجھلی بھابی بھی ایک دن چار چھوٹی چھوٹی بچیاں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

بھابی کے انتقال کے بعد بچیوں کا سہارا لے کر سال بھر کے اندر ہی ہم نے دونوں بھائیوں کی دوسری شادی کر دی مگر سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ دوسری بھابیاں بہت تیز تھیں۔ وہ ہم بہنوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھیں بھائیوں کو بھی انہوں نے ایسی پٹیاں پڑھائیں کہ بھائی ہم سے بدظن ہو گئے اور بہنوں پر بھی انہوں نے اپنے گھر آنے پر پابندی لگا دی۔ ان حالات کے پیش نظر میں بھی اپنے گھر کی ہو کر رہ گئی۔ ویسے بھی میرے بچے بڑے ہو رہے تھے اور مجھے ان پر بھرپور توجہ دینی تھی۔

☆......☆

اسی ادھیڑ بن میں زندگی کے بیس برس گزر گئے۔ بیٹا چھبیس برس کا ہو چکا تھا۔ ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں اس کے مستقبل کے ڈھیروں خواب دیکھتی کہ اس کو جاب ملتے ہی اچھی سی لڑکی سے اس کی شادی کر دوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ اپنی اکلوتی بہو اتنی امیر کبیر لاؤں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ تعلیم کی کمی نے میری سوچوں کو بھی محدود کر دیا تھا۔ پھر ایک دن بڑی بیٹی کا بہت امیر گھرانے سے رشتہ آ گیا۔ میں نے فوراً اس کی شادی کر دی۔ بیٹی کی شادی میں، میں نے جی بھر کے ارمان نکالے اور زندگی کی ہر آسائش کا سامان دیا۔ جہیز دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جو باتیں میں نے اپنی بھاوجوں پر بنائی ہیں وہی میری بیٹی کے لیے طمانچہ بن جائیں۔ انسان اپنی اولاد کو تن کے کپڑے اتار کر تو دے سکتا ہے مگر نصیب نہیں دے سکتا۔ نصیب لکھنے والا تو وہی ایک رب ہے جس نے تمام بنی نوع انسانوں کی تقدیر لکھی ہے۔ کوئی غریب ہے تو کوئی امیر ہے تو اللہ کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ بیٹی کی شادی کے بعد میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی اس وقت میں اپنے رب کی شکر گزار ہونے کے بجائے غرور کے نشے میں مزید ڈوب گئی کیونکہ میرے

خاندان کی وہ بیٹیاں جو میری بچی سے دس دس سال بڑی تھیں وہ اب تک بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں ان کا خوب تمسخر اڑاتی۔

ان ہی دنوں بیٹے کو ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے محبت ہو گئی۔ میں یہ رشتہ کسی قیمت پر کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ بظاہر تو وہ لڑکی ٹھیک تھی مگر بے حد غریب تھی اور میں تو تھی ہی پیسے کے نشے میں ڈوبی ہوئی۔ بیٹے کی شادی کے جو ارمان میرے دل میں تھے وہ کم از کم اس لڑکی سے شادی کر کے پورے نہیں ہو سکتے تھے اور بیٹے کی ضد تھی کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے ورنہ نہیں کروں گا۔ اکلوتا بیٹا وہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر اور دل پر پتھر رکھ کر میں اس لڑکی کو بیاہ کر لے آئی۔

جن لوگوں کو ہمیشہ اقتدار میں رہنے کی عادت ہو وہ اپنے ہاتھ سے جاتے ہوئے اقتدار کو برداشت نہیں کرتے اور سراپا انتقام بن جاتے ہیں۔ ان دنوں میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

بہو کو دیکھ کر مجھے ہر پل ہار جانے کا افسوس ہوتا۔ دوسری طرف وہ میرے معیار پر پوری بھی نہیں اتری تھی۔ اس کے جہیز کا سامان دیکھ کر میں تلملا کر رہ گئی۔ اکلوتی بہو لانے کے سارے ارمان میرے دل میں ہی رہ گئے تھے۔ اس لیے اس کے کام میں مجھے سو سو کیڑے نظر آتے بیٹے کے سامنے تو کچھ بول نہیں سکتی تھی لیکن اس کی غیر موجودگی میں خوب دل کی بھڑاس نکالتی۔

شروع شروع میں تو بہو کچھ نہ بولتی مگر کب تک وہ بھی آخر انسان تھی۔ آہستہ آہستہ گھر میں لڑائی جھگڑے ہونا شروع ہو گئے۔ پھر ان جھگڑوں میں بیٹیاں بھی شامل ہو جاتیں تو گھر میں جنگ کا سماں معلوم ہوتا۔ میں کسی پل بھی بہو کو برداشت نہ کر پاتی۔ بیٹا اگر بہو کی طرف داری کرتا تو اسے زن مرید، بے غیرت اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازتی مگر تھا تو وہ میرا ہی خون، میرا غرور میری تربیت کے زیر اثر تھا۔ وہ کب مجھ سے پیچھے رہتا۔ وہ بھی بدلے میں مجھے ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ میں اس وقت ششدر رہ جاتی جب وہ میرا ہی طمانچہ میرے منہ پر دے مارتا کہ امی آپ مجھے کیا زن مرید ہونے کے طعنے دیتی ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ ابو کو آپ کی غلامی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کبھی آپ کے آگے ابو کی نہیں چلی گھر میں ہمیشہ آپ کا راج رہا۔ آپ نے ہمیشہ ابو کو اپنے اشاروں پر نچایا اور آج جب بیٹا باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے تو آپ کو بہو میں سو عیب نظر آ رہے ہیں۔ آپ وہ وقت بھول گئیں جب دانیہ کی شادی کے وقت اسے میاں کو قابو کرنے کے طریقے سکھاتی تھیں۔ یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔ اسے بھی شاید اس کی ماں نے میاں کو قابو کرنے کے طریقے سکھائے ہوں گے۔ میری پیاری امی جان یاد رکھیں انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ ببول بو کر گلاب کی تمنا کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں اور سیر کو ہمیشہ سوا سیر ملتا ہے۔"

ہائے یہ کیسا تیر تھا جو میرا اپنا میرے کلیجے پر مار کر چلا گیا تھا۔ ہائے یہ دن بھی زندگی میں دیکھنا تھا۔ میں اپنے دل پر گھونسا مار کر بیٹھ جاتی۔ یہ تو شروعات تھی اور نہ جانے آگے کتنے امتحان باقی تھے۔ روز روز کے لڑائی دنگوں سے تنگ آ کر ایک دن بیٹا گھر سے الگ ہو گیا۔

☆……☆

زندگی کے آٹھ برس بیت گئے۔ نہ میری بڑی بیٹی کے گھر اولاد ہوئی نہ دوسری بیٹی کے رشتے کی کہیں بات چل سکی۔ میں جو ایک بیٹی بیاہ کر اپنے آپ کو بہت بلندی پر محسوس کرتی اور بہت بڑے بڑے دعوے کیا کرتی تھی۔ بیٹی کی بڑھتی ہوئی عمر دیکھ کر میرے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ پھر خاندان کی وہ لڑکیاں جن کو میں نے عمر نکلنے کے طعنے مارے تھے رفتہ رفتہ سب پیا دیس سدھار چکی تھیں، تب ایک دن قدرت کو میرے اوپر رحم آ ہی گیا میری دوسری بیٹی کا رشتہ آ گیا۔ میں نے بات پکی کر کے فوراً اس کی شادی کر دی۔ ابھی چھوٹی بیٹی کی شادی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ بڑی بیٹی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق کا داغ سجائے میکے کی دہلیز پر آ گئی۔ بیٹی کے جہیز کا سامان دیکھ کر تو میرے حواس ہی اڑ گئے جتنا جہیز میں نے دیا تھا اس میں سے چوتھائی سامان بھی واپس نہیں آیا تھا

زادِ راہ

دنیا کے انسانوں پر جو سب سے بڑا حادثہ اور سب سے بڑی مصیبت آنے والی ہے وہ موت ہے اور انسانی فطرت ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی آفتوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ منصوبے بناتا ہے۔کل کی سوچ رکھتا ہے۔ کتنے ارمانوں سے انسان گھر بناتا ہے اور پھر خاموشی سے چھوڑ کے لوگوں کے کندھے پر سوار ہو کر اندھیر کوٹھڑی (قبر) میں جا کے سو جاتا ہے۔اسپین سے کمبل منگوائے تھے سونے کے لیے پانچ برس بھی سونے نہ پائے تھے کہ ہمیشہ کے لیے مٹی کی چادر اوڑھ کے سو گیا۔ بڑے سائز کے خوب صورت ڈیزائن کے پلنگ بنوائے اور جب اٹھے تو ایک پل میں اٹھ کے چلے گئے اور جا کر مٹی کے بستر پر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔تو جس انسان کا یہ حسرت ناک انجام ہو کہ موت اس کی شکاری ہو۔آفات کے پھندے اس کے چاروں طرف قائم کیے جا چکے ہوں۔غموں کے بادل بھی اس کے افق سے ہٹتے ہی نہ ہوں۔ مصیبتوں کی کھائیاں قدم قدم پر اس کے لیے کھودی گئی ہوں۔خوشیوں کی کرن بجلی کی چمک کی طرح آ کے گزر جاتی ہو۔ پریشانیوں اور تفکرات کے سمندروں میں ڈوبا ہوا ہو اور بیماریاں اس کے ساتھ اپنا کردار ادا کر رہی ہوں۔دوستوں کی بے وفائیاں، اولاد کی نافرمانیاں اس کے دل پر نشتر چلا رہی ہوں اور قبر اسے روزانہ پکار رہی ہو۔ میں تنہائی کا گھر ہوں۔ میں اندھیرے کا گھر ہوں میں کیڑے مکوڑوں کا گھر ہوں۔میرے پاس آنا ہے تو کوئی زادِ راہ لے کے آنا۔اس ناپائیدار زندگی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دینا بہت بڑی ہلاکت ہے۔ عقل مند وہ ہے جو موت سے پہلے موت کی تیاری شروع کر دے۔

زورِ قلم: فلک شیر تابش۔رحیم یار خان

اور اس کا بھی وہ حشر ہوا تھا کہ استعمال کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی تو میرے اوپر دو بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی تھیں کہ تیسری بھی طلاق یافتہ ہو کر آ گئی تھی۔ تقدیر مجھے کیسے کیسے رلا رہی تھی۔ بیٹی کے ساتھ ساتھ شاکر کی محنت کی کمائی بھی برباد ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے بے پناہ بھابیاں یاد آتیں جن کے جہیز کا سامان میں جان کر کر کے توڑ دیتی تھی۔ وہ بھی تو کسی کے باپ کی حق حلال کی کمائی تھی۔ یہ غم تازہ تھا کہ ایک دن شاکر بھی بیٹی کا غم لے کر اچانک دنیا سے منہ موڑ گئے۔ میرے اوپر تو پہاڑ ٹوٹ پڑا۔شاکر کے جانے کے بعد ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو زندگی ایک دم سے بری لگنے لگی۔آج مجھے اکیلے پن کا احساس ہوا۔

☆......☆

میری چھوٹی بیٹی اپنے سسرال میں خوش نہیں تھی۔ اس کے میاں اور ساس کی طرف سے اس پر میکے آنے کے لیے بے حساب پابندیاں تھیں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے وہ سالوں میں میکے کا چکر لگاتی، اس میں بھی ساس اس کے ساتھ موجود ہوتی۔ اسے اکیلے میرے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں دو گھڑی

اس سے بات کرنے کو ترس جاتی، اس وقت مجھے اپنی بھاوجوں پر لگائی ہوئی پابندیاں یاد آتیں تو میری روح گھائل ہو جاتی۔ قدرت میری کس کس طریقے سے آزمائش کر رہی تھی۔

اُدھر بیٹا شادی کر کے اپنی دنیا میں مگن تھا۔ ہم ماں بیٹیوں کی تو اسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ بہو کی طرف سے اس پر ویسی ہی پابندیاں تھیں جیسی میں شاکر پر لگایا کرتی تھی۔ میں پوتے پوتیوں کی شکل دیکھنے کو ترس گئی۔ اللہ نے مجھے پوتے تو دیے تھے مگر ان کو گود میں کھلانا میرے نصیب میں نہیں لکھا تھا یہ بھی مکافاتِ عمل تھا۔ بیٹے نہ پیدا کرنے پر جو پہاڑ میں نے اپنی بھاوجوں پر توڑے تھے وہی پہاڑ بہو نے بیٹے پیدا کر کے میرے اوپر توڑ دیے تھے۔ ادھر گزرتے وقت کے ساتھ تینوں چھوٹی بیٹیاں شادی کی عمر پار کر گئیں۔ اس وقت مجھے اپنی وہ بہنیں یاد آتیں جو بابا کے گھر کو سپورٹ کرنے کی خاطر بڑھاپے کی دہلیز پار کر گئی تھیں اور میں ان کا خوب تمسخر اڑایا کرتی تھی۔

☆......☆

ہر طرف کہرام تھا ہر طرف چیخ و پکار تھی ابھی ابھی

اطلاع ملی تھی کہ حیدر آباد کے علاقے پکے قلعے پر فائرنگ ہوئی ہے جس کی زد میں آ کر بہت سے لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ ان بدنصیبوں میں میرا بیٹا بھی تھا۔ سہاگ تو میرا اجڑ ہی چکا تھا، آج گود بھی اجڑ گئی تھی۔ اس عمر میں مجھے جوان بیٹے کا صدمہ بھی سہنا تھا۔ بے شک وہ میرے ساتھ نہیں تھا مگر میری ماما تو ٹھنڈی تھی۔ میں جو زندگی میں ایک ماں کو اس کی بیٹی کی شکل دیکھنے کو ترسا دیتی تھی آج قدرت نے میرا بیٹا چھین کر بیٹے کی شکل کو ترسا دیا۔ میری اولاد مجھ سے مر کر چھوٹ گئی۔

☆......☆

کل شب چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہ چاند جس کی روشنی پوری دنیا میں اجالا پھیر دیتی، جس کی ٹھنڈک ہر ایک کی آنکھوں کو تسکین دیتی ہے مگر یہ چاند میری زندگی میں صرف اندھیرے کا پیغام لے کر طلوع ہوا۔ میں اپنے کس کس گناہ کو یاد کرتی۔ میری تو پوری زندگی ہی کرب ناک یادوں سے بھری ہوئی تھی اور معافی مانگتی تو کس سے۔ جن لوگوں کی بددعائیں میں نے لی تھیں وہ سب تو منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔

آج مجھے اپنی بہاوجوں کی وہ بددعائیں یاد آتیں جو اکثر وہ مجھے دیتی تھیں کہ ہم رو رہے ہیں تو ہمارے آنسو تو ساتھ دیتے ہیں۔ تیری بدنصیبی پر تو آنسو بھی تیرا ساتھ نہ دیں گے۔''

آج میری آنکھیں خشک ہیں اور دل روتا ہے۔ میں اپنی بدنصیبی پر دل مسوس کر رہ جاتی ہوں مگر آنسو میرا ساتھ نہیں دیتے۔ جس جس طرح سے میں نے دوسروں کو رلایا تھا قدرت اسی طرح آج مجھے رلا رہی تھی۔

آج میں بالکل تنہا اپنی زندگی کی مسافت طے کر رہی ہوں۔ تنہا اس لیے کہ آج شاکر میری زندگی میں نہیں ہیں۔ اولاد اور پیسہ دونوں ہی میرے پاس ہیں مگر نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ ان سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہے اور جو شخص ساری زندگی میرے لیے گھنے سایہ دار درخت کی مانند رہا، جس کی میں نے کبھی قدر نہ کی جس کے رتبے کو کبھی میں نے نہ سمجھا میں نے ہمیشہ اپنے مجازی خدا کو ناراض کیا اس لیے شاید آج میرا خدا مجھ سے ناراض ہے کہ میں اولاد کے ہوتے ہوئے اور زندگی کی ہر آسائش سے مزین گھر میں بیٹھے ہوئے بھی بے سکون ہوں۔ وہ جو تمام زندگی تپتی دھوپ میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے روزی کمایا کرتا تھا اور میرے پاس اس کے لیے محبت کے دو بول بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ آج ہمیں گھر کی چھت دے کر خود دنیا کی دھوپ میں گم ہو گیا۔ اس شخص نے تو مجھ پر احسان ہی احسان کیے مگر میں بدنصیب اس کے ایک احسان کا بھی بدلہ نہ چکا سکی۔ نہ اس کی اولاد کی اچھی پرورش کی، نہ اس کو اس کے ماں باپ بہن بھائیوں کا سکھ نصیب ہونے دیا۔ شاکر کے جانے کے بعد دھوپ کی تمازت کا احساس ہوا تو پانی سر سے بہت اونچا ہو چکا تھا۔

آج مجھے اپنی موت یاد آتی ہے جس کو کبھی میں نے یاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ گھر جس پر مجھے بڑا گھمنڈ تھا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ جس پیسے پر مجھے بڑا غرور تھا وہ سانپ بچھو بن کر مجھے ڈستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کاش میں وقت کو واپس لا سکتی۔ اللہ کبھی بھی اپنے بندوں سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے جب اس کا ایک طاقت ور بندہ اس کے ایک کمزور بندے پر ظلم کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے جب وہی طاقت ور بندہ اپنے سے بڑے طاقت ور کے ظلم کے زیر اثر ہوتا ہے یہ تو ہم بندے ہی ہیں جو اپنے بنانے والے رب سے اور اپنے انجام سے غافل ہوتے ہیں۔

اولاد اور پیسہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے دو ایسی نعمتیں ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ بندے کو دے کر آزماتا ہے اور کبھی لے کر۔ تقدیر نے یہ دونوں چیزیں میری جھولی میں ڈال کر مجھے آزمایا تھا مگر میں کرموں جلی اس کی آزمائش پر پوری نہ اتر سکی اور قدرت کے ان انمول تحفوں پر شکر اور ان کی قدر کرنے کی بجائے ان پر غرور و گھمنڈ کیا۔ آج میں تقدیر سے شکوہ کیوں کروں۔ میں نے اپنے مقدر میں سیاہی تو خود لکھی تھی میں جو دنیا سے جیت جاتی تھی آج اپنی تقدیر سے ہار چکی ہوں۔

☆☆☆

تیسری سچ بیانی

ابلیس



ضرغام محمود

ہر پسند آنے والی چیز کو حاصل کر لینے والے ایک انسپکٹر کا عبرت ناک قصہ

میں اپنے حنائی ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ابھی میری ہونے والی سسرال والے مہندی کی رسم ادا کر کے گئے تھے۔ میرے ہاتھوں میں مہندی لگائی گئی تھی۔ یہ...... یہ مہندی میرا دل چیر رہی تھی۔ مہندی کے سرخ رنگ میں مجھے سرخ سرخ خون نظر آ رہا تھا۔ میں اپنے حنائی ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ مہندی پہلی



بار تو میرے ہاتھوں پر بیل گی آج سے دس ماہ پہلے جب میرے ہاتھوں میں ندیم کے نام کی مہندی لگائی گئی تھی تو میں کتنا خوش تھی۔

ندیم...... میری زندگی...... میرا محبوب...... میرا جیون ندیم۔۔ میرے حنائی ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ندیم کا مسکراتا چہرہ ابھرا۔ ندیم میرا خالہ زاد...... میرے بچپن کا منگیتر...... میں نے جب سے ہوش سنبھالا ندیم کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا۔ میری خالہ نے پیدا ہوتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے مجھے مانگ لیا اور یہ بات سارے خاندان کو معلوم تھی۔ سب میری قسمت پر رشک کرتے تھے۔ خالہ جان اور خالو ہماری شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے اور ندیم اکیلا رہ گیا۔ پھر جیسے ہی ندیم کو نوکری ملی تو ہماری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

آہ...... کتنی سہانی شام تھی جب ندیم کے نام کی مہندی میرے ہاتھوں پر لگائی گئی مجھے مایوں بیٹھایا گیا۔ میں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں میں اپنی سابقہ شادی کے مناظر دیکھنے لگی۔

سب مجھے مایوں بیٹھا کر کمرے سے باہر چلے گئے تو میں نے اپنی کمر سیدھی کی اسی وقت دروازہ کھلا اور ندیم کمرے میں داخل ہوا۔

''ندیم تم...... یہاں اس وقت......'' میں حیران رہ گئی۔

''یار! تم سے ملے ایک ہفتہ گزر گیا اور پھر سنا تم مایوں کے لباس میں اتنی حسین لگ رہی ہو کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں جان پر کھیل کر تم سے ملنے چلا آیا۔'' ندیم نے جلدی جلدی کہا۔ میں پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

''اگر ابا جان کو معلوم ہو گیا کہ تم اس وقت میرے کمرے میں ہو تو......'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

''بس دو منٹ...... میں چلا جاؤں گا۔''

''لیکن......'' میں نے کہنا چاہا مگر ندیم نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

''بس!'' اتنا کہہ کر ندیم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر دیا اور اپنی انگلی میری تھوڑی کے نیچے رکھ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔

''بس اس حسین چہرے کا نظارہ کر لوں پھر چلا جاؤں گا۔'' ندیم نے کہا تو میں بری طرح شرما گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے امی جان کی آواز آئی۔

''ہائے اللہ...... امی جان۔'' میں بوکھلا گئی۔

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں تم دروازہ کھولو۔'' ندیم نے کہا

''لیکن...... لیکن امی جان نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو......''

''تم دروازہ کھولو۔'' ندیم نے کہا اور خود دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا میں نے دروازہ کھولا تو امی جان سیدھی کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی امی جان نے سوال کیا۔

''وہ...... وہ میں باتھ روم میں تھی۔'' میں نے بوکھلا کر جواب دیا اور ساتھ ہی ندیم کو اشارہ کیا کہ وہ امی جان کی پیٹھ کے پیچھے سے نکل جائے۔ ندیم نے ایسا ہی کیا مگر دروازے میں رک کر اس نے ایک فلائینگ کس میری جانب اچھالی تو میں بوکھلا گئی۔ امی جان نے میرے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھا تو فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا میں گھبرا گئی مگر ندیم پھرتی کے ساتھ دروازے سے ہٹ گیا۔

''کون تھا؟'' امی جان نے دروازے میں کسی کو نہ پا کر مجھ سے پوچھا۔

''کک...... کوئی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''چلئے امی جان۔'' میں نے جلدی سے امی جان کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

میں اپنے مچلتے دل کو سنبھالے سہاگ کی سیج پر بیٹھی

تھی میرے کان باہر سے آنے والی آوازوں پہ لگے تھے۔ کمرے کے باہر دیگر کزنز ندیم کو کمرے میں داخلے سے روک کر نیگ طلب کر رہی تھیں ان کے ہنسی مذاق کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں آج۔ آج میں ندیم کی زندگی میں شامل ہوگئی ندیم۔ میرے ندیم۔ آج میرے خوابوں کو حقیقت کا رنگ ملا آج میری تپسیا رنگ لے آئی۔ آج میں اور ندیم ایک ہونے جارہے ہیں۔ ہر سوچ کے ساتھ میری آنکھیں شرم سے جھک رہی تھیں۔

'' السلام علیکم۔'' مجھے اپنے قریب سے ندیم کی آواز آئی تو میں شرم سے سکڑ گئی۔

'' چشم بد دور۔'' ندیم نے میرا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔'' ایسا لگتا ہے جیسے چاند کمرے میں اتر آیا ہو۔'' ندیم نے اپنا ہاتھ میری تھوڑی کے نیچے رکھ کر میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔

'' عدینہ آج میں جتنا اپنی قسمت پر ناز کروں کم ہے۔'' ندیم نے کہا تو میں نے نظر اٹھا کر ندیم کو دیکھا وہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس کے لبوں پر مسکان تھی میں نے جلدی سے اپنی پلکیں جھکا لیں۔

'' اس ادا پر کون نہ مر جائے اے خدا......'' ندیم نے شعر پڑھنا چاہا لیکن میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

'' خدارا! مرنے کی باتیں نہ کریں۔'' میں جلدی سے اپنا ہاتھ ندیم کے ہونٹوں پر رکھ دیا ندیم نے جھٹ میرے ہاتھ پکڑ کر چوم لئے میں بری طرح شرما گئی۔

'' کون کافر مرنا چاہتا ہے۔ ہم تو تمہارے ساتھ جینے کیلئے جنت بھی ٹھکرادیں۔'' ندیم نے جواب دیا اور آہستہ سے میرا پورا گھونگھٹ اتار دیا اور میرے حنائی ہاتھ اپنے مضبوط اور گرم ہاتھوں میں پکڑ لئے ندیم کے ہاتھوں کی گرمی میرے پورے بدن میں سرایت کر رہی تھی۔ حیا سے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں میرے لئے نظریں اٹھانا مشکل ہو رہا تھا کچھ دیر ندیم میرے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی شیروانی کی جیب سے ایک خوبصورت منقش ڈبیہ نکالی اور اس ڈبیہ کو کھولا اس ڈبیہ میں وائٹ گولڈ کی ہیرے کی نازک سی خوبصورت انگوٹھی تھی ندیم نے انگوٹھی ڈبیہ سے نکالی اور خالی ڈبیہ بیڈ کے سرہانے رکھ دی پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر وہ انگوٹھی میری انگلی میں پہنادی۔

'' آج کی رات میں اپنی محبت اور وفائیں آپ کے نام کر رہا ہوں مگر کچھ رسم دنیا بھی ہے لہٰذا یہ انگوٹھی آپ کی منہ دکھائی ہے۔'' ندیم نے خمار آلود آواز میں کہا تو میں نے پوری آنکھیں کھول کر انگوٹھی کو دیکھا خوبصورت نازک سی انگوٹھی میری تراشیدہ انگلی میں چمک رہی تھی۔

'' بہت خوبصورت انگوٹھی ہے مگر مجھے تحفے میں آپ اور آپ کی محبت چاہیے۔'' میں نے جواباً کہا

'' ارے بندہ تو کب سے آپ کا بے دام غلام ہے۔'' ندیم نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

خوشی اور مسرت کی لہریں میرے سارے بدن میں دوڑ رہی تھی میرا روم روم خوشی سے جھوم رہا تھا میرا رواں رواں ندیم کی محبت کا اسیر ہو چکا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی خواب انگیز روشنی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

میں خوشی اور مسرت کی معراج پر تھی میں نے اپنے محبوب کو پالیا تھا میں اکثر سوچتی تھی کہ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کتنے بدقسمت تھے جو اپنی محبت کو نہ پاسکے محبت میں مرنے سے اپنی محبت کے ساتھ جینا ہی اصل زندگی ہے۔

میں ندیم کے ساتھ قدم بقدم زندگی کی شاہراہ پر خوشی خوشی گامزن تھی ہم دونوں ہنی مون کے لئے ناردرن ایریاز گئے وہ میری زندگی کا سب سے حسین وقت تھا جہاں بس ہم دونوں تھے ہم دونوں گھنٹوں ایک دوسرے میں کھوئے رہتے، پہاڑوں پر، جھیل کے کنارے پر، سبزہ زاروں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے تھے کوئی فکر کوئی پریشانی ہمارے پاس نہیں پھٹک رہی تھی۔

مجھے یاد ہے ہماری شادی کے ایک ماہ بعد ویلنٹائن

ڈے آیا تو اس دن میں تیار ہو کر ندیم کا انتظار کر رہی تھی ندیم آفس سے واپس آئے تو سرخ گلابوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ان کے ہمراہ تھا اور ساتھ ہی میرے فیورٹ چاکلیٹ کا ڈبہ خوبصورت سے باسکٹ میں رکھا تھا انہوں نے گلدستہ اور چاکلیٹ کی باسکٹ مجھے دیتے ہوئے میری کانوں میں ہیپی ویلنٹائن کی سرگوشی کی میں نے بھی جواباً انہیں مبارکباد دی۔ انھوں نے میرے ہاتھ سے گلدستہ اور چاکلیٹ کی باسکٹ لیکر سائیڈ میں رکھی اور مجھے بھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ ندیم مزید گستاخیاں کرتے میں نے مسہری کے سرہانے رکھا پانی سے بھرا گلاس اٹھایا اور ان کے سر پر انڈیل دیا۔

"یہ کیا؟" ندیم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"سارے رومانس کا بیڑا غرق کر دیا۔"

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے زیادہ بے صبرے نہ بنیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مسز ندیم۔" ندیم نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا

"کپڑے بدل لیجئے۔ میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں۔"

یہ سن کر ندیم غسل خانے کی جانب بڑھے تو میں نے کچن کی جانب اپنے قدم بڑھا دیئے۔

میری زندگی اسی طرح خوشیوں سے لبریز تھی کوئی غم کوئی پریشانی ہمارے پاس نہ پھٹکتی تھی پھر وہ منحوس رات آئی جو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

اس منحوس کالی رات کو میں کبھی فراموش نہ کر پائی اس رات میری ملاقات انسپکٹر حیات اللہ نیازی سے ہوئی۔ اس رات ندیم کے ایک کولیگ کی شادی تھی ہم دونوں اس شادی میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے کہ ایک سڑک پر پولیس کی جیپ نے ہمیں رکنے کا اشارہ کی اور جیپ ہماری گاڑی کے آگے اس طرح لگا دی کہ ہماری گاڑی آگے نہ جا سکے۔ ناچار ندیم نے گاڑی کو بریک لگائے اور گاڑی روک دی۔ میں پریشان ہوگئی کیونکہ ہمارے ملک میں پولیس کا امیج کچھ اچھا نہیں ہے۔ گاڑی روک کی میں اور ندیم گاڑی سے باہر نکلے۔ پولیس جیپ سے حیات اللہ نیازی باہر آیا پھر اس نے ٹارچ کی روشنی ندیم کے چہرے پر ماری حالانکہ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔

"حیات!" ندیم حیات اللہ نیازی کو دیکھ کر زور سے بولے

"ندیم میرے دوست۔" حیات اللہ نیازی نے آگے بڑھ کر ندیم کو گلے لگا لیا یہ دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

"تم تو ٹریننگ پر گئے ہوئے تھے۔" ندیم نے حیات اللہ کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

"ٹریننگ مکمل ہوگئی اب تیرے ہی شہر میں تعیناتی ہے میری۔" حیات اللہ نیازی نے جواب دیا پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میرے اوپر ڈالی اور میرا اوپر سے نیچے تک معائنہ کیا۔

"واؤ...... چارمنگ...... بیوٹی فل...... اب کہاں سے پھنسائی۔" حیات اللہ نے میرا جائزہ لینے کے بعد انتہائی گھٹیا لہجے میں ندیم سے کہا۔ میں اس کے الفاظ اور اس کی ادائیگی سن کر جل بھن گئی۔

"ذرا تمیز سے بھابی ہے تیری۔" ندیم نے اس کی سرزنش کی۔

"یہ بھابی ہے۔ بالکل کالج گرل معلوم ہو رہی ہے۔ کہاں سے اڑائی۔" حیات اللہ نے ندیم کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سن کر بے چینی محسوس کر رہی تھی وہ اتنی بے باکی سے میرے متعلق گفتگو کر رہا تھا کہ مجھے حیا آ رہی تھی۔ مجھے حیات اللہ سے نفرت سی ہونے لگی بلکہ مجھے اس سے گھن آنے لگی حالانکہ وہ شاندار پرسنالٹی کا مالک تھا۔ اونچا لمبا قد، خوبصورت نقوش، سرخ وسپید رنگ اس پر طرحدار مونچھیں اس کی شخصیت کو متاثر کن بنا رہی تھی مگر...... مگر اس کے بات کرنے کا انداز نہایت عامیانہ تھا۔ اس لئے مجھے اس سے گھن ہی آ رہی تھی میں اپنا منہ دوسری جانب کر کے

کھڑی ہوگئی۔

''ہیلو بھابی۔'' حیات اللہ نے مجھے مخاطب کر کے ہیلو کہا تو میں نے بھی مروت کے مارے ہولے سے جواب دے دیا۔

''رہائش کہاں ہے تیری؟'' ندیم نے حیات سے پوچھا۔

''میں تو اپنی ی سائیڈ والی کوٹھی میں رہ رہا ہوں۔ تیری رہائش کہاں ہے۔'' حیات اللہ نے جواب دیتے ہوئے ندیم سے پوچھا

''اسی پرانے گھر میں رہائش ہے۔۔کبھی آنا گھر۔۔وہ گھر تو تیرا دیکھا ہوا ہے۔۔'' ندیم نے اخلاقاً کہا۔

''ہاں اب تو آنا ہی پڑے گا بھابی۔ جان کے ہاتھ کی چائے پینے۔'' حیات اللہ نے جواب دیا اس کے اس طرح بھابی جان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے انداز سے میں اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

''کون تھا یہ بدتمیز۔'' حیات اللہ نیازی سے رخصت لینے کے بعد گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے ناگواری سے پوچھا۔

''میرا کلاس فیلو۔'' ندیم نے مختصر جواب دیا

''انتہائی بدتمیز شخص ہے۔'' میں نے حیات اللہ نیازی کی شخصیت پر تبصرہ کیا۔

''یہ شروع سے ایسا ہی ہے جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتا۔ یونیورسٹی میں پروفیسرز بھی اس سے نالاں رہتے تھے''۔

''آدمی میں اتنے تو میزز ہونے چاہیے کہ کب کہاں کیا بات کرنی ہے۔''

''وہ جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتا ہے وہاں شائد اس طرح کا ماحول ہوگا۔ یہ نوکری وغیرہ تو وہ شوقیہ کرتا ہے ورنہ اس کا باپ زمان اللہ نیاری MNA ہے۔'' ندیم نے مجھے بتایا۔

''بہرحال مجھے آپ کا یہ دوست قطعی اچھا نہیں لگا اور آپ نے اسے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔''

میں نے روٹھنے والے انداز میں ندیم سے کہا

تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ اسے اتنی فرصت نہیں کہ وہ ہمارے گھر آئے۔ تم اپنا موڈ خراب مت کرو۔۔قسم سے آج قیامت ڈھا رہی ہو۔ میرا دل تو کر رہا ہے کہ اڑ کر گھر پہنچ جائیں ہم دونوں۔'' ندیم کی آواز جملے کے آخر میں رومانٹک ہوگئی تو میں نے شرما کر اپنی پلکیں جھکا لیں۔

☆......☆

ندیم کا خیال کہ حیات اللہ نیازی ہمارے گھر نہیں آئے گا خیال ہی رہا۔ دو دن بعد ہی وہ ہمارے گھر ٹپک پڑا۔

میں اور ندیم شام کی چائے پی رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی ندیم نے اٹھ کر مرکزی دروازے تک گئے جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ حیات اللہ بھی تھا مجھے اس کی آمد سخت ناگوار گزری مگر مہمان نوازی کے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اسے خوش آمدید کہنا پڑا۔ اس شام اس نے چائے ہمارے ساتھ پی اور میری چائے کی بے انتہا تعریفیں کیں۔

پھر تقریباً ہر شام اس کی ہمارے ہی گھر پر گزرنے لگی۔ وہ بہانے بہانے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوششیں کرتا۔ وہ میری بہت تعریفیں کرتا میرے پہننے اوڑھنے میری گھر کی سیٹنگ، کلر میچنگ، سجاوٹ اور میرے کھانے غرض وہ میری تعریفیں کرتا رہتا مجھے یہ سب بہت برا لگتا کیونکہ اس طرح میری تعریف کرنا صرف میرے شوہر ندیم کا حق تھا۔ میں نے کئی بار ندیم سے کہا کہ اسے گھر آنے سے روکے مگر ندیم مجبور تھے وہ حیات اللہ نیازی جیسے شخص کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے تھے۔ پھر ندیم جس کمپنی میں کام کرتے تھے اس کمپنی کے بڑے شیئرز ہولڈر حیات اللہ نیازی کے والد زمان اللہ نیازی تھے لہٰذا مجبوراً میں حیات اللہ کو برداشت کر رہی تھی۔

پھر ایک دن انتہا ہوگئی۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں تیار ہو کر ندیم کا انتظار کر رہی تھی ہمارا باہر آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجی تو میں سمجھی ندیم

آ گئے۔ میں جلدی سے دروازے تک پہنچی اور میں نے دروازے کی کنڈی کھولتے ہوئے کہا۔

''میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''زہے نصیب آپ ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔'' دراوزے میں حیات اللہ نیازی کھڑا تھا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گیا۔

''اوہ سوری۔ میں سمجھی ندیم آئے ہیں۔'' میں بوکھلا گئی۔

''آج تو ہمیں اپنی قسمت پر رشک آ رہا ہے ہمیں ندیم کی جگہ سمجھا گیا ہے۔'' حیات اللہ نیازی کا انداز حسب سابق عامیانہ تھا۔

''کیا مطلب!'' میرے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئی۔

''کچھ نہیں۔۔ندیم نہیں آیا اب تک۔۔'' حیات اللہ گھر کے لاؤنج کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے بولا

''بیٹھیئے۔ندیم آتے ہی ہوں گے۔'' میں نے مروتاً کہا تو وہ لاؤنج میں بچھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آج آپ کی سالگرہ ہے۔'' تھوڑی دیر بعد حیات اللہ نے خاموشی توڑی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا۔'' میں چپ گئی۔

''ہم پولیس والوں سے بھلا کوئی بات چھپی رہتی ہے۔''

''لیکن اس سلسلے میں ہم نے کسی کو مدعو نہیں کیا۔'' میں نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن میں تو آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں۔'' اتنا کہہ کر حیات اللہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا زیور کا ڈبہ کھولا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ ڈبے میں سفید ہیروں کا خوبصورت نیکلس تھا دیکھنے ہی میں وہ نیکلس اتنا قیمتی لگ رہا تھا کہ شائد ندیم زندگی بھر کما کر بھی مجھے ایسا نیکلس نہیں دلا سکتے تھے۔

''یہ نیکلس تو بہت قیمتی ہے۔'' میں نے نیکلس کو دیکھتے ہوئے کہا

''آپ سے زیادہ قیمتی نہیں۔''

''میں اتنا قیمتی تحفہ نہیں لے سکتی سوری۔'' میں نے انگلی سے نیکلس کا ڈبہ حیات اللہ کی جانب بڑھایا۔

''تحفہ واپس نہ کیجئے ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔ لایئے میں خود آپ کو یہ نیکلس پہنا دیتا ہوں۔'' حیات اللہ نیازی نیکلس لیکر میری جانب بڑھا تو میں بوکھلا کر پیچھے ہٹی اور میرا پیر لاؤنج میں رکھی کرسی سے ٹکرایا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑی۔

''ارے۔ارے آرام سے عدینہ۔چوٹ لگ جائے گی آپ کو۔'' حیات اللہ نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا اور چیخ کر کہا۔''بھابی کہیے۔عدینہ کہنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔۔''

''ہم تو آپ کو عدینہ ہی کہا کریں گے۔۔جب سے آپ کو دیکھا ہے ہماری تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔۔'' حیات اللہ نیازی نے نہایت عامیانہ انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں آپ کے دوست کی بیوی ہوں۔''

''اسی بات کا دکھ ہے۔ میں آپ کو صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہوں کہ آپ ندیم سے طلاق لے لو اور مجھ سے شادی کر لو۔'' حیات اللہ نیازی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے میز پر رکھا نیکلس اٹھایا اور اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

''ندیم میرے شوہر ہی نہیں۔۔میری پہلی اور آخری محبت ہیں اگر ایک منٹ کے اندر اندر تم یہاں سے نہیں گئے تو میں چیخ چیخ کر محلے والوں کا اکٹھا کر لوں گی۔'' میں زخمی شیرنی کی طرح دہاڑی۔

حیات اللہ نے زمین پر گرا ہوا نیکلس اٹھایا اور اسے ڈبے میں رکھتا ہوا بولا۔''میں جس چیز کو پسند کر لیتا ہوں اسے ضرور حاصل کرتا ہوں اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو مجھے انگلی ٹیڑھی بھی کرنی آتی ہے۔''

''جسٹ شٹ اپ گیٹ آؤٹ۔نکلو میرے گھر

سے۔۔۔ میں دھاڑی تو حیات اللہ نیازی وہاں سے چلا گیا۔ میں غصے سے پیچ و تاب کھانے لگی میرے ہی گھر میں مجھ سے اتنی بے ہودہ بات کرنے کی اس کی جرأت کیسے ہوئی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں حیات اللہ نیازی کو کچا چبا جاتی۔

آدھی رات گزر گئی ندیم نہیں آئے۔ میں ان کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ میں نے کئی بار ان کے موبائل پر ان سے رابطہ کرنا چاہا مگر ان کا موبائل سوئچ آف آرہا تھا۔ میں نے ان کے دفتر کے نمبر پر بھی فون کیا مگر وہاں بھی گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا آخر تھک ہار کر میں نے ابا جان کو فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ابا جان، امی جان اور بھائی جان ایک ساتھ گھر آگئے۔

''اس کے دوستوں کے نمبر ہیں تمہارے پاس۔''

گھر آنے کے بعد ابا جان نے مجھ سے پوچھا تو میرا سر نفی میں ہل گیا۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو ہم دیکھتے ہیں۔'' ابا جان اتنا کہہ کر بھائی جان کو ساتھ لیکر کہیں چلے گئے میں اور امی جان پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ مجھے شدید رونا آرہا تھا امی جان مجھے دلاسے دے رہی تھیں حالانکہ وہ خود بھی بے حد فکرمند تھی۔

آخر خدا خدا کرکے رات گزری سویرے ابا جان واپس آئے اور انھوں نے بتایا کہ ندیم کو غبن کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے اور اس وقت ندیم پولیس کی حراست میں ہے۔ یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی ندیم۔ میرے ندیم حوالات میں ہیں وہ بھی رات بھر سے۔

میں بے چین ہوگئی اور ابا جان سے ضد کرنے لگی کہ مجھے تھانے ندیم کے پاس لے کر چلیں۔ تھانے جاکر معلوم ہوا کہ کمپنی کے اکاؤنٹ سے پانچ لاکھ روپے جعلی دستخط سے نکلوائے گئے ہیں اور کمپنی کے مالک نے اس صورتحال کا ذمہ دار ندیم کو ٹھہرایا ہے۔

میں حوالات میں ندیم کو دیکھ کر پریشان ہوگئی پولیس والوں نے روایتی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ندیم کو بے انتہا تارچر کیا تھا۔ ندیم کا پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اس سے صحیح طریقے سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی میں ندیم کی حالت دیکھ کر رو پڑی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ندیم کو اپنی بانہوں میں چھپا لیتی۔ تھانے ہی میں معلوم ہوا کہ اس کیس کا انچارج انسپکٹر حیات اللہ نیازی ہے۔ میری سمجھ میں سب کچھ آگیا مجھے حاصل کرنے کے لئے حیات اللہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ آہ غریبی بھی کیا چیز ہے۔ ہمارا ملک تو صرف پیسے والوں کا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں کر لیتے ہیں ہم غریب سفید پوش تو صرف سسکنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے بے اختیار رونا آنے لگا میرے آنسو بہہ نکلے۔ مجھے روتا دیکھ کر ندیم بھی پریشان ہوگئے اور مجھے تسلی دینے لگے۔ میں ندیم کے ساتھ تھانے ہی میں رہنا چاہتی تھی مگر ابا جان زبردستی گھر لے آئے کاش...... کاش میں تھانے سے واپس نہ آتی تو...... تو مجھے وہ منحوس خبر سننے کو نہ ملتی۔

اگلے دن خبر ملی کہ ندیم نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ خودکشی نہیں ہے قتل ہے جو حیات اللہ نیازی نے کیا ہے۔ ندیم کے مرنے کی خبر نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ میں کئی دن اپنے حواسوں میں نہیں رہی بس ذرا دیر کو ہوش آتا تو ندیم کہہ کر پھر بے ہوش ہو جاتی۔ میری ہنستی کھیلتی زندگی کو آگ لگ گئی تھی۔ میں اپنے ندیم کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر خوشی خوشی گامزن تھی مگر حاسدوں کا حسد ہماری خوشیوں کو کھا گیا۔ مجھے اپنے ندیم کے قاتل کا نام معلوم تھا مگر آہ! ندیم کی موت کو خودکشی قرار دے کر کیس بند کر دیا تھا۔ آہ میں کتنی بے بس تھی اپنے ندیم کے قاتل کو سزا بھی نہ دلوا سکی کیونکہ میں ایک عام لڑکی تھی۔

☆......☆

عدت گزرنے کے بعد ایک دن ہمارے گھر دو عورتیں آئیں۔ میں زیادہ تر اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی تھی لہذا میں نے ان عورتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی

مگر رات کو ابا جان اور امی جان میرے پاس آئے اور ابا جان نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! ہم جانتے ہیں کہ ابھی ندیم کا غم تازہ ہے مگر تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ ہمیں شاید ابھی یہ بات نہیں کرنی چاہئے تھی مگر...... مگر رشتہ اچھا ہے۔'' میں نے ناسمجھی کے انداز میں ابا جان کی جانب دیکھا تو امی جان بول اٹھی۔

''تمہارے لئے رشتہ آیا ہے۔''

''امی جان۔'' میں سسک اٹھی تو امی جان نے مجھے گلے سے لگالیا۔

''بیٹا حیات اللہ نیازی کی بہنیں آئی تھیں، اپنے بھائی کا رشتہ لے کر......'' ابا جان کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے مگر ان کی اتنی ہی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''قاتل ہے وہ۔ قاتل ہے میرے ندیم کا۔'' میں چیخ اٹھی۔ مجھے اس طرح چیختے دیکھ کر ابا جان اور امی جان گھبرا گئے۔

''صبر بیٹا...... صبر۔'' ابا جان نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ابا جان۔۔'' میں سسکنے لگی پھر میں نے ہمت کر کے اس شام کی ساری روداد اور حیات اللہ کی حرکات ابا جان اور امی جان کو بتادی۔

''تم اتنا بڑا راز اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھیں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' ساری بات سن کر ابا جان بولے۔

''پہلے بتا دیتی تو کیا ہوتا۔ کیا حیات اللہ نیازی کو سزا دلوائی جاسکتی ہے۔ وہ اس ملک کی اشرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اس کا باپ MNA ہے۔۔۔ اس ملک میں صرف غریبوں کو سزا ملتی ہے امیر تو ہر قسم کی سزا سے مبرا ہے۔۔''

ابا جان میری بات سن کر خاموش ہو گئے شائد انہیں بھی حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا۔

پھر جب حیات اللہ کی بہن کا فون جواب کے لئے آیا تو امی جان نے اسے بے نقط سنا ڈالیں اور اس کے بھائی کو ندیم کا قاتل قرار دے ڈالا۔

آہ۔ کبھی کسی غریب اور بے بس لڑکی کو اچھی شکل و صورت نہیں ملنی چاہئے۔ میری خوبصورتی نے میری زندگی میں آگ لگادی۔۔ کاش میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی ایک عام سے نقوش کی لڑکی ہوتی تو آج اپنے ندیم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوتی۔

اسی شام یہ اندوہناک خبر ملی کہ میرے اکلوتے بھائی کو ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بھائی جان دفتر سے واپس آرہے تھے کہ ایک چوک پر انہیں روک کر تلاشی لی گئی تو ان کے پاس سے ایک پستول برآمد ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ حرکت کس کی ہوگی۔

ابا جان تھانے کی جانب دوڑے تو میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اپنے کمرے میں آکر حیات اللہ کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو کون؟'' دوسری جانب سے حیات اللہ کی آواز ابھری

''میں عدینہ بول رہی ہوں۔۔'' میں ضبط کی انتہا پر تھی۔

''زہے نصیب آج تو ہمارے قسمت جاگ اٹھے۔''

''میرے بھائی کا کیا قصور ہے۔''

''تمہارے بھائی کو میں نے گرفتار نہیں کیا۔''

''تم نے گرفتار نہیں کیا مگر یہ سب ہوا تو تمہارے ہی اشارے پر ہے۔ آخر...... آخر تم چاہتے کیا ہو۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ جس دن تم مجھ سے شادی کے لئے راضی ہو جاؤ گی۔ تمہارا بھائی رہا ہو جائے گا۔۔'' حیات اللہ کی آواز میں کمینگی تھی۔

''تم...... تم......'' مجھ سے مزید بات نہ ہو سکی آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے۔

''عدینہ تم۔ میری محبت کا اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے کچھ اور دکھائی

ہی ٹھکرا دیتا ہے۔ تم...... تم صرف میری ہو۔"

"میرے بھائی کو کب رہائی دلواؤ گے۔" میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم ہاں کر دو گی۔ ہماری شادی میں تمہارا بھائی ضرور شرکت کرے گا۔ یہ حیات اللہ نیازی کا وعدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم شادی کی تیاری کرو اور اپنے گھر والوں کے میرے گھر بھیج دو۔ شادی دو دن میں ہو جانی چاہیے۔ میں اپنے بھائی کو زیادہ دن تک حوالات میں نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے آخر کار اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"تھینک یو عدینہ۔ آخر کار میری محبت جیت ہی گئی۔" حیات اللہ نیازی نے فاتحانہ قہقہہ لگایا۔

☆......☆

دوسرے دن صبح بھائی جان حوالات سے چھوٹ کر گھر واپس آ گئے۔ ان پر بنا کیس بھی ختم ہو گیا اور اسی شام کو میری مہندی کی تقریب منعقد ہوئی۔ حیات اللہ کے خاندان کی عورتوں نے میرے ہاتھوں پر حیات اللہ کے نام کی مہندی لگائی اور کل۔ کل میری شادی تھی۔ حیات اللہ نیازی سے۔ آہ ہمارے معاشرے میں عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ جس شخص سے میں سب سے زیادہ نفرت کرتی ہوں اس کے نام کی مہندی میرے ہاتھوں پر سجائی گئی اور......اور وہ شخص کل میرے جسم و جاں کا مالک بن جائے گا۔ جس کے نام سے بھی مجھے کراہیت آتی ہے۔ آہ مجبوری۔ آہ بے بسی۔

☆......☆......☆

نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے میرے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل کر نکاح نامے میں جذب ہو گئے مگر کسی کو احساس بھی نہ ہوا میری ماں میرے دل کی کیفیت سے آگاہ تھی مگر......مگر وہ بھی کیا کر سکتی تھی وہ بھی مجبور تھی۔ ہمارے معاشرے میں عورت مجبور ہی ہوتی ہے۔ چاہے ماں ہو یا بیٹی۔ بہن ہو یا بیوی۔ مجبوری ہم عورتوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ آہ کتنا اچھا دور تھا جب بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور آج کل۔ آج کل بیٹیوں کو جوان کر کے زندہ در گور کیا جاتا ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی روایات کے نام پر، کبھی عزت و غیرت کے نام پر عورتوں کو قربان کر دیا جاتا ہیں عورت ساری عمر مردوں کی پگ (عزت) کی حفاظت کرتی ہے اور آخر میں بدنام ہو کر زندہ در گور کر دی جاتی ہے اور مرد......مرد جس کوکھ سے جنم لیتا ہے اسی کوکھ کی تجارت کرتا ہے پھر بھی عزت دار رہتا ہے اور عورت......عورت تو نرکھ کا دروازہ ہے۔

رخصتی کے وقت مجھے سجی سنوری گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا گیا میرے برابر حیات اللہ نیازی دولہا کے روپ میں بیٹھا تھا اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"آج میں نے تمہیں اپنا بنا ہی لیا۔ میں نے کہا تھا ناں۔ میں جس چیز کو پسند کر لوں اسے ضرور حاصل کر لیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگا اس کی ہنسی میں ایک فاتحانہ شان تھی۔ شادی ہال سے حیات اللہ کی کوٹھی تک اس کے آدمی مسلسل فائرنگ کرتے رہے۔ کوٹھی میں پہنچ کر حیات اللہ کے بہنوں نے مجھے سہاگ کی سیج پر بٹھا دیا۔ میں سر جھکائے خاموشی سے سیج پر بیٹھی تھی میرے دل میں کوئی امنگ کوئی ارمان نہیں تھا۔ میں ایک زندہ لاش تھی جسے بنا سنوار کر سیج تک پہنچایا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے کمرے کا دروازہ کھلنے پھر بند ہونے کی آواز آئی ساتھ ہی دروازے کی کنڈی بھی لگانے کی آواز ابھری۔ میں سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی تھی پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی گئی پھر وہ میرے قریب مسہری پر بیٹھ گیا اور میرا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم نے بہت انتظار کرایا ہے عدینہ۔ اب اس حسین چہرے کا نظارہ کرنے دو۔" حیات اللہ نے میری تھوڑی کے نیچے اپنی ہتھیلی رکھ کر میرا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔

کچھ دیر وہ میرے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے زیور کے ڈبے کو کھولا اور اس میں سے نیکلس نکالتے ہوئے کہا۔

"اس نیکلس کو تم نے پہننے سے انکار کیا تھا مگر۔۔ آج یہ نیکلس میں خود تمہیں پہناؤں گا۔" اتنا کہہ کر حیات اللہ نے نیکلس کو ڈبے سے نکالا اور نیکلس میرے گلے میں ڈالا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے گلے کے پچھلے حصے میں لے جا کر نیکلس کا لاک لگایا نیکلس میرے گلے کی زینت بن گیا پھر حیات اللہ کے ہاتھ میرے شانے پر سے ہوتے ہوئے آگے کی جانب آئے اور گستاخی کر گئے۔

"اف عدینہ۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تم نے بہت تڑپایا ہے۔" اتنا کہہ کر حیات اللہ نے میرا گھونگھٹ اتار کر سائیڈ میں پھینک دیا اور مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے لیٹ گیا۔

"اب تو میں تمہاری ہوں۔ اتنی بھی کیا بے صبری۔۔ یہ زیور تو اتارنے دو۔" میں نے بڑی لگاوٹ سے حیات اللہ سے کہا۔

"اسی طرح لیٹے لیٹے اتار دو۔"

میں حیات اللہ کے سینے پر سر رکھے ایک ایک زیور اتار رہی تھی زیور اتار کے میں نے مسہری کے سرہانے رکھے اور اپنے داہنے ہاتھ سے حیات اللہ کا بایاں ہاتھ پکڑا اور دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ کو سر سے بلند کر کے مسہری کے سرہانے کی جانب لے کر گئی حیات اللہ میرے اس انداز کو میری خود سپردگی سمجھا میں اس کا ہاتھ مسہری کے سرہانے تک لے کر گئی۔ راڈ آئرن کے مسہری کے سرہانے لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئیں تھیں اس سلاخوں میں سے ایک مضبوط سلاخ میں ایک ہتھکڑی لگی ہوئی تھی ہتھکڑی کا ایک سرا مضبوط سلاخ میں لگا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے ہتھکڑی کا دوسرا سرا پکڑا اور حیات اللہ کی کلائی سے ہتھکڑی کا دوسرا سرا لگایا اور ہتھکڑی کا لاک بند کر دیا اس کے ساتھ ہی میں کروٹ لیتی ہوئی مسہری سے نیچے اتر گئی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" حیات اللہ کو جب ہتھکڑی کا احساس ہوا تو وہ اپنے ہاتھ کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔

"آج تک تم نے جو بے ہودگیاں کی ہیں یہ اس کا ایک ادنیٰ سا جواب ہے۔"

"یہ ہتھکڑی تمہیں کہاں سے ملی۔۔"

"تم ہی تو کہتے ہو کہ اس ملک میں پیسوں سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک معمولی ہتھکڑی ہے۔"

"لیکن اس طرح ہتھکڑی پہنانے کا تمہارا کیا مقصد ہے۔" حیات اللہ نیازی کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

"تمہیں شراب پینے کا بہت شوق ہے نا۔" میں نے کمرے کے کونے میں رکھے کارنس پر سجی شراب کی بوتلوں میں سے ایک بوتل اٹھاتے حیات اللہ سے پوچھا۔ میرے سوال پر حیات اللہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔

"تم نے دوستوں کے ساتھ تو بہت دفعہ شراب پی ہوگی آج میرے ساتھ بھی تھوڑی سے شراب پی لو۔" اتنا کہہ کر میں نے شراب کی بوتل کھولی اور مسہری سے دور کھڑے ہو کر شراب حیات اللہ نیازی پر چھڑکنے لگی۔

"تم...... تم کیا کرنا چاہ رہی ہو۔" حیات اللہ نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میرا یہ جسم ندیم کی امانت ہے جسے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں لگا سکتا۔۔" میں نے شراب بستر پر چھڑکتے ہوئے کہا پھر باقی بچی ہوئی شراب میں نے اپنے اوپر انڈیل لی پھر میں اپنے میک اپ بکس تک گئی جو میرے میکے سے میرے ساتھ آیا تھا۔ میں نے میک اپ بکس کھولا اور میں سے ایک لائٹر نکالا اور لائٹر جلایا تو ایک ننھا سا شعلہ بلند ہوا۔

"عدینہ...... عدینہ...... یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟" حیات اللہ نیازی میری نیت بھانپ گیا۔

"حیات اللہ نیازی تم نے۔ تم نے میری ہنستی بستی زندگی کو آگ لگا دی، میری گرہستی کو شعلوں کی نذر کر دیا۔۔۔ تم نے میرے ندیم کو مار دیا۔" میں غرائی۔

"نہیں...... نہیں میں نے ندیم کو نہیں مارا۔ اس

نے خودکشی کی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو ورنہ......" میں نے لائٹر کا شعلہ بستر کے قریب کیا۔

"ہاں......ہاں میرے کہنے پر ہی میرے آدمیوں نے ندیم کو مار کر خودکشی کا رنگ دیا تھا مگر......مگر عدینہ میری محبت کو سمجھو میں......میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اس لئے۔"

"اپنی ہوس کو محبت کا نام مت دو۔" میں نے حیات اللہ کا جملہ کاٹا "تم......تم مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے نا۔لو مجھے حاصل کرلو۔"

اتنا کہہ کر میں نے اپنے کپڑوں کو آگ لگادی میں پوری طرح شراب میں بھیگی ہوئی تھی لہذا آگ فوراً بھڑک اٹھی۔

"حیات اللہ نیازی۔تم نے مجھے حاصل کرنے لئے بہت لمبی پلاننگ کی۔میرے جسم سے کھیلنے کے لئے تم نے ندیم کو مارڈالا مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں تم سے شادی کرلوں اور......اوہ......اب تو......اب تو میں تمہاری بیوی ہوں۔میرے جسم پر تمہارا پورا حق ہے۔لو مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔" میں اپنے بازو پھیلا کر حیات اللہ کی جانب بڑھی۔

"نہیں......بچاؤ......بچاؤ......" حیات اللہ نیازی بری طرح چیخ رہا تھا وہ بار بار اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ کو جھٹکے دے رہا تھا وہ مجھ سے دور چلے جانا چاہتا تھا مگر مسہری کے راڈ میں بندھی ہتھکڑی اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی میری کھال جل چکی تھی آگ گوشت اور چربی تک پہنچ رہی تھی میں نے دانت بھینچ کر اپنی چیخیں روکیں اور اپنے بازو پھیلا کر آگے بڑھی اور حیات اللہ نیازی سے لپٹ گئی۔

"بچاؤ......بچاؤ......" حیات اللہ بری طرح چیخ رہا تھا اس کی چیخیں سن کر اور آگ کی بو پا کر گھر کے دیگر افراد دروازہ پیٹنے لگے پھر دروازے پر زور زور سے ٹکریں لگنے لگیں شائد باہر کھڑے لوگ دروازہ توڑ کر کمرے میں آنا چاہتے تھے۔

آگ نے حیات اللہ نیازی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔میں اور حیات اللہ نیازی سہاگ کی سیج پر شعلوں میں لپٹے تھے۔حیات اللہ کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑنے لگیں۔میں نے اپنی بند ہوتی آنکھوں سے حیات اللہ نیازی کو دم توڑتے دیکھا آج......آج میرا انتقام پورا ہو گیا۔میرے ندیم کو مارنے والا خود بھیانک موت سے ہمکنار ہو گیا۔میری آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔آگ نے مجھے بھی پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔میں بے سدھ ہو گئی اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سامنے کوئی کھڑا ہے۔

"کون ہے۔" میرے ذہن میں خیال ابھرا۔میں نے غور سے دیکھا۔وہ......وہ ندیم تھا......میرا ندیم جو بانہیں پھیلائے کھڑا تھا میں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"ارے یہ کیا۔میرا لباس کیسے تبدیل ہو گیا۔شادی کا بھاری بھرکم لباس کہاں گیا۔اور......اور یہ کتنا پاکیزہ لباس ہے۔" میں نے سوچا۔

میں ندیم کی جانب دوڑی ارد گرد کا ماحول بھی کتنا پاکیزہ ہے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔

میں دوڑتی ہوئی ندیم کی بانہوں میں سما گئی۔کیسا اطمینان کیسا سکون ہے یہاں میں ندیم کی بانہوں میں تھی میں نے آہستہ سے اپنا سر ندیم کے شانے پر رکھ دیا۔

☆......☆......☆

جب دروازہ ٹوٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ سہاگ کی سیج جل کر راکھ ہو چکی ہے اور اس راکھ ہوئی سیج پر دو سوختہ لاشیں پڑی ہیں۔ایک لاش کا چہرہ اذیت سے بگڑ چکا ہے جبکہ دوسری لاش کے چہرے پر بڑی مدھر مسکان ہے۔

پرانی کہاوت ہے سہاگ کی سیج گرم ہوتی ہے اور سیج کو گرم رکھنے کی ذمہ داری دلہن پر عائد ہوتی ہے۔حیات اللہ نیازی کی دلہن نے اس کی سیج کو ہی گرم رکھا باقی سب کچھ تو ٹھنڈا کر دیا۔

☆☆☆ ☆☆☆

فرینڈ شپ

ارم خان

ڈی جی خان سے، ایک عبرت سامانی' آج کے دور کی نمائندہ تحریر

میں اپنی عادت سے مجبور باتوں میں مصروف تھی اور میرے ساتھ بیٹھی آپی جواب بس ہوں ہاں کی صورت میں ہی دے رہی تھی لیکن مجھے یہ ان کا ہاں ہوں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے جواب ہاں ہوں کے بدلے باتوں میں دیں لیکن وہ بھی کیا کرتیں بے چاری وہ تو اپنے سامنے رکھی آئس کریم سے انصاف فرما رہی تھی۔ اب بہتر یہ تھا کہ میں آپی کو ان کے حال پر چھوڑتی اور اپنی آئس کریم سے انصاف کرتی، سو میں نے ایسا ہی کیا۔

ہونٹ خاموش ہو گئے لیکن پتا نہیں کیوں آنکھوں نے اپنے ساتھ والی میز کو دیکھنا ضروری سمجھا جس کے اردگرد کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی نظریں وہاں سے ہٹاتی، میں نے محسوس کیا جیسے کوئی دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہوں۔ میری تھوڑی سی ہی توجہ کے بعد پتا چلا کوئی بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

آنکھوں میں اپنا پن سمائے ہوئے مجھے دیکھنے والا یہ چہرہ کون ہے۔ میں نہیں جانتی تھی مگر اتنا سمجھ چکی تھی کہ وہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا ہے۔

بچپن سے ہی میری یہ خواہش تھی کہ میری بہت سی سہیلیاں ہوں۔ مجھے بچپن سے ہی لڑکیوں سے دوستی کرنا اچھا لگتا تھا۔ میری یہ خواہش شاید قسمت کو بھی منظور تھی، سو اکثر ہاتھ میری طرف دوستی کے لیے بڑھتے اور میں ان ہاتھوں کو خوشی سے تھام لیتی۔ ان ہاتھوں میں اکثر ہاتھ انجان ہوتے۔

ان انجان ہاتھوں میں بھی شاید دوستی کی لکیر ہوتی۔ اس طرح دوستی کی لکیریں ہاتھ ملاتے، وقت ملتی اور دوستی ہو جاتی۔ میری بہت ساری دوستوں میں جب ایک اور دوست کا اضافہ ہوتا تو مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی اور جب آج ہم آئس کریم پارلر پر آئس کریم کھانے آئے تھے تو ایک انجان چہرے والی لڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے، پر شاید مجھے آپی کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر بات نہیں کر پا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری آئس کریم ختم ہو گئی اور ہم گھر واپس جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ ہم جانے کے لیے قدم بڑھاتے ایک ہاتھ میری طرف بڑھا۔

''السلام علیکم۔'' میں دیکھا اب وہی لڑکی مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''میرا نام مریم ہے۔'' اس نے بتایا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور انداز دوستانہ تھا۔

''اور میرا نام نور۔'' میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''میں آپ کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی، پر آپ باتوں میں مصروف تھیں۔ آپ مجھے اچھی لگیں، سو آپ سے بات کرنے کو دل کرنے لگا۔ پر میں کچھ گھبرا رہی تھی کہ کیا خبر آپ مجھ سے بات کریں گی بھی یا نہیں کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے انجان ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ انجان لوگوں سے بات نہیں کرتے۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سے مل کر مجھے بھی کافی اچھا لگا۔ کہاں رہتی ہیں آپ۔'' میں نے پوچھا۔

''اسی شہر میں ہی رہتی ہوں اور آپ کہاں رہتی ہیں۔''

''میں بھی اسی شہر میں رہتی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کون سی جگہ پر۔'' اس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں مریم کے سوال کا جواب دیتی عین اسی وقت آپی کا سیل فون بجنے لگا۔ آپی نے نمبر دیکھا اور سیل فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف امی تھیں اور وہ پوچھ رہی تھیں کہ تم لوگ ابھی تک کہاں ہو، گھر کیوں نہیں آئیں۔'' پھر آپی نے مجھ سے کہا۔ ''اب جلدی چلو مارکیٹ میں ویسے بھی ہم کافی لیٹ ہوگئے ہیں۔''

''اب مجھے چلنا ہوگا۔ آپ سے مل کر مجھے بہت اچھا لگا۔'' میں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بار پھر مریم سے ہاتھ ملایا اور جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ مریم نے کہا۔ ''ایک منٹ رکو یہ میرا نمبر ہے کبھی دل کرے تو بات کرلینا۔''

میں نے مریم کا نمبر اپنے موبائل میں Save کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے آگئی۔

مریم سے مل کر سچ میں مجھے اچھا لگا تھا۔ وہ تھی بھی



خوب صورت۔ اس کی آواز بھی پیاری تھی اور سب سے بڑھ کر جو مجھے اچھا لگا وہ اس کا میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا تھا۔

میں نے گھر آ کر سوچا مریم کو کال کروں مگر اگلے ہی پل میرے خیالوں میں فرح آ گئی اور فرح کا خیال آتے ہی دماغ نے مریم کو کال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مریم دیکھنے میں بے شک اچھی لڑکی تھی مگر وہ حقیقت میں کیسی ہے میں نہیں جانتی تھی اور اب میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میرے لیے بس اتنا جان لینا کافی تھا کہ مریم میرے لیے ایک انجان لڑکی ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے انجان ہی رہیں تو اچھا ہے۔

زندگی میں کئی لوگ ملتے ہیں اب ہم ہر کسی سے تو ہمیشہ کے لیے رابطہ نہیں رکھ سکتے نا۔ ہر ہاتھ ملانے والے کو دوست نہیں بنا سکتے ناں، سو بہتری اسی میں ہے کہ کچھ لوگوں سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کے انہیں مسکراتے ہوئے ہی الوداع کہہ دینا چاہیے اور آج میں ایسا ہی کر رہی تھی۔

میں نے ایک پل میں مریم کا نمبر اپنے سیل فون سے کاٹ دیا۔ شاید ہو سکتا تھا کہ میں مریم کا نمبر ختم نہ کرتی اور اسے کال کرتی واقعی ایسا ہو سکتا تھا اگر فرح کا خیال نہ آتا تو۔

فرح کون تھی، فرح میری ایک دوست تھی جس سے میری دوستی آج سے ایک ماہ اور کچھ دن پہلے ہوئی تھی۔ ہماری ملاقات مارکیٹ میں ایک شاپ پر ہوئی تھی۔ اس نے بالکل مریم کے انداز میں میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں نے بھی جواب میں اسی انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔ میں نے اس وقت فرح کا چہرہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ فرح دیکھنے میں کیسی ہے، بس میں نے اتنا جان لیا تھا کہ فرح کی زبان میں بہت مٹھاس، خلوص اور اپنائیت تھی۔ فرح کے ساتھ اس کی تین بہنیں اور تھیں۔ وہ سب بھی فرح کی طرح بہت اچھی تھی لیکن میری دوستی صرف فرح سے ہوئی کیونکہ وہ میری ہم عمر تھی۔ فرح نے اپنا نمبر بتایا جسے میں نے اپنے موبائل میں Save کر لیا تھا۔

مارکیٹ میں اب ہمارا کام ختم ہو چکا تھا اس لیے ہم گھر واپس آ گئے مگر فرح نے بتایا کہ ان کا کام ابھی باقی ہے، سو وہ لیٹ ہو جائیں گی گھر جا کر وہ مجھے کال کرے گی۔ میرے گھر پہنچ جانے کے تقریباً چار گھنٹے بعد فرح کی کال آ گئی۔ میں نے لیس کا بٹن دبا کے موبائل کان سے لگا لیا۔

یہ فرح کی اور میری پہلی کال تھی جس کا ٹائم تھا بیس منٹ۔ اس بیس منٹ کی کال میں فرح نے اپنے بارے میں بتایا۔ تعلیم کے بارے میں، اپنے بہن بھائی کے بارے میں۔ اس کے والد صاحب کیا کام کرتے ہیں اس بارے میں۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بھی سب بتا دیا۔

اس طرح ایک انجان لڑکی سے میری دوستی ہو گئی۔ اب فرح اور میں ایک دوسرے سے روز باتیں کرتے، کبھی کال پر تو کبھی ایس ایم ایس پر۔

فرح ایک اچھی اور شریف لڑکی تھی۔ یہ اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا۔ ہماری دوستی ہوئے ابھی کچھ دن ہوئے تھے کہ اچانک ایک انجان نمبر سے میسج آنا شروع ہو گئے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ مجھے میسج کرنے والا کون ہے۔ میں نے ایک بار سوچا کہ اس نمبر پر میسج کر کے پوچھوں کہ وہ کون ہے اور میسج کیوں کر رہا ہے مگر چاہنے کے باوجود بھی میں نے اس نمبر پر کوئی میسج نہیں کیا اور یہ سوچ کے تسلی کر دی کہ جو ہوگا خود بتائے گا۔

اس نمبر سے مسلسل میسج آتے رہے مگر جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اگلے دن کال آ گئی جو میں نے ریسیو کر لی، آخر میں بھی جاننا چاہتی تھی کہ وہ ہے کون؟

”ہیلو!“

”ہیلو، کون؟“ دوسری طرف مردانہ آواز تھی۔ حیرت یہ تھی کہ مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ میں کون ہوں جب کہ یہ سوال تو مجھے کرنا تھا۔

”آپ نے کسے کال کی ہے۔“ میں نے سوال کیا۔

”میں نے آپ کو کال کی ہے۔“ جواب ملا۔

"آپ نے مجھے کس لیے کال کی ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتی، آپ کون ہیں؟"

"جانتا تو میں بھی آپ کو نہیں ہوں لیکن اگر آپ مجھ سے بات کریں گی تو جان پہچان بھی ہو جائے گی، اس میں کون سی بڑی بات ہے۔" ایک ادا سے جواب آیا۔

"میرا دماغ خراب ہے کیا جو میں آپ سے بات کروں گی۔ یہ بتائیں آپ کو میرا نمبر کس نے دیا ہے۔" میں نے غصے سے پوچھا۔

"مس نور مجھ سے دوستی کرو گی۔" گویا میرے غصے کا کچھ اثر نہیں ہوا اس بے شرم کے اوپر۔ اور میری بات اس نے نظرانداز کردی۔

"میں تم جیسے لوفر لوگوں سے بات نہیں کرتی۔ دوستی تو دور کی بات ہے۔"

"مجھ جیسے کیا مطلب؟" دوسری طرف سے مکمل سنجیدہ ہو کر پوچھا گیا تھا۔

"تم جیسے کا مطلب، جن کی اپنی بھی بہنیں ہوتی ہیں لیکن وہ ان کی حفاظت کا وقت دوسروں کی بہنوں کو تنگ کرنے اور انہیں پھنسانے میں ختم کر دیتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے جو آج ہم کسی کی بہن کے ساتھ کر رہے ہیں کل وہ ہماری بہن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔" میں غصے میں جانے اور بھی کیا کیا کہتی چلی گئی۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا میرا کال کرنا؟" کچھ دیر بعد سوال ہوا۔

"جی بالکل اچھا نہیں لگا۔" میں نے سختی سے جواب دیا۔

"ویسے آپ مجھے جیسا سمجھ رہی ہیں میں ویسا بالکل نہیں ہوں۔ میرا ارادہ آپ کو تنگ کرنے کا نہیں تھا۔ اگر آپ کو میرا کال کرنا برا لگا اس کے لیے سوری، آئندہ میری کال نہیں آئے گی۔ بس اس بار آپ مجھے معاف کردیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بس اتنا ہی کافی ہے، بس آئندہ یاد رکھیے گا کہ ہر لڑکی ایک جیسی نہیں ہوتی، بری بات ہے کسی کو تنگ کرنا۔" اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے پھر اب میرے غصے کا بھی کوئی مطلب نہ تھا۔ "ویسے آپ ہیں کون اور میرا نمبر کس نے دیا آپ کو؟"

"میرا نام علی ہے۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

"اور میرا نمبر کس نے دیا ہے آپ کو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"آئندہ میری کال نہیں آئے گی۔ بس آپ اس بات کو سمجھئے خدا حافظ۔"

کال ختم ہو چکی تھی اور دل میں ایک سکون اتر گیا کہ اب یہ جو بھی ہے مجھے تنگ نہیں کرے گا۔ بے چین کرنے والا ایک سوال پھر بھی دل میں تھا کہ اسے میرا نمبر کس نے دیا ہوگا۔

☆......☆

"نور اب تم میری اچھی دوست ہو ایک بات تو بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"

"کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" فرح نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ کوئی لڑکا دوست ہے آپ کا۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کسی کو پسند کرتی ہو نہ تمہارا کوئی دوست ہے، تم اپنا وقت کیسے گزارتی ہو۔"

مجھے فرح کا یہ سوال بہت عجیب سا لگا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ وقت گزارنے کے لیے کسی لڑکے کا ساتھ ضروری تو نہیں اور یہ بات اُس نے کہہ بھی دی۔

"نو ضروری ہے۔" اس نے کہا۔

"شاید، خیر! تم بتاؤ تم کسی کو پسند کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میں کسی کو پسند نہیں کرتی۔ میں بس ٹائم پاس کرتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹائم پاس کیا مطلب فرح۔" میں نے انتہائی حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہاں اب محبت نہیں ہے، بس ٹائم

پاس کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ میں بھی ایسا کرتی ہوں۔ میرے کچھ دوست ہیں، میں ہر روز ان سے موبائل پر باتیں کرتی ہوں اور اکثر ہم کہیں گھومنے بھی جاتے ہیں۔'' فرح کی باتوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ فرح کا یہ کون سا روپ تھا۔ یہ وہ روپ تو نہ تھا جو اس کا روپ میں نے ملاقات والے دن دیکھا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں مجھے بڑا سوچنے پر گویا مجبور ہی کر دیا تھا۔ جب اس نے بتایا کہ اس کی ہر ضرورت اس کے دوست پوری کرتے ہیں۔ اس کے پاس سب کچھ ہے اور اسے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔

''اف توبہ! کیسی لڑکی ہے یہ فرح، میں نے اسے کیا سمجھا اور یہ کیا نکلی۔'' مجھے فرح کی باتوں پر بہت حیرت ہوئی۔ آج جو باتیں وہ اپنے بارے میں بتا رہی تھی وہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فرح ایسی ہوگی۔ فرح نے اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا اور ان سب باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ فرح اچھی اور شریف لڑکی نہیں ہے جیسا میں نے سمجھا تھا وہ ویسی بالکل بھی نہیں ہے۔

''نور تم بھی کوئی دوست کیوں نہیں بنا لیتیں۔ بنا دوست کے تمہارا وقت تو بے مزہ گزرتا ہوگا۔ کوئی امیر دوست بناؤ اور گھر بیٹھے مزے لو۔ روز مفت بیلنس منگواؤ اپنی ضرورت کی ہر چیز کا گھر بیٹھے حکم کرتی رہو پھر دیکھو مزہ جینے کا۔''

کچھ دیر بعد فرح مجھے بھی اپنی راہ پر چلنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

''فرح مجھے اس طرح سے زندگی جینے کا کوئی شوق نہیں ہے، آئندہ تم مجھے ایسے مشورے نہ دینا کیونکہ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں ہیں۔ ہاں اگر میری بات مانو تو تم بھی ایسے برے کاموں سے دور ہو جاؤ جن کا انجام بہت ہی برا ہے۔''

''آپ کے گھر میں اس وقت آپ کے سوا اور کون جاگ رہا ہے۔'' فرح کو شاید میری بات اچھی نہیں لگی تھی اس لیے اس نے بات ہی بدل دی۔

''میں اور میرا بھائی۔'' میں نے بتایا۔

''آپ کے بھائی کیا کر رہے ہیں ابھی تک سوئے نہیں۔'' فرح نے سوال کیا۔

''اصل میں ان کے دوست کی کال آئی ہوئی ہے وہ ان سے بات کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ سو رہے تھے۔'' میں نے بتایا۔

''دوست لڑکی ہے یا لڑکا؟'' فرح نے سوال کیا۔

''نہیں، لڑکی نہیں ہے۔ لڑکے سے بات کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ لڑکے سے بات کر رہے ہیں۔'' فرح نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''اس لیے کہ وہ میرے بھائی ہیں اور میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' میں نے تنگ کر کہا۔

''نور تم لڑکوں کو نہیں جانتی ہو۔ یہ لڑکے بہت تیز ہوتے ہیں اگر یقین نہ آئے تو آزما لو۔ تمہارا بھائی یقیناً کسی لڑکی سے ہی بات کر رہا ہوگا تم چھپ کے ان کی باتیں سنو پھر پتا چلے گا تمہیں۔'' فرح نے کہا۔

''فرح میں اپنے بھائیوں کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ مجھے اپنے ہی گھر میں جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے جواب دیا۔

''ویسے تمہاری مرضی نور پر مجھے ضرور شبہ ہے کہ رات کے بارہ بجے اتھ کر کوئی لڑکا ہی لڑکی سے بات کر سکتا ہے ورنہ ایسے کون اتنی رات تک جاگتا ہے تم خود سوچو۔''

''ہم بھی تو دونوں لڑکیاں ہیں۔ ہم بھی تو بات کر رہی ہیں۔ اس وقت تک۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ بھی ہے۔'' اس نے کہا۔

''فرح اب کل بات کریں گے، میں سو رہی ہوں تم بھی سو جاؤ، گڈ نائٹ۔''

''او کے گڈ نائٹ۔'' اس نے کہا اور کال ختم ہو گئی۔ میں نے موبائل رکھ دیا مگر سوئی نہیں۔ مجھے غصہ آ رہا تھا فرح کی باتوں پر۔ کبھی وہ مجھے لڑکوں سے دوستی کرنے کے مشورے دے رہی تھی اور کبھی میرے ہی گھر میں جاسوسی کرنے کو کہہ رہی تھی۔ عجیب لڑکی تھی

یہ فرح کی بجی۔

فرح کے بارے میں سوچتے سوچتے جانے کب نیند آنکھوں میں آٹھہری۔

رات گزری اور اگلا دن بھی بڑی خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ حیرت یہ تھی کہ جو فرح بار بار مجھے میسج کرتی تھی آج دن میں اس کا ایک میسج بھی نہیں آیا تھا۔ میں گھر کے ہر کام سے فارغ ہو کے اپنے کمرے میں آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد موبائل کی بیل بجی۔ میں نے موبائل کی اسکرین پر دیکھا تو فرح کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی اور سلام کیا مگر دوسری طرف سے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ پھر میں نے کئی بار ہیلو کہا۔" پر دوسری طرف سے خاموشی کے سوا کوئی نہ بولا پھر اگلے ہی پل کال کاٹ دی گئی۔

کون ہے یہ جس نے کال تو کی پر بات نہیں کی۔ یہ فرح تو نہیں ہے اگر فرح ہوتی تو ضرور بات کرتی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ فرح کے نمبر سے ایک میسج آگیا جس میں مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ میں کون ہوں؟

"آپ کون؟" میں نے لکھ کے میسج کر دیا۔

"پہلے آپ تو بتائیں آپ کون ہیں؟" جواب آیا۔

"یہ نمبر تو فرح کا ہے، فرح کہاں ہے۔ وہ مجھے جانتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"فرح سوگئی ہے۔" جواب آیا۔

"آپ کون ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں فرح کا بھائی ہوں۔" جواب آیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"بھائی میں فرح کی دوست ہوں۔" میں نے جواب لکھا۔

"نام کیا ہے آپ کا۔" ایک اور میسج ملا۔

مجھے ان کا یہ میسج اچھا نہیں لگا کیونکہ جب میں نے بتا دیا کہ میں فرح کی دوست ہوں پھر ان کا کوئی حق نہیں بنتا تھا وہ مجھے اور میسج کریں اور میرا نام پوچھیں۔

"بھائی آپ میرا نام کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ دل کر رہا تھا پوچھنے کا، سو پوچھ لیا۔"

"سوری میں اپنا نام نہیں بتا سکتی اگر جاننا ضروری ہے تو فرح سے پوچھ لیں۔"

فرح سے تو میں پوچھ ہی لوں گا لیکن اگر آپ بتا دیتیں تو دل کو سکون مل جاتا۔"

فرح کا بھائی کیسا لڑکا ہے یہ مجھے اس وقت پتا چل گیا پھر اس کے کئی اور بھی میسج آئے مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سوچ لیا کہ کل فرح کو بتاؤں گی اس کے بھائی کے بارے میں۔

"فرح آپ کے بھائی نے رات مجھے میسج کیے تھے۔" اگلے دن میں نے فرح کو بتایا۔

"ہاں بھائی مجھے بتا رہے تھے۔" فرح نے جواب دیا۔

"فرح انہوں نے جب تمہیں بتایا تو تم نے پوچھا نہیں کہ انہوں نے مجھے میسج کیوں کیے اور تم نے انہیں روکا نہیں۔" میں نے کہا۔

"نور وہ میرے بڑے بھائی ہیں اب میں انہیں کیا کہوں۔"

"بڑے بھائی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں وہ تمہاری دوستوں کو میسج کریں۔ ان کا نام پوچھیں۔ تمہیں انہیں روکنا چاہیے اس بات سے، یہ غلط ہے۔"

میرے سمجھانے پر بھی فرح کی سمجھ میں بات نہ آئی جس کی وجہ سے مجھے فرح اب اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے گھر کے کام کا بہانہ کر کے کال ختم کر دی۔ کال ختم ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ موبائل کی میسج ٹون بجنے لگی۔ میں نے موبائل اٹھا کر میسج دیکھا اور نمبر پہچان لیا۔ یہ تو وہ نمبر تھا جس سے کچھ دن پہلے میسج آئے تھے۔ پھر اس کے بعد کال آئی تھی اور اس کال کرنے والے نے کہا تھا کہ وہ اب پھر نہ کال کرے گا اور نہ میسج۔ میں نے سوچا تھا کہ اس کی سمجھ میں شاید میری بات آگئی ہے مگر شاید یہ صرف میری سوچ تھی جو اس کے میسج نے آج یہ ثابت کر دیا تھا۔

وہ میسج جس میں السلام علیکم لکھا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈلیٹ کر دیا۔

"ہیلو میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں

جواب دیں۔'' کچھ دیر بعد ایک اور میسج آیا۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں پلیز جواب دیں۔'' ایک گھنٹے بعد ایک اور میسج ملا لیکن میں نے کسی میسج کا جواب نہ دیا۔ میں جانتی تھی وہ مجھ سے بات کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے اور کچھ نہیں ہے۔ میں اس کا ہر میسج پڑھ کے ڈلیٹ کر رہی تھی۔

☆......☆

رات کو پھر فرح کے بھائی نے میسج کرنا شروع کر دیا اور اس بار تو اس نے مجھے پھنسانے کی پوری کوشش کی اور یہ پوری کوشش ایک چھوٹے سے میسج میں تھی۔ وہ چھوٹا سا میسج جس میں لکھا تھا۔ ''السلام علیکم نور جی اس دن آپ نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا دیکھو میں نے فرح سے جان لیا آپ کا نام۔ فرح نے آپ کے نام کے ساتھ مجھے یہ بھی بتایا کہ بہت ہی اچھی ہو آپ اور اس بات کو میرا دل بھی مانتا ہے۔ کل رات آپ کی آواز سنی جو بہت ہی پیاری ہے۔ جب سے آپ کی آواز سنی ہے دل کو پل بھی چین نہیں ملا۔ پلیز برا نہ سمجھنا میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں۔ مجھے جیسے ہم سفر کی تلاش تھی آپ بالکل ویسی ہو۔ پلیز آپ میرے بارے میں ایک بار ضرور سوچنا، میں کوئی غلط لڑکا نہیں ہوں۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔ امید ہے آپ میرا دل نہیں توڑیں گی۔''

''شرم آنی چاہیے آپ کو یہ سب کہتے ہوئے۔ کل میں نے آپ کو بھائی کہا ہے اور آج آپ مجھے یہ سب کہہ رہے ہیں اگر آپ کے اندر تھوڑی سی بھی شرم ہوتی تو آپ ایسا نہ کہتے۔ میں جانتی ہوں کس طرح کے لڑکے ہیں آپ۔ مجھے پھنسانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' میں نے یہ سب لکھ کے میسج کر دیا پھر اس کے کئی اور میسج آئے مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا پھر جب اگلے دن فرح کی کال آئی تو میں نے اس سے اس کے بھائی کے بارے میں بات کی لیکن شاید میں بات کرتے وقت یہ بھول گئی تھی کہ فرح اس کی بہن ہے۔

''نور میرا بھائی بہت اچھا ہے۔ اسے غلط نہ سمجھو بلکہ اس کے بارے میں سوچو۔ اس کا پہلے بھی ایک بار دل ٹوٹ چکا ہے۔ تم اس کا دل نہ توڑو۔''

''فرح یہ مجھے کیا کہہ رہی ہو تم۔ میں تمہیں تمہارے بھائی کی یہ حرکت بتا رہی ہوں۔ تم الٹا مجھے سمجھا رہی ہو۔'' مجھے اس کی باتیں سن کر غصہ آ گیا۔

''نور تم بات کو اتنا بڑھا کیوں رہی ہو۔ آخر کبھی کہیں تمہیں شادی تو کرنی ہے۔ پھر وہ میرے ہی بھائی سے کیوں نہیں، کیا کمی ہے میرے بھائی میں۔''

''کوئی کمی ہو یا نہ ہو لیکن مجھے ایسا شخص بالکل پسند نہیں جو کسی کو بنا دیکھے، بنا جانے اس سے اظہار محبت کرے۔ فرح یہ محبت نہیں ہوتی، یہ ایک جال ہوتا ہے جو تمہارے بھائی جیسے لڑکے معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کے لیے بچھاتے ہیں۔'' میں نے اور بھی جانے کیا کیا فرح کو اس کے بھائی کے بارے میں کہا پھر اس دن سے دو دن تک فرح کی نہ کوئی کال آئی اور نہ میسج۔ مگر اس کا بھائی مسلسل میسج کرتا رہا جس کا میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈھیٹ کہہ کے اس کا ہر میسج ڈلیٹ کر دیتی۔

دو دن بعد فرح نے خود کال کی اور سوری کہا اور ہماری دوستی پھر ویسی ہی ہو گئی جیسی اس ناخوشگوار واقعے کے پیش آنے سے پہلے تھی۔

☆......☆

کب سے سیل فون کی بیل سر درد کر رہی تھی۔ اسکرین پر نمبر انجان تھا جس کی وجہ سے میں نے کال ریسیو نہیں کی مگر دوسری طرف بھی کوئی ڈھیٹ ہی تھا۔ سیل فون کی بجتی بیل مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی اور میں دل ہی دل میں فرح کے بھائی کو گالیاں دے رہی تھی جس نے میرا نمبر پھیلا دیا تھا۔ اس دن جب میں نے فرح کے بھائی کو میسج کر کے اس کی اوقات یاد دلائی تو اگلے دن اس نے میرا نمبر جانے کس کس کو دے دیا تھا اور اب روز نہ جانے کتنے نمبر آ جاتے تھے۔ جب میں نے فرح سے اس بارے میں بات کی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ میرا بھائی ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ اس جواب پر اب مجھے فرح اور اس کے بھائی سے سخت

نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب فرح کے بھائی کا کام ہے اور فرح مان نہیں رہی تھی۔

کال اب تک آ رہی تھی اس بار میں نے ریسیو کر لی۔

''ہیلو جی کون؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''آپ کا دیوانہ۔'' دوسری طرف مردانہ آواز تھی۔ لہجہ محبت بھرا تھا۔

''اپنی بہن کے دیوانے بن جاؤ۔ بے غیرت انسان۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔

پھر اس نمبر سے کئی کالز آئیں مگر میں نے پھر ریسیو نہیں کی۔ پھر ایک میسج آیا جس میں لکھا تھا۔

''نور! آپ نے میری کال کاٹ کے میرا دل ہی توڑ دیا۔ مجھ سے پوچھ تو لیتیں میں کون ہوں۔ نور میں واقعی آپ کا دیوانہ ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتیں پر میں آپ کو جانتا ہوں۔ پورے دو ماہ بعد آپ کا نمبر تلاش کرنے میں گزارے ہیں اور آج جب آپ کا نمبر ملا ہے تو آپ مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔ نور اگر آپ نے مجھ سے بات نہ کی تو میں مر جاؤں گا۔'' اور بھی پتا نہیں کیا کیا لکھا تھا اس میسج میں لیکن جو بھی لکھا تھا ہر لفظ میں محبت نظر آ رہی تھی مگر میں جانتی تھی کہ یہ ہر لفظ جھوٹا ہے اس لیے میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں روز روز کے نئے نمبروں سے تنگ آ چکی تھی۔ اس لیے میں نے سوچ لیا کہ اب سم ہی بدل ڈالوں پھر میں نے دوسرے ہی روز نئی سم منگوائی۔ اس سے پہلے میں سم بند کرتی اور نئی سم موبائل میں لگاتی ایک میسج ملا۔ میں نے نمبر دیکھا تو یہ اس کا تھا جس نے اپنا نام علی بتایا تھا میں نے میسج پڑھنا شروع کیا تو وہی پرانے الفاظ ملے جو کچھ دن سے پڑھ رہی تھی۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں میری بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ جو میں بات بتانا چاہتا ہوں اس میں آپ کا بھلا ہے۔ آپ مجھ سے ایک بار بات کر لیں پھر پتا چلے گا آپ کو کہ میں ٹھیک ہوں۔''

''جی بتائیے کیا بتانا چاہتے ہیں آپ۔'' میں نے لکھ کر میسج Send کر دیا۔

''اس طرح میسج پر نہیں کال پر بات کریں میں کال کرتا ہوں۔'' ایک اور میسج ملا پھر اس کے فوراً بعد کال آ گئی۔

''السلام علیکم۔'' میں نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام دوسری طرف وہی مردانہ آواز جو میں پہلے بھی ایک بار سن چکی تھی۔

''جی بتائیے کیا بتانا چاہتے ہیں آپ۔'' میں نے سلام کے بعد فوراً پوچھا۔

''فرح کو جانتی ہیں آپ۔'' ایک پل کی خاموشی کے بعد مجھ سے سوال کیا گیا۔

''جی جانتی ہوں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ وہ کس طرح کی لڑکی ہے۔'' ایک اور سوال ہوا۔

''آپ جو کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ میرا جواب سن کر ایک اور سوال کرے میں نے جواب کے بدلے یہ کہہ دیا۔

''آپ شاید یہ نہیں جانتیں کہ مجھے آپ کا نمبر کس نے اور کیوں دیا ہے۔ میں یہ سب کچھ آپ کو بتاتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس دن جب میں نے آپ کو فرینڈ شپ کا کہا اور اس سے پہلے آپ کو میسج کیے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں آپ کو تنگ کر رہا تھا یا آپ کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سب میں بس اس لیے کر رہا تھا کہ دیکھوں آپ کس طرح کی لڑکی ہو۔ جب آپ نے میرے کسی میسج کا جواب نہیں دیا اور کال پر مجھے برا بھلا کہا تو مجھے پتا چلا کہ آپ غلط لڑکی نہیں ہو لیکن دیکھو آپ کے جن سے رابطے ہیں وہ غلط ہیں۔ بس یہی بتانے کے لیے یہ کال کی ہے۔ اس کے بعد آپ کو میسج اور کال کرتا رہا لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔'' یہ سب کہہ کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''یہ غلط آپ فرح کے بارے میں کہہ رہے ہیں نا۔'' میں نے خاموشی کو توڑا۔

''جی بالکل میں فرح کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھو فرح کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ وہ غلط ہے، صرف وہ ہی نہیں اس کی پوری فیملی ٹھیک نہیں

ہے۔ فرح نے مجھے آپ کا نمبر دیا اور صرف مجھے ہی نہیں نہ جانے کتنے لڑکوں کو آپ کا نمبر دیا ہے۔ فرح کے بھائی نے پہلے خود ٹرائی کیا جب آپ اس کی باتوں میں نہیں آئیں تو اس نے آپ کا نمبر اپنے ایک ایسے کزن کو دیا جو بہت ہی خراب لڑکا ہے۔ موبائل پر لڑکیوں سے دوستی کرتا ہے پھر اس دوستی کو جھوٹی محبت میں بدل دیتا ہے۔ پھر ملاقات کے وقت ان کی تصویریں بناتا ہے اور کال کے دوران ان لڑکیوں کی آواز ریکارڈ کر لیتا ہے پھر ان لڑکیوں کو بلیک میل کرنا اس کا کام ہے اور اگر لڑکی ہاتھ نہ آئے تو وہ تصویریں اور آواز اس کی فیملی کو دکھا کر ان کے بدلے منہ مانگی قیمت وصول کرتا ہے۔ اس طرح اس نے کئی لڑکیوں کی زندگی برباد کی ہے۔ اس طرح جانے کس کس کی بددعا نے اسے کینسر جیسی جان لیوا بیماری میں مبتلا کر دیا ہے لیکن اس کی سمجھ میں بالکل تب بھی کچھ نہیں آیا جب ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ سال بھر کا مہمان ہے۔ دیکھو وہ اب آپ کو بھی کال کرے گا۔ میں آپ کو اس کا نمبر بتا دوں تا کہ آپ نمبر جان کے اس کی کال اور کسی میسیج کا جواب نہ دو۔'' پھر اس نے مجھے نمبر بتایا اور وہ نمبر وہ تھا جو فرح کے بھائی کے میسیج کرنے کے اگلے دن آیا تھا اور اس نمبر سے بات کرنے والے نے خود کو میرا دیوانہ بتایا تھا۔

''تھینکس! آپ نے مجھے یہ سب بتایا۔ ایک انجان ہو کر بھی مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا۔'' یہ ان کا احسان تھا مجھ پر اور میں نے وہ احسان مانتے ہوئے کہا۔

''تھینکس کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میں نے کوئی احسان کیا ہے آپ پر، میں نے بس یہ سب انسانیت کے ناتے بتایا ہے، اپنی حفاظت کرنا اب آپ کا کام ہے۔''

''میں نے نئی سم لے لی ہے۔ اب کچھ دیر میں یہ سم آف کرنے والی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ویری گڈ بہت اچھا کیا آپ نے نئی سم لے کر۔''

''ایک بات تو بتائیں۔ آپ فرح کے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے جانتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اس بات کو رہنے دیں کچھ اور پوچھیں۔'' اس نے بڑے بجھے لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا یہ بتائیں فرح غلط راستوں پر چل رہی ہے اسے کوئی روکتا نہیں ہے۔''

''اولاد کو غلط راستوں سے ماں باپ روکتے ہیں اور اگر ماں باپ ہی ملے ہوئے ہوں تو بھلا اور کون روک سکتا ہے۔''

''ہوں۔''

''آپ نیٹ یوز کرتی ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل میں فرح کی تصویریں نیٹ پر آ چکی ہیں، میں نے سوچا اگر آپ نیٹ استعمال کرتی ہیں تو آپ بھی فرح کی تصویریں دیکھ لو۔'' اس نے ایک دھماکا کیا۔

''کیا واقعی فرح کی تصویریں نیٹ پر آ چکی ہیں۔''

''جی بالکل اس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر کچھ دیر اور کال چلتی رہی، پھر میں نے آخری بار اسے تھینکس کہا اور پھر کال ختم ہوتے ہی پہلی سم آف کر کے نئی سم موبائل میں لگا دی۔ پہلی سم آف ہوتے ہی میری ساری پریشانی ختم ہو گئی۔ دشمنوں جیسی دوست فرح سے جان چھوٹ چکی تھی، بس جان نہیں چھوٹی تو بس اس خیال سے کہ اگر میں فرح کی باتوں میں آ جاتی تو کیا ہوتا۔ فرح نے مجھے اپنی راہ پر چلانے کی پوری کوشش کی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ میں اس کی باتوں میں نہیں آئی لیکن اگر میرا یہی حال رہا کہ میں انجان لڑکیوں سے دوستی کرتی رہی تو پتا نہیں زندگی کی راہ میں کتنی فرح ملیں گی اور یہ ضروری تو نہیں کہ میں ہر فرح سے بچ پاؤں۔ اس خیال نے میرا اتنا ساتھ دیا کہ ہر اس لڑکی سے دور کر دیا جو بھی انجان بن کر ملی۔

☆☆☆

پانچویں سچ بیانی

کفارہ

سید ملازم حسین شیرازی

ایک پاکستانی نژاد ایرانی کا قصہ خاص جسے اپنی ایک قسم کا کفارہ جان ہتھیلی پر رکھ کر چکانا پڑا

یہ ایک سچا واقعہ ہے جو عرصہ پہلے ایران اور پھر پاکستان کی سرحدوں پر پیش آیا۔ یہ ایک سبق آموز آپ بیتی ہے۔ دل سے وعدہ کیا تھا ایران کی سرزمین کے مقدس شہر میں قسم اٹھائی تھی پھر اس قسم کو توڑ دیا۔ عہد شکنی کی۔ اس کے کیا نتائج بھگتنے پڑے سپرد قلم کر رہا ہوں کہ شاید قارئین کرام اس سے سبق حاصل کریں۔

1982ء میں تہران سے یزد شاہراہ کی توسیع ہو رہی تھی۔ ایک ایرانی کمپنی کو ٹھیکہ ملا تھا جس کے ایک ڈائریکٹر سے میری اچھی دعا سلام تھی۔ ان کی معرفت کام کا کچھ حصہ مجھے SUB-LET ہوا تھا۔ کام شروع ہوا کبھی سائٹ پر خیموں میں رہتے تھے کبھی شہر میں راتیں گزارتے تھے۔ کام میں دل لگا ہوا تھا۔ نہایت محنت اور جانفشانی سے کام جاری رہا۔ ایک سال بعد میرا کام ختم ہوا۔ اس ٹھیکیدار کی معرفت مجھے نو ملین تومان کی ادائیگی ہوئی۔ (اس وقت پاکستانی روپے کی قدر ایک روپیہ 3 تومان تھی یعنی تیس لاکھ روپے پاکستانی۔ آج کل ایک روپیہ 35 تومان ہے) دل کو بہت اطمینان تھا۔ کراچی واپسی کی تیاری تھی۔ مہاراجہ ہوٹل تہران میں قیام تھا۔ ایران ایئر سے کراچی کے لیے بکنگ کرائی۔ (اس کے بعد عراق ایران کی جنگ کی وجہ سے وقتی طور پر فلائٹس بند ہو گئی تھیں) جمعرات کے لیے سیٹ کنفرم تھی۔

جب میں نے اپنا پروگرام گھر والوں کو بتایا تو انہوں نے فرمائش کی کہ ایران سے ٹائیگر کے کمبل، کراکری وغیرہ لیتے آئیں۔ بات مناسب تھی۔ میں نے جمعرات کی سیٹ کینسل کرائی اور تین دن بعد بروز اتوار سیٹ ملی۔ ان تین دنوں میں خوب سیر و تفریح کی۔ اتوار کے دن دو بجے واپس ہوٹل آیا۔ فلائٹ میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ کمرے میں آکر ٹی وی لگایا تو خبر آ رہی تھی کہ اب ایران سے ایرانی کرنسی ملک سے باہر نہیں لے جائی جا سکے گی۔ انقلاب کا زمانہ تھا ایران عراق جنگ زوروں پر تھی۔ حکومت کی طرف سے منظور شدہ و مقرر کردہ ملازمین اور رجسٹرڈ کمپنیاں اس سے یعنی کرنسی لے جانے سے مستثنیٰ تھیں۔ میرے پاس تیس لاکھ روپے ایرانی کرنسی کی شکل میں تھا جسے میں ایران میں تو



خرچ کرسکتا تھا لیکن اپنے ملک نہ لاسکتا تھا۔ بہت پریشانی ہوئی وقتی طور پر دوبارہ سیٹ کینسل کرائی۔ اب آئندہ کے لائحہ عمل کے لیے سوچ بچار کی۔ بہت بھاگ دوڑ کی کہ کسی طرح یہ پیسہ جو میری حق حلال کی کمائی تھی اسے پاکستان لے آؤں۔ ایک بات واضح کردوں کہ میری کوئی رجسٹرڈ کمپنی نہ تھی۔ نہ ہی مجھے گورنمنٹ کی طرف سے کام Award ہوا تھا۔ یہ تو ذاتی طور پر کسی مہربان نے کام دلایا تھا۔ لہٰذا یہ پیسہ گورنمنٹ سے منظور شدہ نہ تھا جسے میں بینک یا دیگر قانونی ذریعے سے اپنے ملک لاتا۔ میں نے پیسہ لانے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے۔

تہران سے صوبہ سیستان و بلوچستان (ایرانی صوبہ) کے مشہور شہر ایران شہر آیا جہاں سے مند (پاکستانی بارڈر شہر) کے لیے گاڑیاں چلتی تھیں۔ ایک ایرانی بلوچ ڈرائیور کو دس لاکھ روپے دیا کہ وہ مند شہر پہنچائے۔ بقول اس کے راستے میں مراد بلوچ ڈاکو (اس زمانے میں اس ڈاکو کا گوادر، گبد، تمپ، مند میں بڑا نام تھا ان علاقوں میں ڈاکہ زنی کراتا تھا) نے لوٹ لیا۔ دس لاکھ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تہران میں ایک پارٹی سے بات ہوئی اسے دس لاکھ دیئے جس کی ادائیگی انہوں نے کراچی میں کرانی تھی۔ اس پارٹی نے ہزار ریال کے نوٹ کو درمیان میں دو ٹکڑے کیا ایک حصہ جس پر نوٹ کے نمبر درج تھے مجھے دیا۔ دوسرا نمبروں والا اپنے پاس رکھا جسے میں نے میٹرو پول ہوٹل کراچی میں کسی پارٹی (ان کے نمائندے) کو دکھانا تھا اور وہ مطلوبہ رقم مجھے ادا کرتے۔

پاکستان آیا۔ میٹرو پول ہوٹل مقررہ دن گیا لیکن وہاں نہ کوئی پارٹی آئی نہ ہی ان کا کوئی دفتر تھا۔ یہ لوگ بھی ہاتھ کر گئے۔ یوں بیس لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ دوبارہ ایران گیا ان دنوں فلائٹس بند تھیں۔ کراچی سے گوادر (چونکہ کوسٹل ہائی وے نہ بنا تھا، تین چار دن لگتے تھے) گوادر سے چاہ بہار، پھر وہاں سے ایران شہر، اور پھر شیراز جانا

ہوا۔ نہایت پریشانی کے دن تھے پیسوں کے علاوہ ایران پاکستان کے تکلیف دہ پھیرے بہت کھلتے تھے۔ شیراز میں چند واقف کار تھے جو لیہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں زرگری کا کام کرتے تھے۔ اچھے اور شریف لوگ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مجھے سونا خریدنا چاہیے اور وہ کسی طرح پاکستان لے جایا جائے، مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پانچ کلو سونا خریدا۔ آدھا آدھا کلو کی دس اینٹیں تھیں۔ مرکزی بینک کی مہریں ثبت تھیں اس وقت سونا 1800 روپے فی تولہ تھا۔ سو تولہ یعنی ایک کلو کی قیمت ایک لاکھ اسی ہزار روپے تھی۔ پانچ کلو سونا نو لاکھ کے عوض خریدا گیا تھا۔ سونے کو اچھی طرح سنبھال کے اٹیچی کیس میں رکھا اوپر نیچے کپڑے تھے۔ اب میری تیاری واپس اپنے ملک آنے کی تھی۔ بائی ایئر نہ آسکتا تھا۔ شیراز سے تہران، کرمان، کرمان شاہ، اصفہان بام، بزمان، آخر کار 48 گھنٹوں کے بعد ایران شہر بحفاظت پہنچ گیا۔ اگر ایران شہر سے پاکستان آنا چاہیں تو سرحدی شہر مند کہلاتا ہے۔ اگر چاہ بہار سے آنا چاہیں تو گوادر آئے گا اور اگر زاہدان سے آنا ہو تو تفتان اور پھر کوئٹہ آئے گا۔ راستے میں کم از کم چالیس جگہ چیکنگ ہوئی چونکہ شکل صورت ایرانیوں سے ملتی جلتی تھی اور پوزیشن بھی اچھی تھی لہٰذا ایران شہر آ کر مند کے لیے پک اپ پکڑی جس میں ہم چار سواریاں تھیں۔ ایک میں تھا تین پردہ دار خواتین جو افغانی لباس میں ملبوس تھیں اور افغانی دکھائی دے رہی تھیں۔ پانچواں ڈرائیور تھا جس نے ہمیں معقول معاوضے پر مند پہنچانا تھا۔ ایران شہر سے مند آٹھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ صبح دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ شام چھ بجے ہمیں پہنچنا تھا۔ مند سے تقریباً پچاس کلو میٹر پہلے پاسداران نے سپاہ ایران جو ہمارے تعاقب میں تھے آن روکا سب سے پہلے انہوں نے تینوں خواتین کو نیچے اترنے کا کہا۔ دراصل وہ افغانی مستورات نہ تھیں بلکہ ایرانی تھیں جو افغانیوں کے لباس میں چوری چھپے پاکستان آرہی تھیں۔ پاسداران کو خفیہ اطلاع تھی کہ وہ بنی صدر (ایران کے پہلے صدر، امام خمینی کے دور میں) کے خاندان سے متعلق ہیں جو ایران گورنمنٹ کو مطلوب تھیں۔ اس وقت بنی صدر کو صدارت سے فارغ کیا گیا تھا۔ پاسداران کے ساتھ ٹرانسلیٹر (ترجمان) تھیں جنہوں نے ان خواتین سے پشتو میں باتیں کیں جو کہ ظاہر ہے انہیں پشتو نہ آتی تھی لہٰذا انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ میرے کاغذات دیکھے، سامان کی چیکنگ کی انہیں تسلی ہوئی۔ انہیں پتا ہی نہ چلا کہ اٹیچی کیس میں پانچ کلو سونا ہے۔ انہوں نے Clear کیا اور ڈرائیور سے کہا کہ انہیں اپنی منزل پر پہنچا دو۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اپنا کیس جو کافی وزنی تھا اسے اٹھا کر پک اپ کی چھت پر رکھنا چاہ رہا تھا کہ پاسداران کے ہنگ (کمانڈر) جو دراز قد تھا اخلاقاً مجھ سے کیس لے کر چھت پر رکھنے لگا کہ پک اپ کے کنڈے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا اور سونے کی اینٹوں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ سب چونک گئے۔ کہنے لگے بلیط می داری (چابی ہے) میں نے چابی ان کے حوالے کی بیگ کھولا تو اس سے سونا برآمد ہوا اور یوں مجھے دھر لیا گیا۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ انہیں اتھارٹی تھی کہ اگر کوئی شخص غیر قانونی سرگرمیوں یا سنگین جرم میں ملوث پایا جاتا یا ارتکاب جرم کرتا تو وہ اسے گولی مار سکتے تھے۔ مجھے اسمگلر گردانا گیا جو ان کے ملک سے سونا اسمگل کر کے اپنے ملک لے جا رہا تھا مجھے Firing Squd کے آگے کھڑا کر دیا گیا اور شوٹ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں پریشان تھا کہ افتاد پر افتاد پڑ رہی تھی لیکن ایک اطمینان ضرور تھا یہ درست ہے کہ میں غیر قانونی طریقے سے سونا لا رہا تھا ایک طرح سے اسمگلنگ تھی لیکن میں اسمگلر نہ تھا۔ یہ پیسہ میری حلال کی کمائی تھا۔ کسی ڈکیتی یا چوری کا نہ تھا۔ بہر حال جرم ضرور تھا جب انہوں نے مجھے نو قدموں کے فاصلے پر کھڑا کیا تو میں نے محسوس کیا کہ کمانڈر اور دیگر اہلکار مجھے ترحم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں چہرے مہرے سے ایک جنٹل مین نظر آرہا تھا۔ میں نے کمانڈر کو بلا کر کہا کہ آپ لوگوں کو اردو

انگریزی نہیں آتی تھی فارسی میں نہیں سمجھا سکتا۔ ساتھ کھڑے پشتو اسپیکنگ ٹرانسلیٹر کو پشتو میں بتایا کہ انہیں باور کرائیں کہ مجھے یہاں شوٹ کرنے کی بجائے گورنر سیستان کے سامنے پیش کریں۔ میں اپنی صفائی بیان کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان سے رابطہ کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ انہوں نے وائرلیس پر گورنر صاحب سے رابطہ کیا اور تفصیل بتائی۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ انہیں واپس ایران شہر لایا جائے جہاں عدالت کے روبرو کارروائی ہوگی۔ میرے چہرے سے ٹوپا اتارا گیا۔ مجھے اور ان خواتین کو اپنی گاڑیوں میں عدالت میں پیش کرنے لایا گیا۔ ہم صبح آٹھ بجے پہنچے تھے۔ عدالتیں، دفاتر وغیرہ کھل چکے تھے۔ مجھے گورنر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے انہیں تفصیلاً آگاہ کیا۔ اپنا پاسپورٹ، ویزا، راہداری، شہربانی کے ٹھیکے کی تفصیل، پیسوں کا حصول سب بتایا۔ میں نے مصلحتاً یہ غلط بیانی کی کہ میں یہ سونا پاکستان نہیں لے جا رہا تھا، اپنے عزیزوں کو دینے قریب کے گاؤں جو کہ ایران میں واقع تھا لے جا رہا تھا۔ گورنر صاحب کے دفتر والوں نے میری بتائی گئی تفصیلات کی تسلی کرائی (تہران سے یزد روڈ، شہربانی، کمپنی کی طرف سے ادائیگی وغیرہ) یہ تو ثابت ہو گیا کہ پیسہ غیر قانونی نہیں ہے۔ لہٰذا عدالت نے مجھے باعزت بری کر دیا اور سونا بحقِ سرکار ضبط کر لیا۔ مجھے بہت خوشی تھی کہ کہاں کالے کالے پہاڑوں کے دامن میں فائرنگ اسکواڈ آرڈر اور کہاں بریت کے آرڈر۔ عدالت سے نکل کر مہمان سرائے عارف (ہوٹل) آ گیا جہاں یہ خوشی تھی کہ میں آزاد تھا۔ وہاں یہ قلق بھی تھا ایک سال کی محنت اتنا سارا روپیہ اور خالی ہاتھ۔

رات بھر میں بے چین رہا۔ نیند کہاں آنی تھی۔ گھر والے پریشان تھے۔ انہیں نہیں بتا سکتا تھا کہ میرے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر ذہن میں ایک سوچ آ گئی چونکہ میں نے لاء کیا ہوا تھا تھوڑی بہت قانون کی سدھ بدھ تھی۔ ایک قانونی نکتہ ذہن میں آ گیا۔ صبح سویرے اٹھ کر بہترین کپڑے زیب تن کیے۔ تازہ دم ہو کر پھر ایک دفعہ گورنر صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ انہیں گزارش کی کہ جو سونا مجھ سے پکڑا گیا ہے وہ ناانصافی ہے۔ میں اس بارے میں کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔ گورنر صاحب نے اجازت دی اور یہ بھی استفسار فرمایا کہ اگر مجھے سرکاری وکیل چاہیے تو حکومت سرکاری وکیل دے سکتی ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا مجھے ضرورت نہیں ہے میں خود ہی اپنا بیان دینا چاہوں گا۔ اجازت ملنے پر میں نے گزارش کی۔ چور وہ ہوتا ہے جس سے مال برآمد ہو میرا جرم ثابت نہ ہوا لیکن میری پراپرٹی بحق سرکار ضبط کی گئی اور مجھے باعزت بری کیا گیا۔ اصولاً مجھے بھی پابند سلاسل کیا جانا چاہیے تھا۔ اگر بری کر دیا گیا ہوں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ میرا سونا مجھے واپس کر دیا جائے یہ قرین انصاف ہے۔ گورنر صاحب کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے آخر کار انہوں نے میری گزارش سے اتفاق کیا۔ پچیس فیصد کاٹ کر (جرمانہ کے) باقی کے چھ لاکھ پچھتر ہزار کے چیک کے اجراء کے آرڈر کیے۔ پھر چیک، ایرانی کرنسی میں نے وہیں امانتاً کسی کے پاس رکھا اور خالی ہاتھ گھر روانہ ہوا۔ مقدر اور قسمت میں اگر یہی لکھا ہے تو کون ٹال سکتا ہے۔

دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ واپسی کا پروگرام بنایا۔ ایران شہر سے مند شہر پہنچا۔ مند سے تربت کے لیے بس پکڑی۔ بس میں تیس پینتیس سواریاں تھیں زیادہ تر ایران سے آ رہے تھے۔ بس روانگی سے قبل لیوی حضرات نے سب سے پانچ پانچ سو روپے طلب کیے چونکہ لوگوں کے پاس کافی سامان تھا۔ انہوں نے بخوشی دینا شروع کیے مجھ سے مطالبہ کیا میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس تو صرف ایک مختصر بیگ ہے کوئی دیگر سامان نہیں ہے کاغذات وغیرہ بھی مکمل ہیں میں کیوں پیسے ادا کروں؟ ان سے تو تکرار ہونے لگی۔ انہی دنوں 9 اپریل 1983ء کو صدر ضیاء الحق مکران کا دورہ کر رہے تھے۔ وہ پانچ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اپریل ۸۱ کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ''الذوالفقار تنظیم'' کی بڑی دہشت تھی لہٰذا سارے مکران ڈویژن میں سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے شک کی نگاہ سے دیکھا اور میرے بیگ کی چیکنگ کی، تلاشی لی تو اس میں سے دنیا کے نقشے کی کاپی جس میں مختلف ممالک پر قلم سے لگائی گئی نشانیاں ثبت تھیں اور دوسرا بھٹو صاحب کی کتاب ''اگر مجھے ہلاک کر دیا گیا'' برآمد ہوئی۔ ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ میں الذوالفقار تنظیم'' سے متعلق ہوں۔ لیوی تحصیلدار نے لوگوں سے لیے گئے پانچ پانچ سو روپے واپس کر دیئے اور وہیں لاک اپ میں بند کر دیے۔ تحصیلدار نے تحصیل تمپ کے اے سی سے بات کی، میرے بارے میں بتایا۔ اے سی صاحب نے ڈپٹی کمشنر تربت سے رابطہ کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہیں ہدایت دی گئیں۔ تحصیلدار نے اپنی دو موبائل گاڑیوں کے ساتھ مجھے لے کر اے سی تمپ کے حوالے کیا۔ اے سی صاحب اپنے دس آدمیوں پر مشتمل اسکواڈ کے ساتھ تربت لے آئے۔ وہ سب لوگ خاص ایکشن میں نظر آ رہے تھے کہ بقول ان کے ایک خطرناک دہشت گرد کو پکڑا ہوا ہے۔ وہ سب اپنی Good Book میں نام لکھوانے کے لیے مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کن چکروں میں پھنس گیا ہوں۔ مند میں ڈوبے دس لاکھ، میٹروپول ہوٹل میں کیا گیا دھوکا، ایران کی خوفناک پہاڑیوں کے پہلو میں فائرنگ اسکواڈ کا سامنا اور اب دہشت گردی میں ملوث ہونے کا الزام۔ کون سے گناہ کی سزا ہے۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ تو گھنٹوں کی پُر پیچ راستوں پر کی گئی مسافت کے بعد ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ بنگلے کے بڑے لان میں دائرے میں پندرہ بیس کرسیاں تھیں جن پر میجر جنرل سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کمشنر تربت، ڈپٹی کمشنر تربت، ڈپٹی کمشنر گوادر، ڈائریکٹر ایف آئی اے کوئٹہ اور دیگر افسران تشریف فرما تھے اور گرفتار کیے گئے خطرناک دہشت گرد کو شکنجے میں پھنسانے کے درپے تھے۔

مجھے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں اس وقت سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ صحت اور تندرستی عیاں تھی اور بظاہر کمانڈر نظر آ رہا تھا۔ سوال جواب شروع ہوئے۔

میجر جنرل۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں۔ ''سر میرا نام حسین شرازی ہے۔''

میجر جنرل۔ ''مکران آنے کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں الحمدللہ پاکستانی ہوں اس وقت ایران سے......''

میجر جنرل نے بات کاٹتے ہوئے اور اپنی Stick میز پر ماری۔

''اسٹوری مت سناؤ۔ صحیح صحیح بتاؤ کس پارٹی سے تعلق ہے۔ اور یہاں آنے کا مشن کیا ہے؟''

میں۔ ''سر میرا تعلق کسی پارٹی سے نہیں۔ میرا کوئی مشن نہیں ہے۔ میں تو مصیبت کا مارا اس وقت دربدر ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ مصیبتوں پر مصیبتیں۔''

ڈائریکٹر ایف آئی اے میجر جنرل سے۔ ''سر اسے میرے حوالے کریں میں کوئٹہ لے جا کر خود تفتیش کروں گا۔ اس کا انگ انگ سچ بولے گا۔''

یہ سن کر میں واقعی پریشان ہو گیا اگر مجھے انٹیلی جنس کے حوالے کیا گیا تو نہ جانے کیا کیا کارروائی کریں گے۔

میں نے اپنے Confidance کو بحال کیا۔ یہ بات کرنے کا وقت تھا میری خاموشی یا ڈر خوف مجھے ان کے زیرِ بار کر دے گا۔ میں ان سب سے مخاطب ہوا۔

''سر! مجھے بہت افسوس ہے میری بات آپ سن نہیں رہے۔ مجھے موقع نہیں دے رہے کہ میں اپنے معروضات پیش کروں۔ مجھے بغیر کسی قصور، گناہ کے مجرم بنا رہے ہیں۔ میرے کاغذات چیک کریں، کراچی سے رابطہ کریں، ایران کے شب و روز سے آگاہ کریں میرے صوبہ سرحد کے آبائی شہر سے

معلومات کریں۔"

"صرف ایک کتاب کے پکڑنے کی سزا دے رہے ہیں۔ کیا میں پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ آپ سب نے یہ کتاب نہیں پڑھی؟ کیا کسی کتاب کو پڑھنا جرم ہے؟ نقشے پر لگائے گئے نشانات میرے اپنے ہیں۔ ایران میں رہتے ہوئے میں زاہدان سے مغربی جرمنی بائی روڈ گیا تھا۔ راستے میں جن جن ممالک سے گزرا یادداشت کے طور پر نشانات لگائے۔ کیا یہ دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے؟ اگر میں پولیس والوں کو 500 روپے دے دیتا تو سب اچھا ہوتا اور یہ مصیبتیں نہ آتیں۔"

میں نہایت دلیری اور اعتماد سے بول رہا تھا۔ جب میں نے اپنے آبائی شہر کا نام لیا تو ڈپٹی کمشنر تربت چونک گئے۔ وہ دراصل میرے آبائی شہر سے متعلق تھے اور میرے خاندان سے ان کو آگاہی تھی۔ انہوں نے کمشنر صاحب سے کہا۔

"سر اسے میرے پاس بنگلے پر چھوڑ دیں میں خود ساری معلومات حاصل کرتا ہوں۔"

یوں مجھے ڈی سی صاحب کے بنگلے میں بٹھایا گیا۔ ان کی میٹنگ برخواست ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تشریف لائے اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ میں نے اپنے خاندان کے بارے میں ان کے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتایا یہ بھی بتایا کہ ایران میں میرے ساتھ کیا گزری ہے۔

ڈی سی صاحب نے کہا۔ "میں یقین کر لیتا ہوں اور تم پر اعتماد کرتا ہوں۔ میرا اعتماد تو مجروح نہ ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "سر اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر زندگی نے موقع دیا تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی اور آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگی۔"

رات کو ان ہی کے ہاں کھانا کھایا۔ پھر دوسری صبح انہوں نے اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑ آئے تاکہ میں تربت سے کراچی فلائٹ پکڑ سکوں۔

اور یوں میں صبح نو بجے مصیبتیں، دکھ، درد، ٹھوکریں اپنے دامن میں سمیٹے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

اور پھر ایک دن میں اپنے شہر میں ڈی سی صاحب جواب ریٹائر ہوگئے تھے۔ ملاقات کر رہا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ ہماری ملاقات اس کا ثبوت ہے کہ میں نے تربت میں آپ سے غلط بیانی نہ کی تھی اور آپ کے اعتماد کو دھوکا نہ دیا تھا۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں نے ایک قسم اٹھائی تھی اور پھر اس پر قائم نہ رہا تھا۔ میں ایران میں تھا اس وقت ایران عراق کی جنگ زوروں پر تھی۔ ہر جوان کو دیکھ ابادان بارڈر پر بھیج دیتے۔ ہوٹل میں پڑے پڑے کھانے اور سگریٹ کے علاوہ کوئی اور کام نہ تھا۔ دن بہ دن صحت گر رہی تھی اور کمزور ہو رہا تھا۔ وعدہ کیا تھا اور اللہ پاک کی قسم اٹھائی تھی کہ آئندہ سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور سگریٹ نہ پیوں گا لیکن افسوس اپنے وعدے پر قائم نہیں رہا اور اٹھائی گئی قسم توڑ دی تھی۔ سگریٹ دوبارہ شروع کی اور یہ اسی کی سزا تھی جو ہفتوں مجھے موت کے منہ میں دھکیلتی رہی۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے وعدے کا پاس کریں اور بے تحاشا قسمیں اٹھانے سے دور رہیں۔

پھر خلوص نیت سے اللہ پاک سے معافی مانگی۔ توبہ کی۔ کفارہ ادا کیا تین دن متواتر روزے رکھے اور مستحقین کو کھانا کھلایا۔

رب العزت کا ایسا کرم ہوا کہ 1980ء میں اسٹاک ایکسچینج میں بینک شیئرز کی ڈیلوری لی تھی اس وقت ان کی فی شیئر قیمت بارہ روپے تھی جو 1984ء میں بڑھتی ہوئی نوے روپے ہوگئی تھی اور یوں جو میرا ایران میں پیشہ ضائع ہوا تھا اس کے بدلے اللہ کریم نے بہت منافع سے نوازا جس سے اس نقصان کی نہ صرف تلافی ہوئی بلکہ کہیں زیادہ منافع ہوا۔

☆☆☆

چھٹی سچ بیانی

اِک بے وفا کی یاد میں



ایم یعقوب احمدانی

ایک ناکام عاشق کی حسرتوں کا نوحہ اپنوں کی ستم رسانیاں

جب میں پیدا ہوا تو کچھ عرصے کے بعد بیمار پڑ گیا تو میرے غریب ماں باپ کو اپنے سہانے خواب مسمار ہوتے نظر آنے لگے۔ ابو نے میرے علاج کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بیماری پہلے ہی گھر کو مسکن بنا چکی تھی۔ میری بیماری کے بعد فاقہ کشی بھی چارپائی لے کر گھر میں سونے لگی۔ ابو اِی کا ہر دن بسوں یا اسپتالوں میں کے چکر کاٹتے گزرتا۔ میرا پورا خاندان سیدھا سادہ تھا۔ پہلے دادا اور ابو بھی امیروں کی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ میرا گھر ڈیرہ غازی خان کے نواحی گاؤں خانپور رنگ والا میں ہے۔ گھر کے چاروں طرف امیر زادوں کی زمینیں تھیں۔ بس ہماری وہی زمین تھی جس پر سات آٹھ گھر تھے۔ دادا ابو، ابو اور انکل سب دوسروں کی زمین پر دن رات ایڑیاں رگڑتے جس کے بدلے میں زہر لینے کے بھی پیسے وصول نہ ہوتے۔ مگر پھر بھی سب آس و امید خداوند کریم پر لگائے ہر صبح رب کے آگے سربسجود ہو کر گڑگڑاتے رب نے اپنی کرم نوازی کی اور میری حالت ٹھیک ہونے لگی۔ پھر پیٹ کا دوزخ تو ہر حال میں بھرنا تھا۔ امی ابو کچھ دنوں بعد مجھے بھی اپنے ساتھ کھیتوں میں کڑی دھوپ میں لے جاتے۔ جب میں سو جاتا تو وہ کام کرتے جب رونے لگتا تو امی میرے پاس آ کے اپنی ممتا نچھاور کرتی تو سکون بھری نیند مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ میری بیماری اور غربت نے ابو کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ میری ماں پہلے ہی سے بہت بیمار تھی۔ بیماری نے صحت مند عورت کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا ڈالا۔ دونوں گردوں میں پتھریاں ہو گئی تھیں جس کا بہت علاج کرایا مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا سوائے دھکے کھانے کے۔ ایک سال بعد ہمارے گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا۔ اللہ نے ایک بھائی ایم ایوب کو پیدا کر دیا۔ ابو کو بڑھاپے کا بوجھ کاندھوں سے ہلکا محسوس ہونے لگا مگر وقتی طور پر پریشانی ہونے لگی کہ امیروں کی چاکری کرتے کرتے گھر کا چولہا بھی گرم نہیں ہوتا۔ دو بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا اور ان کا مستقبل کیا ہو گا۔ یہی سوچ کر ابو نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

مہنگائی کا دور دورہ تھا۔ ابو گھر چھوڑ کر شہر جا کر دن رات محنت مزدوری سے ایک ایک روپیہ جوڑ کر گھر کے حالات اور دو بچوں کی اچھی پرورش کرتے مگر بڑھتی مہنگائی اور بیماری سارے ماہ کی جمع پونجی جیب خالی کر دیتی۔ غریبی نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ اس

گھر کے علاوہ کہیں اور تو جاتا ہی نہیں تھا۔

وقت کی بے رحمی مزید ظلم ڈھاتی رہی۔ ابو کی شادی کے بعد دادی امی نے گھر میں جھگڑے پیدا کردیے۔ حامد علی میرے دادا ابو کا نام ہے۔ حامد علی نے وٹے سٹے کی بنیاد پر میرے ابو کی شادی طے کردی۔ دادی امی کے بغیر صلاح ومشورے سے دادی نہیں چاہتی کہ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنائے جب ابو کی



شادی کردی تو میری دادی نانی امی کا منہ دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی۔ امی کے وٹے میں دادا ابو نے میری پھوپو میرے بڑے ماموں شبیر کو سونپ دی۔ میری دادی چاہتی کہ ساری زندگی اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھے۔ میری امی دادی کو آنکھ بھر نہ بھاتی۔ میری دادی اور نانی امی آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ دادی امی ہر روز امی سے جھگڑا کرتی، مار پٹائی عام بات تھی۔ میں بھی کچھ کچھ سمجھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی ہر بات سمجھ آتی۔ تو ابو نے دادی امی کے رویے کی وجہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ بڑی دردناک علیحدگی تھی۔ ابو کو علیحدہ ہوتے وقت ایک پانی کا گلاس تک نہ دیا۔ ابو اداس ہو کر ایک سائیڈ والا کمرہ لیا اس میں دو چار پائیاں ڈالیں اور ماں کی سنگدلی پر افسوس کرنے لگے۔ ابو اگر میری ماں کو چھوڑ دیتے تو بدلے میں دادی کی پیاری بیٹی ماموں کے گھر نہ جاتی۔ میری پھوپھو واپس آجاتی۔ ابو نے دادی کی سب امیدیں ختم کردیں دادی کی من کی مراد پوری نہ ہوسکی۔ جب ممانی واپس میکے آتی تو دادی مارپیٹ کرتی اور ایسے ایسے الفاظ کہتی کہ سننے والے کے کان بند ہو جاتے کہ اپنی سگی بیٹی کو ایسی عزت و پیار ایثار اور ماں کی ممتا نچھاور کرتی ہے۔ ممانی اسماء مرحومہ ایک چاند سی بیٹی پیدا کرچکی تھیں۔ اللہ نے مجھے بھی خوب صورت، میری آنکھوں کا تارا دل کی دھڑکن جیسی بہن دی۔ ہم بہت خوش ہوئے ہم دو بھائیوں کو کھیلنے کے

لیے تڑپا بھیج دی۔ پھر دادی نے اپنی مکاری کی دیوار کھڑی کر دی۔ جب میرے ابو گھر سے باہر جاتے تو شام کو سوسو الزامات صادر ہو جاتے۔ ادھر جب ممانی مہینوں بعد میکے یعنی میری دادی کے پاس آتی تو اس پر بھی الزامات کی بارش شروع کر دی جاتی۔ دادی اماں سب حدیں پار کر جاتی تھیں۔ ممانی اسماء نے دل برداشتہ ہو کر سسرال میں زہر پی لیا۔ گھر میں جنگ سی چھڑ گئی۔ دادی نے کہرام مچا دیا۔ میری دادی اور انکلوں نے مل کر میرے ابو کو مارا کہ غلام شبیر نے تیری بہن کو زہر دے دیا تم بھی اپنی بیوی کو زہر دے دو۔ یہ سب دادی کی چال تھی کہ بدلہ اتر جائے گا۔ میرے ابو سوچ سمجھ رکھنے والے سمجھدار آدمی تھے۔ ابو نے کہا جو مرنے والی تھی وہ مرگئی میں کیوں اپنا گھر تباہ کروں۔ میرے تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کیوں ان کا مستقبل خراب کروں، کون پالے گا کون سہارا دے گا۔ آج کے دور میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔''

جھگڑا بہت طول پکڑ گیا۔ ابو تین ماہ کے لیے امی اور ہمیں نانی امی کے گھر چھوڑ آئے۔ عورت جب بربادی پر آئے تو گھر بار خون کے رشتے سگے بیٹے جدا کر دیتی ہے۔ ابو نے سوچ سے کام لیا یا پھر میاں بیوی کی محبت کا اثر تھا۔ میری دادی، نانی امی کی جانی دشمن بن گئی تھیں۔ چار ماہ کے بعد ابو ہمیں گھر لے آئے۔ جب ابو کام کی غرض سے باہر محنت مزدوری کے لیے جاگیرداروں کی زمینوں پر کام کرتے تو دادی میری امی کو مارنے آتی، جب شام کو ابو گھر آتے تو امی کو روتے پاتے۔ ابو سارا دن تین بچوں کے لیے کڑی دھوپ میں خون پسینہ بہاتے۔ دادی کی باتیں سن کر ابو کا دل لہولہو ہو جاتا ماں ہو کر بہو اور بیٹے سے ایسا سلوک کرتی ہے۔ ابو چپ رہتے میری امی کو پھر بھی نصیحت کرتے کہ ماں، ماں ہے چاہے جو سلوک کرے تم خاموش رہا کرو۔ ایک دن تو اماں کو رحم آئے گا۔'' یہ صرف ابو کی امید تھی مگر حقیقت میں تو مزید اور نفرت پیدا ہوتی گئی۔ علیحدگی کے بعد تنگدستی تو مقدر بن گئی تھی۔

زندگی گزرتی رہی مگر اچھے وقت کے سہانے خواب صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں رہ گئے۔ ابو جب بھی شہر کراچی، فیصل آباد، لاہور، بلوچستان کام کرنے جاتے تو امی کو نانی امی کے گھر چھوڑ جاتے اور کئی ماہ تک ان کا کوئی اتا پتا نہ ہوتا۔ کون زندہ کون مرگیا ہے۔ انہیں کوئی خبر نہ ہوئی تھی۔ موبائل کا عام رواج نہ تھا۔ میں ہوش سنبھالنے لگا تھا۔ ملک ترقی کی راہ پر گامزن تھا مگر غریب مزید قہر و عذاب میں دبتا جا رہا تھا۔ ابو نے مجھے بھی دوسروں کے بچوں کی طرح سرکاری اسکول داخلہ کروایا تو ابو کے دل میں دفن ارمان، حسین سپنوں کی صورت آنکھوں میں نمودار ہونے لگے۔

جب ابو شام کو تھکے ہارے چڑھی ہانڈی کے پاس آ کر بیٹھتے تو امی کے کانوں میں ایک ہی آواز سنائی دیتی۔ ''ارے یعقوب کی ماں ہمارے بڑھاپے کا سہارا یعقوب بڑا ہو رہا ہے، جوان ہو کر ہمیں کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

ابو کی بات سن کر امی اٹھتیں اور مجھے سینے سے لگاتیں اور فخر سے کہتیں۔ ''انشاء اللہ ضرور۔'' اور ڈھیر ساری دعائیں دیتیں۔

وقت تیزی سے ریت کے ذروں کی طرح سے نکلتا جا رہا تھا۔ میں پرائمری سے پانچویں کلاس میں آ گیا اور بھائی ایم ایوب تیسری جماعت میں۔ ہمارے گھر کے حالات ویسے کے ویسے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ابو نے کہا ہو کہ یہ لو بیٹا پانچ روپے۔ دونوں بھائی اسکول میں چیز لے لینا۔ غریبی پر خون کے آنسو بہتے ہیں۔ ہر لڑکا اسکول میں اس وقت دل کے سو ٹکڑے کرتا جب ہمارے سامنے مہنگی مہنگی چیزیں لے کر کھاتا اسکول جاتے وقت امی سے مانگ مانگ کر تھک جاتے پانچ روپے دو ورنہ اسکول نہیں جائیں گے۔ امی ہمارے اصرار کرنے سے تنگ آ کر چاچی سے کہتی۔

''ارے بہن پانچ روپے اگر ہیں تو دینا یعقوب اور ایوب رو رہے ہیں اور نہ اسکول جاتے ہیں کیا کروں۔ کہاں جاؤں شاید غریب کی اولاد بھی غریب

ہی ہوتی ہے اور وقت بھی غریب کا ساتھ نہیں دیتا۔

میں اسکول سے واپس آ کر کڑی دھوپ میں مشقت کرتے ماں باپ کے ساتھ اپنی ننھی جان کو جلاتا۔ دوپہر ڈھلے شام ہونے کے قریب ہوتی تو کھیتوں سے لوٹتے سخت محنت کے بعد میں بھی گھر میں چینی پتی دال آٹا گھی نہ ہوتے تو جینے کی امید پل بھر میں ختم ہو جاتی۔ پہلے معمول کے مطابق ابو جی کھیتوں میں کام کرنے کے بعد شام کو واپس آتے وقت جاگیردار سے شام کی ہانڈی آٹے کے لیے روپے مانگتے تو وہ اس نے خالی لوٹا دیتے۔ ابو دادی امی سے کچھ بھی لے دے نہیں کرتے تھے بس صرف ایک چاچی ہی تھی جو کبھی کبھار کوئی چیز دے دیتی۔ امی نے چاچی سے سوال کیا مگر بدنصیبی کہ آج چاچی نے بھی آٹا نہ دیا۔ کچھ گھنٹے بعد چاچی کے گھر سے مسالے دار ہانڈی اور روٹی پکنے کی خوشبو آنے لگی تھی۔ رات سر پر تھی ابو کے پاس بھی کچھ نہ تھا جو دکان سے لے کر آتے۔ شام سے آدھی رات آچکی تھی۔ پیٹ میں پانی کے سوا کچھ بھی نہ گیا تھا۔ وہ رات آزمائش بن کر ابو امی بہن بھائی اور مجھ پر قیامت بن کر گزر رہی تھی۔ اتنے میں چھوٹی بہن نیند سے جاگی اور ''اماں اماں'' کر کے رونا شروع کر دیا۔ امی بھی اشک برسانے لگی تھیں اور ساتھ میرا ضبط بھی ٹوٹ گیا ہم کو روتے دیکھ کر بھائی بھی رو پڑا۔ میں بڑا تھا گھر کی فاقہ کشی بھانپ لی مگر چھوٹی ننھی سی جان کو کیا پتا کہ بھوک نے آج کس لیے قدم رکھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کزن آئی اور چنگیر میں دو روٹیاں اور کچھ سالن رکھا دیکھا تو پوری دن کی مری بھوک جاگ اٹھی اور اپنی قسمت پر مزید ساون کی برسات آنکھوں سے برسنے لگی ابو چپ کرانے لگے امی ابو چپ کراتے کئی بار اشک ریزہ ہوتے اور ساتھ ساتھ بہادری کے حسین سپنے دکھا رہے تھے۔

''بیٹا یہ دن سب پر آتے ہیں۔ ہمت والے کڑے وقت میں ہر امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں۔ تم کیسے جوان بہادر بیٹے ہو۔ ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہو۔ ہماری ساری امید و آس گھر کی ذمہ داری کل کو تمہارے کاندھوں پر آئے گی تب کیا کرے گا۔''

میرا صرف ایک ہی سوال ہوتا کہ ہم کب تک ایسے حال میں رہیں گے۔ کب تک گھر میں بھوک کا دھرنا ہوگا۔''

ابو ایک ہی جواب دیتے۔ ''جب تک اپنا کام محنت لگن سے کرو گے تو بڑے آدمی بنو گے۔''

امی ابو سالوں سال دو تین جوڑوں میں گزار دیتے مگر ہمیں ہر موسم کے گرم سرد کپڑے خرید کر دیتے۔

☆......☆

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میرے ماں باپ اس طرح جاگیرداروں کی زمینوں پر ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ میں ساتویں کلاس میں تھا اور چھوٹا بھائی پانچویں کلاس میں تھا۔ وقت نے ایک بار پھر کایا پلٹی۔ میرے ابو کے علاوہ ان کے پانچ اور بھائی تھے۔ ابراہیم، یونس، عیسیٰ، موسیٰ اور اسماعیل۔

اسماعیل سب سے چھوٹا تھا۔ یونس، عیسیٰ، موسیٰ، ابراہیم سب شادی شدہ ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ اسماعیل کنوارا تھا جو دادی دادا کے ساتھ رہتا تھا۔ اسماعیل آوارہ دوستوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ کئی بار غلط لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر ابو اور ان کے بھائیوں نے مل کر انکل اسماعیل کو خوب مارا۔ کئی دنوں بعد اسماعیل لاپتا ہو گیا۔ کئی ماہ گزر جانے کے بعد پتا چلا کہ اسماعیل دبئی چلا گیا ہے۔ اس کا ایک دوست تھا۔ بعض لوگ دوستوں کی زندگی سنوار بھی دیتے ہیں اور بگاڑنے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ ان کے دوست حاجی شفیع خان نے سمندر کے راستے لانچ پر ان کو دبئی بھیج دیا تھا۔ ایک دن ان کا فون آیا۔ فون کا دور عام ہونے لگا تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد پیسوں کی برسات شروع ہونے لگی۔ جہاں دادی انکل اور دادا سوکھی روٹی کو ترستے تھے آج وہاں سیب، انار، انگور، مالٹے کا جوس پینے لگے تھے۔ ایک قسم کی دکان لگی تھی۔ ہر ماہ ہزاروں کی برسات برستی تھی۔ دادی پیسے اڑانے لگی تھیں۔ کسی کو پانچ سو تو بھی ہزار دے دیتی۔ کچھ دنوں بعد اسماعیل کا دوست آیا جو سامان سے لدا ہوا

تھا۔ آنجہانی تمام ماں وہی مسومائل میں آخر بارانی تھی پرفیومز تھے جیسے انکل کی راتوں رات کھربوں روپے کی لاٹری نکلی ہو پھر کچھ ماہ بعد انکل عیسیٰ کو بھی دبئی بلا لیا کچھ دنوں بعد انکل اسماعیل چھٹی پر آ گئے۔ پہلے سے زیادہ اب ٹھیک ٹھاک تھے۔ اسماعیل کے واپس آنے کے بعد آوارہ دوستوں کی عید تھی ہر روز ہجوم ہوتا بیٹھک میں، میں قابل عزت انکل کو سمجھ کر اسماعیل کے دوستوں کی خاطر تواضع کرتا۔ بدلے میں اچھا ہونے کی تعریف ملتی۔ انکل اسماعیل پہلے سے زیادہ عیاش ہو گیا تھا۔ ہر وقت چائے بوتلوں اور مٹھائی کھانے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ میرے ابو ویسے ہی جاگیرداروں کی چاکری کرتے۔

میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا چکا تھا۔ بارہ سے تیرا سال کی عمر تھی میری۔ ابو اب زمین کھیتوں میں کم کام کرتے ہم دونوں جوان تھے اسکول کے بعد کھیتوں پر ہی آ جاتے۔ ماں باپ دونوں بیٹے کھیتوں میں سارا دن نظر آتے۔ چھوٹی بہن گھر میں الٹے سیدھے کام کرتی۔ صبح ماموں کے گھر اسکول میں پڑھنے جاتی۔ اسماعیل انکل کچھ ماہ رہا، اسے بڑا آدمی بنا دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی بڑا آدمی بننے کی خواہش جنم لیتی۔

ایک دن میں نے ابو کو کہا کہ میں بھی انکل کی طرح دبئی جاؤں گا اور بڑا آدمی بنوں گا۔

مگر یہ پتا نہ تھا کہ حقیقت کیسا کھیل میری زندگی کے ساتھ کھیلنے والی ہے۔

کچھ دنوں بعد میرے کان میں تھوڑا درد پیدا ہونے لگا۔ قریبی میڈیکل سے دوائی لی۔ مگر دوا نے کچھ بھی اثر نہ کیا۔ درد کی شدت سے ساری رات سو نہ سکا۔ فاقہ کشی سے بچا ایک ہزار ہوتا تو کسی بڑے کان والے ڈاکٹر سے دوائی لیتا وقت اور غریبی بڑا مشکل امتحان لے رہی تھی۔ مسلسل ایک ہفتہ گزر گیا۔ میڈیکل سے جو ادھار پر علاج ہو رہا تھا اس سے کوئی فرق نہ آ رہا تھا۔

ایک رات ابو بیٹھک میں آئے تو میں درد کی شدت سے اپنی بے بسی اور وقت کی بے رحمی پر آنسو بہا رہا تھا۔ ابو نے دیکھ لیا چپ کرا لیا مگر قسمت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ امیروں کو چیونٹی بھی کاٹ جائے تو ہزاروں لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ مجھ جیسے غریب کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ ابو صبح کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانے کا وعدہ کر گئے اور نیند کی گولی کھلا کر سلا دیا۔

صبح ہوئی نیند سے جاگا تو گھر میں اکیلا تھا۔ اڑھائی بجے بھائی لوٹ آیا۔ سکون سے حال پوچھا تو ایک سرد آہ نکل گئی ویسی ہی پہلے جیسی۔ ابو کا پوچھا تو بھائی نے کہا ابو تو کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ بہن بھی اسکول گئی ہوئی تھی۔ بھائی کھانا کھا کر کھیتوں میں چلا گیا۔ دوپہر سے شام ڈھلنے لگی۔ اتنے میں قدموں کی آواز آئی سب لوٹ آئے تھے۔ اچھے وقت اچھی قسمت کے علاوہ ابو کے چہرے سے واضح معلوم تھا کہ اسپتال نہ جا سکے کہیں سے پیسے ملتے تو جاتے۔ ہائے رے میری قسمت۔ وہ رات بھی درد ہی درد میں بیت گئی۔ کبھی کان سے خون آتا تو کبھی خالی درد ہوتا۔ وقت اپنی مسافت پر زخم دیتا ہوا گامزن رہا۔

انکل اسماعیل پانچ ماہ کی چھٹی گزار کر دبئی واپس چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد دوسرے انکل موسیٰ کو بھی دبئی بلا لیا۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میرے کزن جو لاہور میں کام کرتے تھے وہ لاہور جا رہے تھے۔ میرے دل میں بھی لاہور جانے کی ضد ہوئی۔ تو ابو کو بتا کر چلا گیا۔ دوسرے دن لاہور لاری اڈے پر اتر گئے۔ جہاں وہ کام کرتے وہاں ایک گھنٹے میں پہنچ گئے۔ رات سوئے صبح میں بھی ان کے ساتھ کام پر لگ گیا۔ کبھی کبھار گھر بھی کال کر لیتا۔ کام غلط کرنے کی وجہ سے کزن مجھے تھپڑ مارتے تھوڑی دیر رو دھو کر پھر کام پر لگ جاتا۔ اسی طرح تھپڑ کھاتے گالی گلوچ کھاتے ایک ماہ گزر گیا۔ ایک ماہ کی کمائی ساڑھے بارہ ہزار ملی تو اتنی رقم دیکھ کر میں پاگل ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پر ساڑھے بارہ ہزار روپے......! میں شاید کوئی حسین سپنا دیکھ رہا تھا۔ پھر کزن نے پیسے لے کر میرے گھر ایزی پیسہ کر دیے۔ تو گھر والوں کی عید سے پہلے نوٹوں کو دیکھ کر عید ہو

گئی۔ سبھی بہت خوش تھے۔

اسی طرح تین ماہ کے بعد لاہور سے واپس آ گیا۔ دس ہزار جیب میں تھے وہ وقت یاد آتا تھا جب ایک روپیہ بھی جیب میں نہ ہوتا تھا۔ دل میں ایک عہد کرلیا اب گھر سے باہر کام کرنا ہے جس سے تنگی فاقہ کشی کا خاتمہ ہوگا۔ کام کرنے سے پورے گھر میں خوشحالی آئی تھی۔ اس وقت میں مختلف ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ پیار محبت کا کوئی پتا نہ تھا بس کہانیاں پڑھ کر معلوم ہوتا کہ کوئی کسی کو ٹوٹ کر چاہتا ہے، کوئی کیسے پیار کے سمندر میں ڈوب کر خود ساحل پر ہنستا رہتا ہے۔

اسکول شروع ہو گئے اسکول سے واپس آ کر کھیتوں میں کام کرنے لگتا۔ ایک دن ماموں آئے اور مجھے کہا کہ اسکول نہ جانا۔ نئی زمین ٹھیکے کی ہے اس میں تھوڑا کام کرنا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے چلیں گے ساتھ۔

ماموں صبح آ گئے ہم ساتھ گئے اور ساتھ کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کا ٹولہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کھیتوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ کام کھیتوں میں زیادہ تھا عورتیں کم تھیں اس لیے ماموں نے کہا کہ ساتھ والے نئے پڑوسی اپنے مکان تعمیر کر رہے تھے۔ ماموں نے کہا ان کی عورتیں بلالاؤ۔ میں گیا اور میرا جانا زندگی بھر کا روگ بن گیا۔

کاش پوری دنیا میں، میں آوارہ گھومتا مگر اس نئے پڑوسی کے گھر نہ جاتا۔ جب میں نے دروازے پر دستک دی تو ایک مہ جبیں میرے سامنے آتی۔ ایک پل تو میں خوابوں کی حسین وادی میں کھو سا گیا۔ میں شاید کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

”جی کس سے ملنا ہے۔“ میرے منہ میں زبان نہیں رہی تھی۔ خیر ضبط دل کیا اور کہا محمد حسین سے ملنا ہے۔ جی وہ کھانا کھا رہے ہیں، اتنے میں محمد حسین بھی آ گئے۔

”جی بیٹے کیا بات ہے کون ہے۔“ شاید وہ محمد حسین کی بیٹی تھی۔ خیر میں نے کام کا کہا تو محمد حسین نے اپنی بیٹی اور بیوی اور بھائی کو کام پر میرے ساتھ بھیج دیا۔

اس مہ جبیں کا نام صائمہ تھا جو انسانوں میں سے نہیں لگتی تھی کوئی حور دکھتی تھی۔ خیر ایک دو بار دیکھ کر اپنا کام کرنے لگا جو میرے ذمے تھا وہ ہر بار مجھے تکتی رہتی۔ اس کی جھیل سی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھی۔ محمد حسین ابو کا بچپن کا دوست تھی یہ پتا لگنے کے بعد ہم زیادہ گھل مل گئے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ صائمہ کا سارا دن مجھے دیکھتے دیکھتے گزر رہا تھا۔ میں بھی کبھی کبھار ترچھی نظر سے اسے دیکھ لیتا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے آنکھ ماری۔ میں ہنس پڑا۔ دن ڈھل گیا تھا مگر کام بچ گیا تھا۔ سب کو صبح آنے کا کہا۔ سب عورتیں چلی گئیں۔ صائمہ بار بار مجھے واپس جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

☆......☆

خیر رات گزر گئی صبح ہوئی ماموں پھر آیا اور کہا۔ ”یعقوب تم بھی ساتھ چلو۔ اسکول نہ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ماموں۔“

ہم تھوڑی دیر بعد کھیتوں میں پہنچ گئے۔ آہستہ آہستہ کل والی سب عورتیں آنے لگیں۔ صائمہ بھی اپنی ماں کے ساتھ آئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی چہک رہی تھی۔ صائمہ نے آتے ہی اپنا ہاتھ آگے کرتے ہوئے سلام کیا۔ جواب میں، میں نے بھی ہاتھ ملا لیا۔ نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میں دوسری دنیا میں کھو گیا۔ اتنے میں ہاتھ چھوٹ گیا۔ صائمہ اپنا کام کرنے لگی۔ میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ یوں سارا دن ایک دوسرے کو دیکھتے ہی گزر گیا۔ پھر کچھ دیر بعد صائمہ میرے پاس آئی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

”یعقوب! میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں جب سے تم کو دیکھا ہے تمہاری دیوانی سی ہو گئی ہوں۔ پلیز انکار نہ کرنا ورنہ میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔ جیتے جی مر جاؤں گی۔“

پھر میں نے اسے ترچھی نظروں سے گھورتے

ہوئے کہا۔ ”یہ کون سی فلم کا ڈائیلاگ ہے۔“ اور میں ہنس پڑا تو اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”پلیز میری محبت کا بھرم رکھنا۔“

میں نے کہا۔ ”چلو سوچ کر بتاؤں گا۔“ پھر کام سے چھٹی ہونے لگی۔ اس کی سوالیہ نظریں مجھ سے جواب کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

میں کمزور کاندھوں پر اس کی محبت کا بوجھ لے کر گھر آ گیا۔

☆......☆

صائمہ بہت ہی سندر تھی۔ ہر لڑکا اس کا طلب گار ہوتا۔ تو میں کیسے انکار کرتا اس کی چاہت سے۔

کام ختم ہونے کے بعد میں ویسے ہی کھیتوں میں چکر لگانے گیا تو صائمہ دور کھڑی میری راہ تک رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی۔ پھر صائمہ نے جلدی سے پوچھا۔ ”میرے الفت بھرے جذبے کو کیا نام دیا ہے ہاں یا ناں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں جب تم کو پہلی نظر دیکھا تو میرے دل میں تم بسنے لگی ہو۔“

جواب سنتے ہی صائمہ میرے گلے لگ گئی اور میں پہلے پیار سے بھی واقف نہ تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ میں ہر روز کھیتوں کے بہانے صائمہ سے ملنے جاتا۔ ہر رات صائمہ میرے خوابوں میں آتی اور ساتھ جینے مرنے کی باتیں کرتی۔ کبھی کبھار تنہائی میں صائمہ کے بغیر خود کو اکیلا محسوس کرتا، پیار بھی کیا بلا ہے، کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔ دل میں عہد کر لیا کہ صائمہ صرف میری ہی دلہن بنے گی اور مجھے مجھ سے جدا کر کے خود میں بسا لے گی۔

آج تک محبت کی راہوں میں کسی کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ محبت انسان کو توڑ دیتی ہے، بربادی پاگل پن بے عزتی مقدر بن جاتی ہے اور نصیب میں بے وفائی کا راج ہوتا ہے۔ پھر جہاں جینے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ میرا ایک گہرا دوست تھا جسے میں بھائی کہتا تھا۔ شہباز احمد، جو صائمہ کا پڑوسی تھا۔ شہباز سے ہر روز ملنے آتا جاتا۔ دوست کے بہانے صائمہ کو بھی دیکھتا، کچھ محبت بھری باتیں کرتا، دل بہل جاتا اور دیدار یار کی حسرت بھری نگاہوں کو سکون مل جاتا۔

☆......☆

انکل موسیٰ کو دبئی گئے کچھ ماہ ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد انکل موسیٰ نے ابو کا ویزا بھیج دیا۔ ہمارے لیے وہ دن خوشی کا دن تھا کہ ہم بھی ان ہی جیسے بن جائیں گے۔ کچھ دن بعد ابو دبئی چلے گئے۔ میں ہر روز اسکول جاتا اور دوسرے وقت کھیتوں میں صائمہ کے محبت بھرے سمندر میں کھویا رہتا۔

ابو ہر ماہ دس ہزار کا ڈرافٹ بھیجتے۔ ہمارے اچھے دن گزر رہے تھے۔ یونہی ہنسی خوشی ایک سال گزر گیا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

ایک دن ابو گھر آ گئے۔ بہت سارا سامان ساتھ لے کر آئے۔ کمبل گھڑیاں بہت سارے کپڑے اتنا سامان جب ہماری آنکھوں کے سامنے آیا تو خوشی کے آنسو تھم نہ سکے۔

کچھ دنوں بعد صائمہ ابو سے ملنے آئی اس دن وہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ صائمہ اکثر اشارے کرتی جو میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ نہ جانے وہ کس بات کے اشارے کرتی تھی۔ اپنے دل کی بات بولتی میرے دل میں بوجھ سا بن جاتا۔ میں اس وقت بارہ سال کا تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ میرا دل ہر پل، ہر لمحہ، ہر وقت، صائمہ کو دیکھنے اور باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات میرے ذہن میں نہ تھی۔

جاتے وقت صائمہ نے مجھے کہا کہ ”اپنے ابو امی کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیجو۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے عالم پناہ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ بس کبھی اپنے سے دور نہ کرنا ورنہ مر جاؤں گا۔“

میں شام کو امی کی گود میں لیٹ گیا۔ امی نے کہا۔ ”بیٹا جو دل میں ہے اسے اپنی زبان سے کہہ دو۔“

”اماں میں صائمہ کو بہت پیار کرتا ہوں۔“

تو امی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہم بھرپور کوشش کریں گے کہ اور صبح ہی چلیں گے صائمہ کے گھر۔“

میں بہت خوش ہو گیا کہ میری زندگی کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

صبح ہوئی امی اور چھوٹی بہن بھائی اس کے ساتھ گئے۔ دن شام میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹ آئے۔ میری آنکھیں اس راہ پر لگی ہوئی تھی جہاں سے امی نے صائمہ کے گھر والوں کا جواب لے کر آنا تھا۔ خیر سب گھر آئے تو امی سے جلدی پوچھا تو امی نے کہا۔

''صائمہ کی امی کا ووٹ تیرے حق میں ہے مگر......''

''کیا مگر امی......!''

''مگر بیٹا اس کے ابو نے کچھ مہلت مانگی ہے ایک ماہ۔''

''اُف اماں چلو کوئی بات نہیں ایک ماہ جلدی گزر جائے گا۔'' میں نے امی کو تسلی دیتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''جو بھی ہوگا اچھا ہوگا۔''

''پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح ہمارے پیار کی خبر پھیل گئی۔ ایک ماہ تو دور کی بات ہر سیکنڈ بڑی اذیت دے رہا تھا۔ صائمہ نے بھی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ کسی شادی غمی میں بھی نہ آتی میرا دل وسوسوں سے بھرنے لگا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ خیر صائمہ ملے گی تو پتا چلے گا۔

☆......☆

شہباز میرا جگری دوست میرا بھائی مجھے ملا اسے ساری حقیقت سے آگاہ کیا۔ وہ بھی میرے حق میں دعائیں کرنے لگا۔ میں ہر پل رب سے اپنے پیار کی بھیک مانگتا۔

ایک ماہ گزر گیا مگر صائمہ کے ابو کا کوئی جواب نہ آیا۔ پھر ایک بار امی کو صائمہ کے گھر جانے پر مجبور کر لیا۔ اماں مجبور ہو کر جان سے زیادہ عزیز بیٹے کی خاطر چلی گئی۔ جب واپسی آئی تو امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں سمجھ گیا کوئی بری بات ہوئی ہے میں بھی رونے لگا۔ ان کا جواب امی کی آنکھوں سے واضح نظر آ رہا تھا۔

کچھ دن بعد بھائی شہباز راستے میں مل گیا۔ سلام و دعا کی اور بتایا۔ ''یار میری صائمہ سے بات اور ملاقات ہوئی ہے۔''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کب، کہاں اور کس وقت۔''

شہباز نے کہا۔ ''یار آج سے پندرہ دن پہلے ہماری خیرات ہوئی اس پر آئی تھی۔ یار آج کل تیری صائمہ کی اپنے کزن اجمل سے علیک سلیک ہے۔'' یہ بات سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ میرا پیار، میرا صنم کسی اور سے بات چیت......'' میں نے شہباز سے کہا۔

''تم بھائی ہو کر بکواس کرتے ہو، شرم سے ڈوب مر کمینے، تُو بھائی نہیں دشمن ہے۔''

تو اس نے کہا۔ ''میری بات پر یقین نہیں تو کبھی خود اس کے منہ سے سن لینا۔''

مجھے تو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اب کیسے صائمہ سے ملوں اور سچ اور جھوٹ کا پوچھوں۔

پھر ایک دن صائمہ کا ماموں ثناء اللہ ملا جو میرا بچپن کا دوست تھا۔ اسے بچپن کی دوستی کا واسطہ دیا کہ سچ کیا ہے تو اس نے کہا۔

''یار میری بھانجی صائمہ کی منگنی تو بچپن سے ہی طے ہے اجمل سے۔''

یہ الفاظ قیامت بن کر مجھ پر گرے۔ میں چکرانے لگا۔ پیروں تلے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ادھر صائمہ سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صائمہ مجھ سے پیار کا اظہار کر کے اجمل سے شادی کر لے گی۔ میں تڑپنے لگا جذبات سمندر کی جوش مارتی لہروں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگے۔

☆......☆

کچھ دنوں بعد شہباز ملا تو میں اس کے گلے لگ کر بہت رویا۔ میرے لیے یہی قیامت تھی کہ صائمہ میری نہیں صائمہ مجھ سے دور ہو جائے گی۔

''شہباز میں صائمہ کے بغیر ادھورا ہوں۔ اس نے شادی کی تو میں مر جاؤں گا، بکھر جاؤں گا۔ صائمہ میری ہے صرف اور صرف میری ہے کوئی اسے مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ صائمہ میری ہر دھڑکن میں

شامل ہے۔

میں جذبات میں تھا مگر سچ وہ تھا جو میں تسلیم نہ کر پا رہا تھا۔

پھر میں صائمہ کو بھلانے کے لیے سگریٹ پینے لگا' گھر والوں سے چوری چوری۔ کسی طرح بھی صائمہ کی یاد دل و دماغ سے نہیں جاتی۔ ادھر صائمہ کی باتیں سینہ چیرتی کہ یعقوب زندگی کی آخری سانس تک وفا کروں گی۔''

کچھ دنوں کے بعد کسی سے سنا کہ صائمہ کی ایک ہفتے بعد شادی ہو رہی ہے۔ میرے ارمانوں کا ایک ہفتے بعد سرعام خون ہو گا۔ ایک خوشیوں کی قاتلہ میرے سارے الفت بھرے وعدے عہد و پیماں اپنے پاؤں تلے روند دے گی۔ میری تمام حسرتوں کا گلا گھونٹ کر غیر کے پھولوں سے لدی سیج پر براجمان ہو گی۔

ہفتے کے دو آخری دن بچے تھے۔ ایک میری میت پر ڈھول بجنے لگا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پینے لگا۔ اسی طرح کئی پاکٹ خالی کیے۔ دن ڈھل چکا تھا میرا سر چکرانے لگا اور میں جلدی سے نیند والی میڈیسن کھا کر بیٹھک میں سو گیا۔ اندر سے لاک کر کے پھر مجھے کچھ پتا نہ چلا کیا ہوا۔

ایک دن بعد جب آنکھ کھلی تو سب گھر والے جمع تھے میرے اردگرد۔ ڈاکٹر نے کہا مسلسل تین دن کے بعد خدا نے سن لی۔ عاشق ہوش میں آ گیا۔ سب گھر والوں کا رو رو کر برا حال تھا۔ جب ہوش میں آیا تو امی نے سینے سے لگا لیا۔ میرے خشک ہونٹوں پر صائمہ کا نام مچل رہا تھا۔ امی نے کہا۔

''تجھے میری قسم اس کا خیال دل سے نکال دے۔''

صائمہ میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر نئی زندگی آباد کر چکی تھی۔ میں آئینے کی طرح ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ میرے جسم و جان دل و دماغ کی ہزاروں کرچیاں ہو چکی تھیں۔ جینے کی خواہش ختم ہو گئی، مرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔

اپنے آپ کو طرح طرح سے کاٹ دیتا، کبھی سگریٹ سے بازو کو جلاتا۔ کچھ دنوں کے بعد ماموں پھر سے اسی بے وفا کے سامنے مجھے لے جاتے، کھیتوں میں کام کروانے کے لیے پھر ایک دن مجھے صائمہ کا کزن راستہ ملا اس نے مجھے ایک خط دیا۔ میں کام سے فارغ ہو کر شام کو جب کھولا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ لکھا ہوا تھا۔

پیارے یعقوب جی!

آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ میرے کہنے سے کیسے مان لیا کہ میں واقعی تم سے سچا پیار کرتی ہوں اور تم سے ہی کیسے شادی کروں گی۔ یہ تمہاری بھول تھی۔ میں نے تو وقت گزارنے، ٹائم پاس کرنے کے لیے فرضی محبت کا جھوٹ بولا جو تم حقیقت اور سچا پیار سمجھ بیٹھے میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں جو چاہتی تھی اس کام کو تم کو خیال تک نہیں تھا۔ میں تم کو ہر بار اشارے کرتی تھی مگر تم بدھو نکلے مگر تم تو نامرد نکلے۔ مجھے صرف تیرے حسن تیرے جوش و جوبن سے دل لگی تھی۔ مجھے ناکام کرنے کی کوشش نہ کرنا میں تمہارے لیے مر چکی ہوں۔ صائمہ اب صرف اور صرف اجمل کی ہے۔ میں نے کبھی تم سے ایک لمحہ سچا پیار نہیں کیا۔''

یہ الفاظ میرے دل و ذہن پر بھاری ہتھوڑے جیسے بن کر برس رہے تھے، کبھی تصور میں بھی نہ سوچا تھا کہ میرے عقیدت بھرے سچے پیار کے جذبے کا ایسا غلط مطلب لے گی اور مجھ سے یہ غلط کام کی امید رکھتی ہے مگر میں نے بھی خدا کے حکم اور سچے پیار کے الفت بھرے جذبے کو غلط نہ سمجھا۔ دل کے آئینے کو پل بھر میں چکنا چور کر دیا جس پر صائمہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ دل کی ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ میرے خواب حسین سہانے جذبات پل بھر میں خاک جذب کر دیے۔ میرے ارمانوں کی بستی کو آگ کا ڈھیر بنا کر غلط سوچ سے راکھ بنا ڈالا۔ مجھے زندہ درگور کر دیا۔ میں نے نشہ آور گولیاں کھالیں اور پتا نہیں کیا ہوا کتنے دنوں کے بعد ہوش آیا۔ سب گھر گھر والے اور گرد جمع تھے۔ امی ابو ماموں سب بیٹھے تھے۔ بے وفا کی بے وفائی پر آنکھیں اشک بار تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد حالت بہتر ہوئی۔ گھر میں جمع

پونجی رقم بیری دوا دارو پر لگ چکی تھی۔ ابو نے گھر میں بتایا کہ بھائی اسماعیل کے پاس ڈھائی لاکھ جمع ہیں۔

کچھ دن کے بعد انکل اسماعیل دبئی سے گھر خالی ہاتھ آگئے۔ سب حیران رہ گئے بعد میں پتا چلا کہ سب بزنس گاڑیاں پانی سپلائی کرنے والے تین ٹینکرز بھی شراب اور کباب کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ وہ انکل عیسیٰ، موسیٰ کے سامنے رونے لگے۔ جب ابو نے اپنی جمع شدہ ڈھائی لاکھ مانگے تو انکل نے دینے سے انکار کر دیا۔ وقت نے ہیرو سے زیرو بنا دیا۔ ایک بار پھر عیسیٰ اور موسیٰ نے اسماعیل کو بینک سے قرض اٹھا کر سعودی عرب کا ویزا دلوایا۔ سعودی عرب میں عیسیٰ، موسیٰ اور اسماعیل کا کزن رہتا تھا۔ جس نے اسماعیل کو عیاش اور شرابی بنایا تھا۔ اصفان گودا جو اپنے باپ کے سارے مربعوں کے مربعے شراب اور کباب میں اڑا چکا تھا۔ ادھر سعودی عرب میں بھی اس کی عیاشی برقرار تھی۔

اسماعیل کو سعودی عرب گئے دو ماہ ہی ہوئے تھے کہ ایک دن اسماعیل اور اصفان دونوں شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔ اسی وقت انکل اسماعیل کا سیٹھ کفیل آگیا۔ عربی میں بولا۔ جلدی جلدی آئل کا ٹینکر آرڈر بک ہوا ہے اسے وہاں خالی کر کے آؤ۔'' انکل تو شراب میں گم تھا۔ سیٹھ کفیل کو انکل بولا۔ کل جاؤں گا ابھی نہیں تو عربی سیٹھ کو غصہ آگیا کہ ایک نوکر ہو کر آج کا کام کل پر چھوڑ رہا ہے۔ سیٹھ نے گالی دی۔ تو انکل نے بھی عربی میں سیٹھ کو گالی دی۔ سیٹھ نے انکل اسماعیل کا سارا سامان گاڑی میں ڈالا اور ایئر پورٹ پر چھوڑ دیا اور بولا، میں نے تم کو خارج کر دیا۔ تم میرے نوکر ختم اور جاؤ پاکستان۔''

تو انکل بھی غصے میں اور گالیاں دینے لگا۔ پھر دو دن کے بعد انکل گھر آگئے۔ انکل کو یوں گھر میں دیکھ کر عیسیٰ، موسیٰ آگ بگولا ہو گئے اور اسماعیل کو خوب مارا۔ مار کھانے کے بعد انکل اسماعیل سیالکوٹ دیہاڑی پر محنت مزدوری کرنے لگے۔

اب پتا چلا پیسہ کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ انکل خون کے آنسو روتا، جو بادشاہوں جیسے لباس میں رہتا۔ وہ

ساون رُت

باہر بارش برس رہی ہے
چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے
موبائل کونے میں پڑا ہے
نہ تو اس نے فون کیا ہے
نہ ہی کوئی میسج بھیجا!
مِس کال ہی آخر کر دیتا وہ
دل اپنا بہلاؤں کیسے
تجھ بن ساون کیسا ساون
آگ لگاتا پانی برسے!
باہر کا موسم رم جھم رم جھم
آنے کی اُمید نہیں ہے
یہ بھی ساون بیتا جائے
تم بن ساون کیسا ساون

شاعرہ: صائمہ عروج۔ دوبئی

آج دس دن کے پسینے میں بدبو اور مٹی سے اٹے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھا۔ ہمارے گھر میں بھی دال روٹی کے لالے پڑنے لگے۔

رزلٹ آؤٹ ہو گئے تھے جس میں، میں اچھے نمبروں سے پاس تھا۔ بہت خوشی ہوئی مگر جب ابو سے نہم کے داخلے کے لیے پیسے مانگے تو ابو نے ایک سرد آہ بھری اور آسمان کی طرف منہ کر کے بولے۔

''اے اللہ مجھے کوئی اچھی نیک راہ دکھا۔''

رات کو میں نے کھانا نہیں کھایا۔ صبح ہوئی تو سب پھٹے پرانے کپڑے اکٹھے کیے اور لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔ آٹھ گھنٹے بعد لاہور کزنز کے پاس پہنچ گیا اور ان کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اسی طرح لاہور سے فیصل آباد، شیخوپورہ، سیالکوٹ، جھنگ، ملتان میں جگہ جگہ کام کی غرض سے دھکے، مار پیٹ، گالی گلوچ کھاتا، تنگ ہو کر ایک سال کے بعد گھر آگیا ابو سے بولا۔

"ابو میں کراچی جاؤں گا۔"

ابو نے اجازت دی اور میں کراچی پہنچ گیا۔

☆......☆

میں اپنے ماموں کے ساتھ کلفٹن نیلم کالونی آ گیا جہاں میرے ماموں کے ماموں پچیس سال سے رہائش پذیر تھے۔ ماموں سلیمان کی بریانی کی دکان تھی 'توحید بریانی سینٹر' جہاں ہر وقت گاہکوں کا ہجوم لگا رہتا۔ مجھے جھوٹی خالی پلیٹیں اٹھانی پڑتیں جس کے بدلے ایک ماہ کے چھ ہزار ملتے۔ چھ ماہ لگاتار ماموں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ کام شدید تھا مگر دکان کے سامنے سمندر کی موجوں کا شور دل کے زخموں کو سہلاتی گرم سرد ہوا جینے میں اضافہ کرتی۔

ایک دن تھوڑی سی غلطی پر ماموں نے مجھے تھپڑ مارا اور اسی وقت سگے ماموں شاہد سے میں نے کرایہ لیا اور گھر آ گیا۔ کچھ دنوں بعد ماموں سلیمان نے میری تنخواہ کی رقم ایزی پیسہ کروا دی۔ پندرہ دنوں کے بعد میں نے ابو سے کہا کہ کوئی ایسی سکون بھری سی فیکٹری میں جگہ بنوا دو۔ تو ابو نے ایک دوست جو ٹیکسٹائل مل فیکٹری میں فورمین تھا۔ اس سے فون پر بات کی اس نے مجھے کام پر رکھنے کی حامی بھر لی۔ بڑے کزن اسحاق نے کہا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو اکٹھے کام کریں گے۔ اس کو ساتھ لے کر میں سہراب گوٹھ سے قائد آباد گل احمد کالا پانی اسٹاپ پر آ گیا، ہمیں فورمین کلیم اللہ ملا جو ہمیں سلفی ٹیکسٹائل مل لے گیا اور ناشتا کروایا۔ پھر تیسرے دن ڈیوٹی پر رکھ لیا۔ ساڑھے بارہ ہزار ماہوار سیلری تھی، آٹھ گھنٹے ڈیوٹی ہوتی پورے آٹھ گھنٹے ایک پاؤں پر کھڑے رہنا ہوتا تھا۔ پہلی ڈیوٹی تھی۔ سب گھر والے یاد آتے ڈیوٹی کے بعد دکان پر آ کر گھر والوں کی یاد میں روتا پہلے پہل کام کا پتا نہ چلتا تھا۔ پورے پندرہ دن کاریگر بتاتے رہتے مگر پھر بھی بھول جاتا جب کلیم اللہ الٹا کام کرتے ہوئے دیکھتا تو گریبان سے پکڑتے اور کتا کمینہ کہتا۔ وقت اور حالات انسان کو کہاں سے کہاں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جو انسان کسی کی گالی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہاں غربت، بے بسی، فاقہ کشی والے دن، گالی گلوچ سننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہر مہینے چھ سے سات ہزار گھر بھیج دیتا باقی وہیں فیکٹری میں خرچ ہو جاتے۔ جب پورے چھ ماہ بعد گھر گیا تو امی کی آنکھیں برسنے لگیں۔ بڑی مشکل سے چپ کرایا۔ کچھ دنوں بعد محبوب بے وفا صائمہ کے گھر کی راہ لی مگر وہ ظالم بے درد بے خبر کو کیا پتا کہ اس کی یاد میں پل پل میں کیسے کوئی جیتا مرتا ہے۔ پتا بھی تھا کہ اب اس کی شادی ہو گئی ہے مگر نادان دل اسے ایک بار دیکھنے پر مجبور کرتا۔ امی نے بہت زور دیا بیٹا شادی کر لو مگر میرا دل عورت ذات سے بھر چکا تھا جینے کی خواہش مر چکی تھی۔ میں بغیر جواب دیئے کراچی آ گیا۔ جہاں تنگ دستی، فاقہ کشی کا راج ہوتا تھا۔ اب وہاں امن سکون تھا۔ میرے دل کی دو چھوٹی سی خواہشیں تھیں۔ ایک ٹچ اسکرین موبائل اور دوسری موٹر بائیک مگر ہر ماہ گھر کے دال دلیے میں ہی سارے پیسے خرچ ہو جاتے۔ مجھے ایک سال ہو گیا تھا فیکٹری میں کام کرتے ہوئے اور اب میں اچھی طرح سے کام سیکھ گیا تھا۔

میں اسی فیکٹری میں ہی رہتا۔ ہر عید و شب برات غریبی کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ میں عید کی نماز پرانے کپڑوں میں ادا کرتا اور گھنٹوں تنہائی میں روتا۔ امی ہر روز شادی کی باتیں کرتیں۔ میں دنیا کی مکاری والی کہانی ہر روز سناتا۔ یوں ڈیوٹی کا بقایا ٹائم کا پتا نہ چلتا۔ اب ہمارے اچھے کپڑوں سے مہنگی پرفیوم کی خوشبو سے سب پڑوسی جل اٹھتے۔ کوئی خوش نہ ہوتا۔ میں جب کراچی سے جاتا تو کبھی پڑوسی کہتے کہ یعقوب دبئی سے آئے ہو کیا جو اتنے لدے ہوئے ہو۔ سوٹ کیسوں کے ساتھ۔" میں سر اٹھا کر کہتا۔

"نہیں انکل کراچی سے آیا ہوں۔" جلنے والوں کا سر جھک جاتا۔ اچھا کھانا اچھا پینا اوڑھنا بہت ہی عزت دی خدا نے۔ میں شاید اس قابل نہ تھا۔ یہ تو صرف اللہ کا مجھ پر کرم ہے مگر میرے حالات نہ بدلے۔ فیکٹری میں آج بھی کام کرتا ہوں ہر ماہ کی تنخواہ سلف چھوٹے بھائی بہن کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں اور گھر کے دال دلیے میں صرف ہو جاتی

ہے اور میرے دل کی تمام امنگیں، حسرتیں دل ہی دل میں مسمار ہو جاتی ہیں۔

☆......☆

ایک دن امی نے فوری طور پر مجھے گھر بلایا اور میں شام کو کراچی سے روانہ ہو گیا۔ صبح ڈی جی خان کے نواحی گاؤں خانپور منج والے پہنچ گیا۔ سب سے علیک سلیک کی امی کے قدموں پر سر رکھ کے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ بہن اور بھائی نے خوب پیار دیا۔ کچھ ہی دیر میں کچھ رشتے دار بھی آگئے جو میرے لیے اجنبی تھے۔ شام کو وہ چلے گئے اور ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئے۔ رات کو امی نے بتایا کہ بیٹا تیرا رشتہ طے کر رہے ہیں۔ نکاح کے لیے بلایا ہے۔''

میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور امی کی گود میں سر رکھا اور کہا کہ امی مجھے ابھی دیر ہے۔ میں نے ابھی کیا دیکھا ہے اس دنیا میں۔''

تو امی نے پیار بھرے لہجے میں حکم صادر کیا کہ پچھلے پانچ سال سے یہی بکواس سن رہی ہوں۔ بس ابھی نکاح ہوگا۔ شادی ابھی نہیں۔''

پھر امی نے کہا۔'' میرے لعل ابھی سو جا صبح لڑکی دیکھنے چلنا ہے۔''

اتنا کہہ کر امی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اتنے میں نانی امی، بھائی ایوب کی بننے والی منگیتر فرزانہ بھی آگئی۔ امی اور میں بھی تیار تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ہم ان نئے رشتے داروں کے دروازے پر تھے۔ امی نانی امی فرزانہ بھابی آگئے میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ سب گرمجوشی سے ملے۔ ایک لڑکی جو اندر سے ہی جھانک رہی تھی اس نے اپنے آپ کو چھپایا ہوا تھا مگر میری نظر اس پر تھی میری امی میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اس نے میرے دیکھنے پر مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا جو میں بخوبی سمجھ گیا کہ یہی لڑکی ہے جو میری شریک حیات بننے والی ہے۔ چائے اور ٹھنڈا پیش کیا گیا اور پھر کھانے کا دور چلا جو بہت اچھا تھا۔ پھر شام ڈھل گئی ہم گھر واپس آگئے۔

شام کو کھانے کے دوران امی نے پوچھا ہاں میرے لخت جگر میرے دل کی ٹھنڈک لڑکی دیکھی۔ اگر پسند ہے تو بیٹا ہم فوری طور پر نکاح کر کے رشتہ پکا کر دیتے ہیں۔''

میں نے ادب بھرے لہجے سے جواب دیا۔

''امی جان مجھے تو کوئی پروا نہیں نکاح اور شادی کی۔ اگر آپ کی خوشی ہے تو میں آپ کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

امی نے ان کو رشتے کی ہاں کر دی۔ وٹے سٹے پر بہن کا دکھ تو ہوا مگر بہن بیٹی تو پرایا دھن ہوتا ہے جو ساری زندگی ماں باپ کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتی کچھ دنوں کے بعد میرا نکاح فوزیہ سے ہو گیا۔ میرے گھر والے بہت خوش ہوئے برسوں بعد ایک خوشی ملی تھی مجھ نالائق کی وجہ سے پھر تھوڑے دنوں بعد میری بہن حرا یوسف کا بھی میرے سالے محمد رفیق سے نکاح ہو گیا۔ سب بہت خوش تھے کچھ دنوں بعد میں کراچی اسی جگہ سلفی ٹیکسٹائل ملز قائد آباد گل احمد کالا پانی اسٹاپ پر آ گیا جہاں آج سے چار سال پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا۔

وہی حال ہر ماہ کی تنخواہ ہر ماہ کے اخراجات میں صرف کبھی حالات کی تنگی منہ پھیلانے لگتی ہے تو کبھی تنہائی میں اس بے وفا کی سنگدلی پر آنسو رواں ہوتے ہوئے تکیے پر دم توڑ دیتے ہیں تو کبھی گھر والوں کی یاد میں ماتم کدہ بن جاتا ہوں۔

آج بھی میری ہر ایک دھڑکن پر بے وفا صائمہ تیرا نام لکھا ہے۔ ہر وقت، ہر پل وہ یاد بن کر میرے سینے میں دھڑکتی ہے۔ لوٹ آؤ ان محبت کی راہوں پر جہاں مجھے تنہا کر گئی۔ منہ موڑ گئی، دل کی امنگیں توڑ گئی۔ شاید میں اس کی جدائی میں بہک گیا یا شاید یہی ادھوری حسرتیں امنگیں امیدیں خواب یوں ہی رائیگاں جانے تھے۔ شاید میری قسمت کو یوں ہی مجھ سے ناراض ہونا تھا۔

جو میرے نصیب میں نہیں تھا وہ مجھے ملا نہیں۔ یہی میرے نصیب میں لکھا تھا۔ نصیب دیکھئے زندگی آگے کیا رنگ دکھاتی ہے۔ میری ہم سفر مجھے کتنی خوشیاں دے سکتی ہے۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ساتویں سچ بیانی

چوروں کو پڑ گئے مور



اعجاز احمد فکر ال

اُس بائیسکل کی گمشدگی کی واردات خاص جس نے لاہور پولیس کو ناکوں چنے چبوادیے

بائیسکل دنیا کی سستی ترین کم، وزن اور کم خرچ سواری ہے۔ ٹریفک میں پھنسا ہوا انسان اس کو آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔ اس طرح بائیسکل بھی ایک دو آدمی آسانی سے اٹھا سکتی ہے۔ اگر کوئی بدقسمت بائیسکل مداریوں یا سرکس والوں کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اس کا تیل نکالنے کے ساتھ ساتھ بھرکس بھی نکال دیتے ہیں اور اس پر آٹھ دس بارہ آدمیوں تک سوار ہو جاتے ہیں۔

افضل کے پاس ایک معمولی بلکہ بہت ہی معمولی بائیسکل تھی جسے اُس نے کئی بار رنگ کر کے اس کا اپنا رنگ گم کر دیا تھا اور اس پر اس قدر سواری کر چکا تھا کہ بائیسکل کی اپنی چال بھی بگڑ چکی تھی۔ اگلے پہیے کا جھکاؤ دائیں طرف اور پچھلے کا بائیں طرف ہو گیا تھا۔ اس پر سواری کرتے وقت افضل خود بھی ڈھنگ سے نہیں بیٹھ سکتا تھا کیوں کہ اس کی اونچائی بیس بائیس نہیں بلکہ پورے چوبیس انچ تھی۔ اس پر بیٹھا سوار دُور سے اونچا اور کبڑا معلوم ہوتا تھا۔ پچھلے زمانوں میں اونٹ سوار گھوڑے پر سواری کرنے والے کے سامنے سربلند دکھائی دیتا تھا۔ موجودہ زمانے کے لحاظ سے موٹر سائیکل سواروں کے مقابلے میں اس کی سواری سربلندی کی علامت تھی۔ دور سے دکھائی دینے والا اس کا سوار یوں ہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اونٹ سوار چلا آ رہا ہو، تاہم فرق یہ تھا کہ شہر کے اندر اس کا سوار اونٹ سے قدرے تیز رفتاری سے اپنی منزل پر پہنچ جاتا تھا۔

بائیسکل کیا تھی، ایک چلتی پھرتی سواری کے نام کا بدنما جغرافیہ تھی۔ اس کی کوئی بھی چیز اصل حالت میں نہ تھی بلکہ کئی بار بدلی جا چکی تھی۔ للہذا ایک بھی پرزہ نیا نہیں تھا جس پر رشک کیا جا سکتا۔ ہاں البتہ ٹائر ٹیوب نئی حالت میں تھے۔ اگر بوڑھی بائیسکل پر سواری کرنا جرم ہوتا تو محکمہ بر حمی والے چالان کر کے اُس کو حوالات میں بند کر دیتے۔ اگر کسی کباڑیئے سے بائیسکل کے بدلے نمک حاصل کیا جاتا تو وہ بھی دس بارہ کلو سے زیادہ نہ دیتا۔ اگر اس کو لوہے کے بھاؤ بیچ دیا جاتا تو بھی بیس بائیس روپے سے زیادہ نہ ملتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے، آخر افضل کو اس بے ڈھنگی بائیسکل سے اتنی گہری محبت کیوں تھی۔ شاید اس لیے کہ بائیسکل پر کئی سال تک سواری کر چکا تھا یا شاید پرانی ہونے کی وجہ سے چوری نہیں ہو سکتی تھی۔ دوست یار افضل کا تمسخر اڑاتے کہ اس کو بدل لو۔ اس پر سواری کرنا تمہارے شایانِ شان نہیں۔ یہ بائیسکل اب کمزور جانور جیسی ہے اور کمزور جانور پر سواری کرنا

گناہ کبیرہ ہے۔ بازار میں کئی نئے ماڈل آچکے ہیں۔ ان میں سے کوئی پسند کرلو۔ تمھاری آمدنی بھی ٹھیک ہے۔ اِس پر ظلم بند کرواور اسے ریٹائر کردو۔

افضل یہ سب باتیں سُنتا اور ہنس کر اپنے بائیسکل کے ساتھ آگے بڑھ جاتا۔ ''بے وقوف'' وہ دل ہی دل میں سوچتا: ''انھیں کیا خبر کہ یہ بائیسکل اس کے لیے کتنی اہم ہے۔''

محبت کرنے والی ماں کی طرح وہ اس کے ساتھ ہوئے ڈنڈے کو محبت آمیز نگاہوں سے اُس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک نیند کی وادی میں نہ پہنچ جاتا۔

اُس کی ماں نے اُس کی یہ کیفیت دیکھی تو اُسے اپنے بیٹے کی دماغی حالت پر کچھ شک سا ہوا۔ اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہا ہے۔ وہ بڑی محبت سے اُس کے پاس آئی اور پیار سے پوچھا: ''بیٹا خیریت تو ہے، میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کئی روز سے اپنی سائیکل اپنے بستر کے ساتھ لگا کر سوتے ہو۔



چمٹا رہا اور یادوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ دن گزرتے رہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن جب اُس کا کوئی دوست ملتا اور اسے اس بائیسکل کے ساتھ دیکھتا تو اس کا مضحکہ اُڑاتا۔ اس کے ایک ایک کل پرزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی بائیسکل اور خود اس کو بھی دقیانوسی قرار دیتا۔ وہ چپکے سے سُنتا اور جب رات ہوتی تو اسے اپنے بستر کے ساتھ کھڑی کر لیتا۔ پھر اُسے اور اس کی سیٹ سے اگلی جانب چپکے کی طرف بڑھتے

آخر اس دقیانوسی سواری میں کیا رکھا ہے؟''

اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ ماں نے بھی اسے دقیانوسی قرار دیا ہے، کہیں اس کے دوستوں نے ماں سے کچھ کہہ نہ دیا ہو، مگر فوراً ہی اس کی سوچ نے اُسے مطمئن کردیا۔ اس نے ماں سے کہا۔

''ماں! بس یوں ہی، میں اسے اپنے پاس رکھتا ہوں۔ پرانی ہے نا، ڈرتا ہوں کہیں کوئی اسے خراب نہ کردے۔''

ماں کی ہنسی نکل گئی۔

''بیٹا یہ تو بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اب اس کے خراب ہونے کا کیا ڈر۔ کیا تمھارے پاس پیسوں کی کمی ہے کہ تم نئی سائیکل نہیں خرید سکتے۔''

''خرید سکتا ہوں ماں!...... مگر مجھے یہی اچھی لگتی ہے۔''

ماں کو اس کی بات سن کر تھوڑا سا غصہ آیا مگر اس نے بیٹے کی محبت میں اس کا اظہار نہ کیا اور چپکے سے اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے دل نے کہا، اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے اپنے بستر پر اپنے ساتھ لٹا لیتا۔

ماں کے جانے کے بعد افضل پھر اس کے ڈنڈے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے شائستہ ہر وقت اس کے پاس ہے۔ اپنے بازوؤں میں وہ اس کے بدن کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ سانسوں میں اُس کی زلفوں کی خوشبو اُترتی جا رہی تھی۔ اس کی ہنسی کی آواز اور باتوں کی معصومیت اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ شائستہ کتنے پیار سے اس پر بیٹھی تھی اور وہ اُسے نہر کے کنارے گھمانے لے گیا تھا۔ پھر وہاں سے گھومتے گھومتے وہ جناح گارڈن آ گئے تھے۔ جناح گارڈن سے اُس کے گھر کے قریب آتے ہوئے اس نے شائستہ سے یوں ہی سوچے اَن سوچے کہہ دیا تھا کہ اب جب تم میرے ساتھ نہیں ہو گی یا مجھے چھوڑ کر بھی چلی جاؤ گی تو تمھارے لمس محبت کی یاد کے طور پر یہ سائیکل میرے پاس رہا کرے گی۔'' شائستہ اُس کی بات سُن کر بڑے زور سے ہنس دی تھی۔

اور پھر یوں ہی ہوا، ایک دن شائستہ اُسے واقعی چھوڑ کر چلی گئی اور یہ سائیکل...... افضل کے دل میں اس کی یادوں کا چرخہ کاتنے لگی۔

وہ اس پر دفتر جاتا۔ گھر واپس آتا۔ سودا سلف لاتا، فلاحی کام کرتا، محلے کے بچوں کو سیر کراتا۔ نہر کے کنارے جاتا تو ہمیشہ سائے میں کھڑی کرتا۔ بارش کے دنوں میں کیچڑ سے بچانے کے لیے اول تو اس کو نکالتا ہی نہیں تھا اور اگر نکالتا تو اس پر چھتری لگا دیتا۔ کیچڑ میں چلانے سے گریز کرتا۔ ہفتے میں کئی بار غسل دیتا۔ روزانہ نئے کپڑے سے چمکاتا۔ روزانہ نئی ہوا بھرتا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کرتا۔ نہ افضل بائیسکل کسی کو استعمال کے لیے دیتا، نہ ہی اس پر کوئی سواری کرنا گوارا کرتا۔

البتہ ایک بار ایک ہمسائے کے مانگنے پر انکار نہ کر سکا۔ وہ اس پر بازار سے آٹا لینے گیا۔ واپسی پر ویلوں کی بے ڈھنگی چال سے حادثہ کروا کے بازو تڑوا آیا۔ جسم پر خراشیں الگ آئیں اور کپڑے الگ پھٹے۔

بائیسکل بھی خوش تھی کہ وہ بڑھاپے میں بھی ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے، جو اس کا دو وادارو کرتا رہتا ہے اور خوب خیال رکھتا ہے۔ اگر کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی تو اب تک کئی بار فرنس میں پگھل چکی ہوتی۔

اس بائیسکل پر سواری نے افضل کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ جن دنوں وہ شائستہ سے ملنے جاتا تھا تو بائیسکل کو خوشبودار سَرف سے غسل دے لیتا اور اس کے جوڑوں پر خوشبودار تیل لگا لیا کرتا تھا۔ خوب رگڑ رگڑ کر اچھے برانڈ کی پالش سے اس کے رنگ میں نکھار پیدا کرتا تھا۔ شائستہ اگلے حصے پر یا کبھی پچھلے کیریئر پر بیٹھتی تو بائیسکل دونوں کی محبت کی باتیں سُن کر اپنی چیں چوں چاں جیسی آوازوں سے خوشی کا اظہار کرتی رہتی۔

اس وقت بائیسکل کو افسوس ہوتا جب افضل اس کو لے کر باغ کے اندر چلا جاتا یا اس کو اسٹینڈ پر کھڑا کر جاتا، بائیسکل کو اپنی جوانی یاد آنے لگتی۔ لاہور کیوں کہ دل سے مطابقت رکھنے والا شہر ہے لہٰذا ایسی کوئی جگہ یا سیرگاہ نہیں تھی، جس کی سیر افضل نے بائیسکل کو نہ کرائی ہو۔ بائیسکل کی اس وقت خوشی کی انتہا نہ رہتی جب افضل اس کی نرم گداز سیٹ پر بیٹھ کر گنگناتا۔ افضل نے بائیسکل کی نازکی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے کئی حصوں پر کور چڑھائے ہوئے تھے اور کئی جگہ اس نے کپڑوں کی پھول جڑیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔

مگر...... ایک دن اس کے ساتھ سانحہ پیش آ گیا۔ پرانی انارکلی چیف انجینئر آفس پی ڈبلیو ڈی بلڈنگ سے کسی کم ظرف چور نے موسم بہار میں وہ بائیسکل اٹھالی۔ افضل آفس سے چھٹی کر کے سیدھا

اسٹینڈ پر آیا اور بائیسکل کو موجود نہ پا کر بے حد پریشان ہوا۔ اسی دن افضل نے پنجاب سول سیکرٹریٹ میں مزدوروں کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ بائیسکل کہاں گئی، کون لے گیا۔ دل میں خیال پیدا ہوا، شاید کسی دوست نے شرارت سے ادھر اُدھر کھڑی کر دی ہو، لہٰذا بائیسکل کو اِدھر اُدھر تلاش کیا گیا۔ لوگوں سے پوچھا گیا لیکن بے سود۔ جوں جوں سائیکل تلاش کرنے کا عمل بڑھتا گیا، سائیکل نہ پا کر اُس کی حالت دیوانوں جیسی ہوگئی۔ بائیسکل کھونے کے غم میں پیدل گھر پہنچنے تک ٹانگیں سوج گئیں۔ بی پی کم ہوگیا اور بخار چڑھ گیا۔ بائیسکل اغوا کرنے والے کو خوب بددعائیں دیں۔ افضل کے ہمدرد دوستوں نے بائیسکل کھو جانے کا افسوس کیا اور ساتھ اس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ پُراُمید رہے، کسی نے شرارت کی ہے۔ بائیسکل جلد ہی مل جائے گی۔ کچھ دل جلوں نے مبارک باد دی اور کہا، شکر کرو، اس بہانے اب تم نئی بائیسکل خرید لو گے۔ کچھ لوگوں نے بائیسکل اُٹھانے والے کو دعائیں دیں کہ افضل اس بائیسکل پر ظلم کر رہا تھا۔ بیچاری کی جان چھوٹ گئی۔

مگر افضل کو کوئی قرار نہ آیا۔ الٹا لوگوں کی باتوں سے اس کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی تشویش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے غم میں اُس کا خون خشک ہونے لگا۔

رات کو افضل نے پرانی فائلوں کے گھریلو ریکارڈ سے بائیسکل کی جنم پرچی تلاش کی اور رات جاگ کر گزاری کہ شاید کوئی اس کی بازیافت کی اطلاع دینے آ جائے۔ اگلے دن صبح سویرے افضل نے بائیسکل کی گمشدگی کی درخواست انگلش میں ٹائپ کی، ساتھ ہی فوٹو کاپی رسید لف کی اور انارکلی تھانے پہنچ گیا۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ اپنی گم شدہ چیزوں کے بارے میں معلوم کرنے آئے تھے۔

تھانے دار نے آمد کی وجہ پوچھی اور اس کو تھانے دار کے پاس بھیج دیا۔

تھانے دار نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولا: ''جناب کل شام پی ڈبلیو ڈی آفس سے کوئی میری بائیسکل اٹھا کر لے گیا ہے۔''

''یہاں گمشدہ لوگ نہیں ملتے اور تم بائیسکل گم کر کے آ گئے ہو۔ کیا درخواست لکھ کر لائے ہو؟'' تھانے دار نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' افضل نے جواب دیا۔

''لاؤ دکھاؤ!'' تھانے دار نے کہا۔

افضل نے درخواست تھانے دار کی طرف بڑھا دی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تھانے دار نے درخواست پکڑ کر ایک نظر ڈال کر کہا: ''تم درخواست انگلش میں لکھ کر لائے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو تمھاری بائیسکل مل جائے گی۔ روزانہ ہزاروں بائیسکلیں گم ہوتی ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق آج تک اُن میں سے تو کوئی نہیں ملی۔ درخواست لے جاؤ اور اس کو اردو میں لکھ کر لاؤ۔''

تھانے دار کے رویے نے افضل کو بہت زیادہ مایوس کیا۔ اگلے دن اُس نے درخواست اردو میں لکھ کر جمع کروائی۔ ساتھ ڈائری نمبر اور ایف آئی آر کی کاپی بھی حاصل کر لی اور گاہے بگاہے تھانے کے چکر لگانے شروع کر دیے اور اپنی گم شدہ بائیسکل کے بارے میں عملے سے استفسار کرتا رہا۔

افضل کی خواہش تھی کہ بائیسکل کی جلد از جلد بازیابی ممکن ہو جائے اور وہ تھانے کے چکر لگانے سے بچ جائے تاکہ اپنے دفتری اور فلاحی امور کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ لہٰذا اُس نے ایف آئی آر پر ریمائنڈر دینے شروع کر دیے۔ کبھی تو انھیں خود جمع کروا آتا اور کبھی پوسٹ کر دیتا لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ پولیس والے وہ ریمائنڈر فائل میں لگاتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا۔ یکے بعد دیگرے افضل نے ڈی آئی جی صاحب کو بھی چٹھیاں لکھنا شروع کر دیں۔ ڈی آئی جی حسبِ معمول وہی چٹھی تھانے دار کو ریفر کر دیتا اور افضل کو ایک ہی جواب دے کر چلتا کر دیتا کہ تلاش جاری ہے۔ جیسے ہی بائیسکل ملی تمھارے حوالے کر دی جائے گی۔ بعد میں افضل نے ایس ایس پی لاہور کو بھی بائیسکل کی گمشدگی کے بارے میں اطلاع

دی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ الٹا ان کارروائی میں آنے جانے اور خط کتابت پر بہت خرچہ اٹھ گیا۔ ذہنی کوفت الگ اٹھانی پڑی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر افضل نے ایڈمنسٹریٹر پنجاب کو چٹھی لکھی کہ ہمارا ملک آزاد ہے۔ یہاں چوروں کا کوئی کام نہیں۔ میری گمشدہ بائیسکل برآمد کروائی جائے۔ ایڈمنسٹریٹر پنجاب نے انتہائی سخت الفاظ میں پولیس ڈپارٹمنٹ کو بائیسکل تلاش کرنے کے بارے میں احکامات صادر کیے۔ پھر اس نے پنجاب کے نئے گورنر سے گورنر ہاؤس لاہور میں ملاقات کی اور اپنی بائیسکل کی بپتا بیان کی کہ میری گمشدہ بائیسکل کا کیس کئی مہینوں سے لٹکا ہوا ہے۔ پولیس والے تعاون نہیں کرتے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ بائیسکل ہی میری واحد سواری ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ذرا میری درخواست پر غور کریں اور میری بائیسکل تلاش کرنے کے احکامات صادر فرمائیں۔

گورنر صاحب افضل کی بات سن کر حیرت ہوئی کہ صرف ایک سائیکل کی خاطر اس نے گورنر تک باریابی حاصل کی ہے۔ پھر کچھ سوچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور درخواست پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

''اچھا! تو آپ کی بائیسکل گم ہوگئی ہے اور ابھی تک نہیں ملی۔ پولیس ڈپارٹمنٹ والے کیا کرتے ہیں۔ ایک بائیسکل تک تو ان سے برآمد نہیں ہوتی۔ باقی کیا کام کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی بائیسکل برآمد ہو جائے گی۔'' گورنر صاحب نے افضل کو یقین دہانی کروائی۔

اس کے بعد انھوں نے پاس پڑی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

ایک ماتحت نوٹ بک اور پنسل ہاتھ میں تھامے کمرے میں داخل ہوا۔ افضل کے لیے چائے منگوائی اور ایک عدد نوٹیفکیشن جاری کرنے کے لیے کہا، جس میں تمام ایس ایس پی حضرات کو حکم دیا گیا کہ افضل کی بائیسکل برآمد کروائی جائے اور جلد رپورٹ پیش کی جائے۔

ایک دن افضل نے اپنے آفس کے ڈی او لیٹر پر آئی جی پنجاب کو اپنی ڈیئر کہہ کر مخاطب کیا اور لکھا کہ میں سپرنٹنڈنٹ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ کی بائیسکل ڈیڑھ سال قبل موسم بہار میں گم ہوگئی تھی، جس کی بازیابی کے لیے انارکلی تھانہ، ایس ایس پی آفس اور ڈی آئی جی آفس میں رابطہ کیا گیا مگر اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی بائیسکل برآمد نہیں ہوئی۔ آخر کے چند الفاظ میں پولیس کی کارکردگی کو انتہائی سست اور نکما کہا گیا۔ ساتھ ہی گورنر پنجاب کی لکھی ہوئی چٹھیاں اور ملاقات کا حوالہ دے دیا۔ چٹھی کے آخر میں سٹمپ بنا کر لال سیاہی سے سائن کر دیے۔

آئی جی صاحب نے افضل کو طلب کر لیا اور پوچھا: ''کیا آپ کی بائیسکل بہت قیمتی ہے۔ بائیسکل تو بائیسکل ہوتی ہے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے جو آپ پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کی کارکردگی گورنر صاحب کے سامنے لے آئے ہیں اور ہمیں نکما کہہ رہے ہیں۔''

افضل نے قدرے پر جوش لہجے میں جواب دیا: ''جناب بائیسکل تو بائیسکل ہی ہوتی ہے۔ کسی امیر کا کتا گم ہو جائے تو پولیس ڈپارٹمنٹ کی پوری نفری حرکت میں آجاتی ہے اور کتے کو برآمد کر لیا جاتا ہے لیکن غریب شہریوں کی چیزوں کو سرے سے برآمد ہی نہیں کیا جاتا۔ الٹا ان کو آنے جانے پر لگا کر ان کے وقت اور سرمائے کا ضیاع کیا جاتا ہے۔''

افضل کے اس ترش لہجے پر آئی جی نے نرمی اختیار کی اور کہا: ''آپ گورنر صاحب کو لیٹر نہ لکھیں، اس طرح ہماری پوزیشن خراب ہوتی ہے۔''

''تھانے والے کچھ نہیں کرتے، صرف کاغذی کارروائی کرتے ہیں، اس لیے مجھے یہ اقدام تو کرنا ہی تھا۔'' افضل نے جواب دیا۔

آئی جی صاحب نے افضل سے دوستانہ انداز میں کہا: ''لگتا ہے آپ کو بائیسکل سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہے۔ اچھا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک بائیسکل نہیں ملتی، میں اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ جیسے ہی بازیاب ہوئی آپ کے حوالے کر دی جائے گی۔''

دوستوں نے افضل کو بہت سمجھایا کہ بائیسکل نہیں

ملے گی، اپنا وقت ضائع مت کرو۔'' مگر افضل ان کو یہی جواب دیتا کہ میں نے زندگی میں ہر کام پُر امید ہو کر کیا ہے، اس لیے ناکامی سے دور رہا ہوں۔ کسی اچھے کام میں تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن ہو کے رہتا ہے۔ پُر امید ہونے کا مزہ بھی تب ہے جب تک عمل نہ کیا جائے۔''

اگلے دن آئی جی صاحب نے ڈی آئی جی صاحب اور شفٹ انچارج کو آئی جی آفس میں بائیسکل میٹنگ کے لیے بلا لیا۔

کچھ روز بعد افضل نے سپرنٹنڈنٹ ڈی آئی جی سے رابطہ کیا اور اپنی گمشدہ بائیسکل کی بازیابی کے لیے فقیرانہ لہجے میں التجا کی۔ بائیسکل کھونے کے غم میں افضل کا کئی کلو وزن کم ہو گیا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ ڈی آئی جی بہت ترش آدمی تھا۔ سائلوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ دور سے ہی ان کو چلتا کر دیا کرتا تھا۔ افضل کمرے میں داخل ہوا اور سلام کیا۔

کسی بھی شخص کے دماغ کے موسم کو جانچنے کے لیے اس کے ماتھے کی تیوری اہم کردار ادا کرتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے سلام کیا جائے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب نے موقع نہ دیا کہ وہ سلام کر سکے۔

''آپ کس کی اجازت سے اندر آئے ہیں؟'' سپرنٹنڈنٹ ڈی آئی جی نے افضل سے پوچھا۔

''جناب میں ایک کام کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں اور کوئی بھی سائل آفس ٹائم کے دوران کسی بھی وقت آفیسران سے مل سکتا ہے۔'' افضل نے بلا جھجک کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی بھاری بھر کم گمشدہ بائیسکل کی فائل میز پر رکھ دی۔ فائل کے اوپر تحریر تھا: ''فائل برائے گمشدہ بائیسکل''۔

تحریر پڑھتے ہی سپرنٹنڈنٹ ڈی آئی جی نے کہا: ''اچھا تو آپ کی بائیسکل گم ہوئی ہے اور آپ کا نام یقیناً افضل ہے۔ آپ اتنی درخواستیں لکھتے ہیں، یہ لندن تو نہیں۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اور بھی کئی کام ہیں۔ شہر میں سینکڑوں وارداتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے صرف بائیسکل کا معمہ تو نہیں۔ چلیں میں آپ کو ڈی آئی جی صاحب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ نے کیا مذاق بنا رکھا ہے، جو روزانہ بائیسکل کی تفتیش کرنے چلے آتے ہیں، جیسے ہم آپ کے ماتحت ہیں۔''

سپرنٹنڈنٹ بہت غصے میں بیٹھا تھا۔ بڑ بڑاتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی اپنی کیپ کو درست کرتا، کبھی توند سے نیچے آنے والی بیلٹ کو اوپر کرتا، اس دوران افضل مکمل خاموش رہا۔

سپرنٹنڈنٹ نے افضل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کہا، ''آؤ ذرا میرے ساتھ، ہم تمھیں بائیسکل لے کر دیتے ہیں۔''

سپرنٹنڈنٹ ڈی آئی جی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا اور مکارانہ انداز میں ڈی آئی جی کو افضل کا تعارف کرایا کہ سر! یہ سرکاری ملازم بھائی ہیں۔ ان کی گمشدہ بائیسکل کی رپورٹ درج کی ہوئی ہے۔ یہ روزانہ ریمائنڈر بھی دینے آتے ہیں اور خود بھی تفتیش کرنے چلے آتے ہیں۔ ہم ان سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ تفتیش جاری ہے، لیکن یہ خواہ مخواہ ریمائنڈر دے کر ہمارے کام کو بڑھا رہے ہیں اور وقت بھی ضائع کر رہے ہیں، جیسے ہمیں ان کی خدمت کے لیے بھرتی کیا گیا ہے۔''

ڈی آئی جی پہلے ہی گمشدہ بائیسکل کے بارے میں آگاہ تھا۔ وہ افضل کو دیکھ کر مسکرا دیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ سے ہم کلام ہوا: ''آپ کے خیال میں سائلوں کو اپنی مسروقہ چیزوں کے بارے میں پتا کرنے کے لیے تھانوں میں نہیں آنا چاہیے؟''

''میرا یہ مطلب تو نہیں''، سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

''پھر آپ کا ان کو میرے سامنے پیش کرنے کا کیا مقصد ہے؟'' ڈی آئی جی صاحب نے درشت لہجے پوچھا۔

''سر...... سر...... میری بات تو سُنیں، آپ جانتے ہیں کہ......'' اس کے الفاظ حلق میں اٹک گئے

اور وہ اپنی گفتگو تواتر کے ساتھ جاری نہ رکھ سکا۔
''آپ جائیں یہاں سے، اور اپنا فرض ادا کریں۔''

سپرنٹنڈنٹ پہلے تو ادھر اُدھر کی ہانکتا رہا پھر ڈی آئی جی صاحب کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا اور فائل اُٹھا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے فائل کو دونوں ہاتھوں سے میز پر پٹخ دیا۔ فائل پٹختے ہی میز پر پڑی گھنٹی نے احتجاج کیا اور ہنس ہنس کر سپرنٹنڈنٹ کو مزید تیخ پا کر دیا۔ پیپر ویٹ اور قلمدان میز سے نیچے گر گئے اور لڑھکنے لگے۔ عین اسی لمحے چھت کا پنکھا چلنا بند ہو گیا۔ ان چیزوں کی اس طرح کی حرکتوں سے اس کے ہوش و حواس اور بھی درہم برہم ہو گئے اور وہ غصے میں خود کلامی کرنے لگا۔

''کشمیر آزاد ہو جائے گا، ایڈز کا علاج دریافت ہو جائے گا، قانون کی حکومت قائم ہو جائے گی، دنیا سے غربت ختم ہو جائے گی، لیکن گمشدہ بائیسکل نہیں مل سکتی۔ او میرے خدا، اس افضل کے بچے نے ہمیں کس پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ اگر اس کا جہاز گم ہو جائے تو یہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دے۔ چوروں کو تو میں پوچھوں گا۔ ذرا میرے ہاتھ لگ جائیں۔''

ڈی آئی جی نے افضل کو اپنے پاس بٹھایا، تسلی دی اور کہا، ''ہم اپنی محکمانہ کارروائی کر رہے ہیں۔ چوروں کا تعاقب جاری ہے۔ آپ پُر امید رہیں۔ آپ کی بائیسکل جلد ہی آپ کے پاس ہو گی اور آپ اس پر خوشی خوشی سواری کریں گے۔ یہاں سے بائیسکل تلاش کرنا سمندر سے سوئی تلاش کرنے کے برابر ہے۔ ہمیں تھوڑا وقت اور دیں۔ ہمارے کارندے دن رات بائیسکل تلاش کر رہے ہیں۔''

بائیسکل کا معمہ پولیس کے لیے چیلنج بن گیا۔ ڈی آئی جی نے تین ٹیمیں تشکیل دے دیں۔

ا۔ ایس ایس پی سٹی لاہور ۲۔ ڈی ایس پی پرانی انار کلی لاہور ۳۔ سی آئی اے اکبری منڈی لاہور۔

تینوں ٹیموں نے چوروں کے گھروں میں چھاپے مارنے شروع کر دیے اور چوروں کو پکڑ کر تفتیش شروع کر دی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ بائیسکل تلاش کرنے کی مہم کو دوسرے تھانوں تک بڑھا دیا گیا۔ اس دوران کئی پرانے چور جو چوریاں کرنا ترک کر چکے تھے اور چوری کے بدنام پیشے کو خیر باد کہہ چکے تھے، اپنی کمین گاہوں سے دوبارہ پکڑ لیے گئے۔ کئی ایسے نئے چور بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے، جن کے بارے میں پولیس کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کئی عادی چور بھی پولیس کے قابو میں آ گئے۔ بائیسکل کی برآمدگی کے لیے لاہور کے تمام تھانوں کی پولیس حرکت میں آ گئی۔ سب چوروں نے کئی چوریوں کا اعتراف کیا۔ اس طرح پولیس کے کئی لاینحل کیس بھی حل ہو گئے۔ اس مہم سے کئی اندھے قتل اور چوریوں کا سراغ بھی مل گیا۔ چوروں کے پاس سے کئی بائیسکلیں، موٹر سائیکلیں، گاڑیاں، زیورات، گائے بھینسیں، کرنسی، اسلحہ اور لوگوں کی منقولہ جائیدادیں بھی برآمد ہو گئیں لیکن افضل کی بائیسکل کا ایک پرزہ بھی برآمد نہ ہوا اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ مل سکا۔ اس مہم میں کئی شرفا بھی پکڑے گئے، جو کئی برسوں سے چوریوں کا مال خرید رہے تھے۔ غیر قانونی اڈے چلا رہے تھے جن کا پولیس کو پتا نہیں تھا۔ چوروں نے لاہور سے باہر بھی مال بیچنے کا اعتراف کیا۔ اس طرح پولیس کے پاس شریف بدمعاشوں کی ایک لسٹ تیار ہو گئی۔

اس مہم کے دوران لاہور راجگوھ کے چور بھی پکڑے گئے۔ پولیس نے مار مار کر ان کے اعصاب ڈھیلے کر دیے اور چمڑی ادھیڑ دی۔ دوران تفتیش انھوں نے اعتراف کیا کہ لاہور سے وہ جو بائیسکلیں چوری کرتے تھے، ان کو سرگودھا، سیالکوٹ، شیخوپورہ اور فیصل آباد کے علاقوں میں فروخت کرتے تھے۔

اس تمام کارروائی کے دوران پولیس افضل کی بائیسکل تلاش کرنے سے مایوس ہو گئی اور کارروائی سے اُکتا گئی۔ ابھی تک کی کارروائی میں ان کو بھاری خرچہ اور خاصی ذہنی کوفت اٹھانا پڑی تھی۔ پولیس تفتیش کو لاہور سے باہر نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

دوران تفتیش پولیس انتظامیہ نے کئی بار افضل کو آفر کی کہ وہ دو نئی بائیسکلیں لے لے مگر اس پرانی

فرسودہ بائیسکل کا خیال ترک کر دے۔ اس بائیسکل کی تفتیش ڈھائی تین سال سے جاری ہے۔ اتنے عرصے میں تو نئی بائیسکل کا بھی حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ وہ پرانی بائیسکل اول تو کہیں ہے ہی نہیں، اگر ہوئی بھی تو قابلِ استعمال حالت میں نہیں ہوگی۔

افضل نے نئی بائیسکل لینے سے صاف انکار کردیا اور پرانی بائیسکل کا مطالبہ بدستور جاری رکھا۔ وہ ان کو کیسے بتاتا کہ بائیسکل سے اُس کا کیا رشتہ ہے۔

ایک دن افضل مہینہ بھر کا سودا سلف لینے اکبری منڈی جا رہا تھا کہ اکبری دروازے کے باہر پولیس کی ایک ٹیم کھڑی تھی۔ تفتیشی ٹیم نے کئی بائیسکل سواروں کو کھڑا کر کے لائنیں لگوائی ہوئی تھیں اور کئی آنے جانے والے لوگوں کی بائیسکلوں کے نمبر چیک کر رہی تھی۔ اس چیکنگ اور گھبراہٹ میں اور بھی کئی چور پکڑے گئے۔

افضل نے ٹیم کے ایک رکن سے مصافحہ کیا اور کہا، ''جناب کچھ عرصہ پہلے میری بھی ایک بائیسکل گم ہوگئی تھی۔''

رکن نے کہا، ''نمبر بتاؤ۔''

افضل نے پرس سے ایف آئی آر کی کاپی نکال کر نمبر لکھوایا۔

رکن نے کہا، ''تمہارا نام افضل ہے؟''

افضل نے جواب دیا، ''جی ہاں!''

رکن نے کہا، ''بھائی تمہاری ہی بائیسکل تو ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نمبر کی بائیسکل تلاش کرنے کے لیے ہم نے پورے شہر میں ناکے لگائے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مل رہی۔ ہمیں روزانہ افسروں سے ڈانٹ پڑتی ہے۔ اوپر سے گورنر صاحب نے دباؤ ڈالا ہوا ہے، تم نے تو ہمیں مصیبت میں ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے لیے اس بائیسکل کا پیچھا چھوڑ دو اور ہم سے نئی بائیسکل لے لو۔''

بعد میں وہی ٹیم رکن افضل کو ایک کولڈ ڈرنک کی دوکان پر لے گیا۔ ٹھنڈے مشروب سے افضل کی خاطر تواضع کی اور اپنی آفر دہرایا۔ افضل معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ کر کے اکبری گیٹ کے اندر داخل ہوگیا۔ اس پورے عرصے کے دوران افضل

گورنر کو یاد دہانی کی چٹھیاں لکھتا رہا کہ ابھی تک میری بائیسکل نہیں ملی۔ گورنر پنجاب کو بھی افضل کی بائیسکل نہ ملنے کا دکھ تھا کہ حکومت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ شہریوں کے مسائل حل کرے اور مجرموں کا قلع قمع کرے لہٰذا گورنر نے بھی پولیس ڈپارٹمنٹ پر بائیسکل کی برآمدگی کے لیے دباؤ جاری رکھا اور بار بار کہا کہ وہ بائیسکل برآمد کریں تاکہ ایک شہری سکھ کا سانس لے سکے۔ اب تک ملک کی عدالتوں سے ہزاروں کیسوں کا فیصلہ ہو گیا۔ ملکی حالات بھی تبدیل ہو گئے۔ کئی افسر ریٹائرڈ ہو گئے۔ کئی نئے آفیسر آ گئے۔ ملازمین کے تبادلے ہو گئے لیکن افضل کی بائیسکل نہ ملی۔ بائیسکل کا معمہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ چوروں کے خلاف پولیس کے سپرہٹ آپریشنوں سے چوری کی وارداتیں بھی کم ہو گئیں۔ پولیس کو کئی اطراف سے جرائم کی کمی کی تسلی بخش رپورٹ موصول ہوئی، مگر بائیسکل نے پورے ڈپارٹمنٹ کا روحانی سکون برباد کیے رکھا۔ بائیسکل کا مسئلہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے روشنی دینے والے سورج کی شکل اختیار کر گیا، جو نہ جانے کہاں ڈوب گیا تھا۔ پولیس بائیسکل تلاش کرنے کے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کر چکی تھی اور مزید اخراجات کی متحمل نہیں تھی۔ ایک دن تھانہ پرانی انارکلی کا ایس ایچ او بہت پریشان بیٹھا بائیسکل کی گمشدگی پر غور کر رہا تھا کہ میں نے زندگی میں بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں کیوں نہ اس مہم کو پورے صوبہ پنجاب میں پھیلا دیا جائے۔ اس نے ایک ٹیم کو راجگوھ کے چوروں کے ہمراہ سرگودھا، سیالکوٹ، شیخوپورہ اور فیصل آباد روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب لاہور سے باہر کے چوروں کی شامت آ گئی۔ پولیس کی کارروائی کو وسیع کرنے کے لیے دوسرے شہروں کی پولیس سے بھی تعاون کی درخواست کرنا پڑی، لہٰذا دوسرے شہروں کی پولیس نے بائیسکل کی بازیابی کے لیے مخبروں کے ذریعے ہنگامی پلان تشکیل دیے۔ ایس ایچ او نے راجگوھ کے چوروں کو ہتھکڑیاں لگا کر ان کو بڑے ٹرک پر سوار کر کے پہلے فیصل آباد، پھر سرگودھا، پھر شیخوپورہ روانہ کیا اور چوروں کی نشان دہی پر چور اور مسروقہ بائیسکلیں برآمد کر کے ٹرک بھر بھر کر لاہور بھیجنے شروع کر دیے۔ اس طرح لاہور کے مختلف تھانوں کے مال خانوں میں ہزاروں بائیسکلیں جمع ہو گئیں اور لاہور کے شہری اپنی گم شدہ بائیسکلیں وصول کرتے رہے۔ آخر میں ٹیم چوروں کو لے کر سیالکوٹ روانہ ہو گئی۔ سیالکوٹ میں چوروں کی نشان دہی پر مختلف جگہوں سے پینتیس بائیسکلیں برآمد ہوئیں۔ کئی اور چور بھی پکڑے گئے جنھوں نے چوری کی بائیسکلیں خریدی تھیں۔ آخر کار ان برآمد شدہ بائیسکلوں میں سے افضل کی بائیسکل بھی مل گئی۔ اس پر ایک شخص دودھ فروخت کر رہا تھا۔ تھانہ اسٹاف نے فوراً لاہور فون پر اطلاع کی کہ مطلوبہ بائیسکل مل گئی ہے۔ لاہور پولیس کی جان میں جان آئی اور شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ بائیسکل اور چوروں کو لاہور لایا گیا۔ پولیس کو سب سے زیادہ غصہ دودھ فروخت کرنے والے شخص پر تھا۔ لہٰذا اس کی تو ہر آنے جانے والے نے خبر لینی شروع کر دی۔

افضل کو اس کی بائیسکل ملنے کی اطلاع کی گئی اور اس کو اسسٹنٹ کمشنر لاہور سٹی کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے کہا گیا۔ اسسٹنٹ کمشنر لاہور سٹی کی عدالت سے رسمی کارروائی کے بعد بائیسکل کو افضل کے حوالے کر دیا گیا اور مبارک باد پیش کی۔ بائیسکل کو دیکھ کر خوشی سے افضل کی آنکھیں بھر آئیں۔ افضل نے بائیسکل وصول کرتے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ اسسٹنٹ کمشنر سے کہا۔

''دنیا کا سب سے قیمتی لفظ شکریہ ہے اور سب سے بری بات کسی خدمت کے بدلے شکریہ ادا نہ کرنا ہے۔ میں آپ کا اور پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کا مسروقہ بائیسائیکل کی بازیابی پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' اسسٹنٹ کمشنر ہنس دیا اور کہا۔

''یو آر ویلکم، اگر آئندہ بھی تمہاری کوئی چیز گم ہو جائے تو پولیس ڈپارٹمنٹ کی خدمات حاضر ہیں۔''

عدالت میں موجود پولیس اہلکاروں کو یوں لگا جیسے انھیں ۴۴۰ واٹ کا جھٹکا دیا گیا ہو۔

☆☆☆......☆☆☆

جسٹ فار انجوائے

ثناء کنول اللہ دتہ

اُس دوشیزہ کی کہانی۔ جس نے زندگی کو صرف انجوائے منٹ کا نام دیا تھا مگر جب قدرت نے ستم ڈھایا تو......



اس نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ سجائے دوبارہ نمبر ڈائل کیا ایک دو تین اور تیسری بیل پر کسی نے ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو! جی کون بات کررہا ہے۔''

فون سے آتی مردانہ گھمبیر سی آواز نے اس کی آنکھوں کی روشنی کئی گنا بڑھادی تھی جب کہ وہ اب جھنجھلا کر فون رکھ چکا تھا۔ رائمہ نے بے ساختہ کھلکھلا کر فون کو دیکھا اور تیسری بار وہی نمبر ملانے لگی۔ اب کی بار کسی لڑکی نے فون اٹھایا تھا لیکن وہ اب بھی نہیں بولی بس اپنے منہ پر ہاتھ رکھے مسکراتی رہتی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی ہنس رہی تھی۔

رات کی تاریکی اپنے جوبن پر تھی۔ ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا اور ایک سیاہ رات ختم ہوتے ہوئے صرف ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ ہر برائی صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اچھائی مضبوطی سے اپنے پر نہ پھیلا لے اور ہر دن کو ختم ہونا پڑتا ہے تب جا کر ایک نیا دن طلوع ہوتا ہے لیکن بات ہے سمجھنے کی مگر کوئی سمجھے تب نا۔

یہ تھی رائمہ عامر زمان۔ اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی اس کے بعد عدنان اور عدی تھے اس طرح سے وہ اپنے بابا عامر زمان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ شرارت تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی ہر وقت کوئی نہ کوئی کارنامہ کیے رکھتی تھی۔ تسلیم بیگم کے ہزار ٹوکنے پر بھی وہ نہیں مانتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم تو بھائی جیسے ہیں، ویسے ہی رہیں گے۔

کالج میں ہر لڑکی اس کی دوست تھی، ہر وقت ہنسی مذاق اس کی ذات کا حصہ بن چکے تھے جسے وہ چاہ کر بھی بدل نہیں سکتی تھی اس کا سب سے بڑا شوق اور مشغلہ کسی کا بھی پی ٹی سی ایل نمبر ڈائل کر کے اسے تنگ کرنا تھا۔ وہ جو دل چاہتا وہ نمبر ملا کر تنگ کیا کرتی۔ کبھی مرد کی آواز نکالتی کبھی بچے کی تو کبھی عورت کی۔ ہر طرح کی آوازیں نکالنے میں وہ ماہر تھی اور بولتی بھی ایسے تھی کہ اگلے کو احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس سے بات کررہا ہے۔

اس کی اس خوبی سے اس کی کلاس کو بڑا فائدہ حاصل تھا وہ یہ کہ جو بھی لڑکی کلاس سے غیر حاضر ہوتی تو رائمہ اس کی آواز نکال کر ٹیچر سے بات کرتی اور بے چاری ٹیچر جو کہ اکثر اپنے موبائل یا بورڈ پر مصروف ہوتی تھی اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس دن بھی اس نے رات ہوتے ہی حسب معمول پی ٹی سی ایل کا نمبر ڈائل کیا اور جب کسی مرد نے اس کی بے حد بے عزتی کی تو اس کا ہنس ہنس کر برا حال تھا کیونکہ اس آدمی کو جسے اس نے ہٹلر بوائے کا نام دیا تھا لگا تھا کہ وہ کوئی لڑکا ہے۔

آپ نے اب فون کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو خبیث کے بچے اور بھی اس نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہا تھا۔ ہنستے ہنستے رائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے رائمہ میری جان! چلو اب اٹھ جاؤ کالج نہیں جانا کیا۔'' تسلیم بیگم اس کے اوپر سے کمبل کھینچتے ہوئے کوئی تیسری بار بولیں تو اس نے کروٹ بدلتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

''کیا ہے امی پلیز سونے دیں نا، آج میں کالج نہیں جاؤں گی پلیز۔''

''ارے کیا ہوا جانو، بخار تو نہیں ہوگیا تمہیں طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔'' وہ اس کے اوپر جھک کر پیار اور پریشانی سے بولیں تو وہ مندی مندی آنکھوں سے مسکرا کر اٹھ بیٹھی پھر اپنے لمبے گھٹنے تک آتے بالوں کو لپیٹتی ہوئی بولی۔

''بخار تو نہیں ہے مجھے بس ایسے ہی کالج جانے کا دل نہیں کررہا۔''

''جلدی سے کچن میں آؤ، آکر میری ہیلپ کرواؤ اب۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور کچن میں چلی گئیں۔

''لائیں دیں میں بنا دیتی ہوں آملیٹ۔'' وہ کچن میں آکر ان کے ہاتھوں سے پیاز لے کر محبت سے بولی تو تسلیم بیگم محبت سے اسے دیکھتے ہوئے نم آواز میں بولیں۔

''کتنی پیاری ہے نا میری بیٹی! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کاشی چوہان کہتے ہیں کہ کامیاب ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ تمہاری زندگی میں اگر کیسا بھی وقت کیوں نہ آجائے تم ہمت مت ہارنا، بھی کامیابی تمہارا مقدر بنے گی اوکے۔''

''ارے امی! میری جان آپ بھی نا صبح صبح میری

معصوم سی لڑکی کو ایسے نصیحت کر رہی ہیں جیسے وہ نصیحت نہ ہو بلکہ ناشتا ہو۔ جلدی کریں مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔"

تبھی عدنان کچن میں داخل ہو کر شرارت سے بولا تو رائمہ شرارت سے بولی۔ "یہ تو ہمیشہ سے ہی بھوکا رہا ہے۔ اس کی بھوک پتا نہیں کب ختم ہوگی کتنا کھاتا ہے نا یہ امی۔" وہ آخر میں تسلیم بیگم کو اپنے مذاق میں شامل کرتی ہوئی بولی تو عدنان اسے گھور کر رہ گیا۔

اگلے دن جب اس نے اپنا یہ نیا کارنامہ اپنی کلاس فیلو کو سنایا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں جب کہ آرایہ سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئی بولی۔

"اٹس ناٹ فیئر! حد ہوتی ہے یار تمہیں پتا ہے تمہارے اس چھوٹے سے مذاق سے کسی کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔ اب کسی کو کیا پتا کہ ہمیں تنگ کرنے والی لڑکی ہے کہ لڑکا یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔"

اس کی بات پر وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☆......☆

اس کے ایگزامز ہوتے ہی امی ابو نے اس کے لیے رشتے دیکھنا شروع کر دیے۔ اس نے لاکھ انکار کیا مگر انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور اس کی منگنی پارس سے کر دی گئی۔ پارس اور عارش دو بھائی تھے۔ پارش چھوٹا تھا جب کہ عارش بڑا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اس کی بیوی کا نام نسرین تھا۔ ان کی صرف ایک بہن تھی آنچل۔

منگنی کیا ہوئی گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور وہ پارس کے ساتھ رخصت ہو کر ایک نئے گھر اور ایک نئے رشتے سے جڑ گئی۔ پارس بہت محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس کا بے حد خیال رکھتا تھا جب کہ اس کی ساس کوثر بیگم بھی بہت اچھی تھیں جو کہ ساس کم اور ماں زیادہ تھیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن ایک بات جو اس نے بے حد محسوس کی تھی وہ یہ کہ عارش ہمیشہ چوبیس گھنٹے غصے میں رہتا تھا، مسکراتے کیسے ہیں اسے شاید خبر بھی نہیں تھی۔ یہ نارمل سی بات تھی لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ عارش آنچل سے بالکل بھی بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اس کے ہوتے ہوئے ٹیبل پر آتا تھا۔ اس دن حسب معمول پارس آفس جا چکے تھے۔ نسرین کچن کی صفائی میں مصروف تھی تو وہ کپڑے اٹھائے گھر کے پیچھے چلی آئی جہاں مشین لگا کر کپڑے دھوئے جاتے تھے۔ اس کے اپنے کپڑے بہت گندے ہو رہے تھے اسی لیے اس نے آنچل کے کپڑے پہن لیے اور عارش کے میلے کپڑے لینے اس کے کمرے می چلی گئی۔

وہ ابھی کپڑے نکال ہی رہی تھی کہ اس کے پیچھے کھڑا عارش دہاڑا۔

"آنچل! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں قدم رکھنے کی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس نے حیرت سے اپنے پیچھے کھڑے عارش کو دیکھا۔ عارش کو بے اختیار ہی شرمندگی نے گھیر لیا وہ تو یہ سمجھا تھا کہ شاید اس کے کمرے میں آنچل کھڑی ہے لیکن آنچل کے کپڑوں میں رائمہ کو دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔

"وہ بھابی جی...... آئم سوسوری۔ مجھے لگا کہ آنچل ہے آپ کو کچھ چاہیے تھا۔" وہ شرمندگی سے بات بدل کر بولا تو رائمہ سنجیدگی سے مسکرا کر بولی۔

"نو اٹس او کے، ایک بات پوچھوں عارش بھائی؟"

اس کے سوال پر عارش استفہامیہ اسے دیکھنے لگا تو وہ ذرا جھجک کر بولی۔

"آپ آنچل سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہو؟ کیا بات ہے اپنی بہن کو نہیں بتاؤ گے؟"

اس کی بات پر وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کمرے سے نکلتا چلا گیا جب کہ وہ حیرت سے اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

اس کے بعد وہ بے حد پریشان رہنے لگی کہ آخر کیا وجہ تھی کہ عارش، آنچل سے نفرت کرتا تھا۔ حالانکہ باقی سب اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور اسی پریشانی میں ایک دن اس نے آنچل سے پوچھ لیا تو وہ روتے ہوئے بولی۔

"نہیں بھابی میں بدکردار نہیں ہوں، بھائی کو صرف غلط فہمی ہے۔ میں اپنے کالج فیلو ریان سے محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔ ایک دن بھائی عارش نے مجھے ریان کے ساتھ دیکھ لیا اور گھر آ کر انہوں نے مجھ پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ میری غلطی تھی۔ ان کا حق تھا کہ وہ میری غلطی پر مجھے سزا دیں۔ پھر ریان نے جب رشتے کے لیے اپنے امی ابو کو

بھیجا تب بھیا نے ان کی بے عزتی کر کے انہیں انکار کر دیا۔ میں نے تب بھی احتجاج نہیں کیا۔ انہیں ہر حق حاصل تھا لیکن میرے کردار پر انگلی اٹھانے کا حق میں نے انہیں کبھی نہیں دیا۔ میں چپ ہوگئی میں نے صرف بھائی کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ انہیں شک تھا کہ میں پی ٹی سی ایل پر ریان سے بات کرتی ہوں۔ ان دنوں کوئی رانگ نمبر بے حد تنگ کر رہا تھا بار بار فون کرتا اور فون اٹھا لینے پر کوئی کچھ ہی نہیں کرتا تھا ایک دن میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ میں نے رانگ نمبر والے کو کہا کہ اس کی وجہ سے میری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ میں اپنے گھر والوں کی نظروں سے گر گئی ہوں اب اگر تم نے فون کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

تب بھائی نے سن لیا اور انہیں لگا کہ میں ریان سے بات کر رہی تھی۔ اس کے بعد سے وہ مجھ سے بالکل بھی بات نہیں کرتے نفرت کرتے ہیں مجھ سے اور یہ سب "رانگ نمبر" کا کام ہے۔ آخر میں غصے سے اس نے نمبر دہرایا تو رائمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے تو کیا اس سب کی ذمہ دار میں ہوں۔" وہ سوچتی ہوئی اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

ساری رات وہ سو نہیں سکی۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ بار بار اس کے کانوں میں آنچل کے الفاظ گونج جاتے تو کبھی آرایہ کی بات اسے یاد آجاتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "اٹس ناٹ فیئر، حد ہوتی ہے یار تمہیں پتا ہے کہ تمہارے اس چھوٹے سے مذاق سے کسی کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔"

☆......☆

صبح کو وہ امی کے گھر چلی آئی کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور اپنی الماری میں پڑی پرانی سم اس نے اپنے موبائل میں ڈالی اور اسی نمبر کو ڈائل کرنے لگی۔ ایک دو تین جیسے جیسے بیل جا رہی تھی اس کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی اور پھر فون سے عارش کی آواز آئی تو وہ ایک طرف ڈھے سی گئی۔ اسی کی وجہ سے آنچل اپنے بھائی کی نظروں سے گری تھی، گناہ گار نہ ہوتے ہوئے سزا پانا کیسا ہوتا ہے یہ کوئی آنچل سے پوچھتا۔ اس کے صرف ایک چھوٹے سے مذاق نے نہ جانے کتنے گھر خراب کیے ہوں گے۔ وہ جتنا سوچتی جاتی پچھتاوا بڑھتا چلا جاتا دکھ تھا کہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا اگر آنچل کو یا پھر پارس کو پتا چل جاتا کہ ان کی زندگیوں میں زہر گھولنے والی وہ ہے تو......" اس سے آگے وہ چاہ کر بھی سوچ نہیں پاتی تھی۔ بہت پہلے امی کے کہے الفاظ اسے یاد آ گئے۔ "ہمیشہ وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو کبھی ہمت نہیں ہارتے تمہاری زندگی میں چاہے جیسا بھی وقت کیوں نہ آجائے بس تم ہمت مت ہارنا، تبھی کامیابی تمہارا مقدر بنے گی۔"

اگر میں نے غلطی کی ہے تو سدھاروں گی بھی میں خود۔ وہ سوچتے ہوئے پُرعزم انداز میں اٹھی اور آنچل سے دوسرے دن ریان کا ایڈریس لے کر وہ اس کے گھر پر موجود تھی جہاں ریان سے مل کر اسے خوشی ہوئی تو دوسری طرف اس کے شادی نہ کرنے کا دکھ بھی ہوا۔ ریان کا کہنا تھا کہ وہ ہمیشہ سے آنچل سے شادی کرنا چاہتا رہا ہے۔

گھر آ کر اس نے اپنے فون میں وہی پرانی سم ڈالی اور واش روم میں چلی آئی۔ وہ جانتی تھی کہ عارش اور اس کے بچے لاؤنج میں بیٹھے ہیں اور فون عارش ہی اٹھائے گا۔ جبھی عارش نے فون اٹھا لیا تو وہ اپنی آواز بدل کر بظاہر روتے ہوئے بولی۔ "عارش...... عارش میری شادی ہو رہی ہے میں نے تو ہمیشہ سے تم سے محبت کی ہے۔"

"کون بول رہا ہے۔" عارش حیرانگی سے بولا تو رائمہ فرانے سے جھوٹ بولنے لگی۔

"میں ہوں نادیہ۔ کچھ مہینے پہلے بھی میں صرف تمہاری آواز سننے کے لیے اس نمبر پر فون کیا کرتی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے تم سے محبت کیسے ہوئی۔ پہلی بار میں نے تمہیں تمہاری گاڑی میں بیٹھے دیکھا تھا، بس تبھی میرے دل نے کہا نادیہ یہ شخص صرف تمہارا ہے۔ تمہاری گاڑی کے نمبر سے ہی میں نے تمہارا پی ٹی سی ایل نمبر پتا کیا۔ ہر بار تمہیں فون کرنے پر میں اپنی ہمت گنوا بیٹھی تھی۔ بات کر ہی نہیں سکتی تھی اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی ہوئی ہو تو پلیز مجھے معاف کر دینا میں آج کے بعد کبھی تمہیں فون نہیں کروں گی کبھی نہیں۔" آخر میں جھوٹ موٹ کا روتے ہوئے اس نے فون بند کر کے اپنی سم نکالی یہ سم اس نے کالج کے دوران نادیہ کے ہی نام سے لی تھی اور آج یہ ہی اس کے کام آئی تھی۔

عارش نے حماقت کے سے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھا۔

''تو کیا وہ فون نادیہ نے کیے تھے اور میں سوچتا رہا کہ ریان فون کرتا ہے اوہ خدا آنچل نے کتنا کہا کہ ریان اسے فون نہیں کرتا اور میں نے اس کی بات کبھی نہیں سنی۔

نادیہ پر غصہ، اپنے کیے پر شرمندگی...... ندامت سے اس کا سر جھکتا چلا گیا اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کے سے انداز میں گھر سے نکل گیا۔ جب کہ رائمہ نے سکون کا سانس لیا آخر اس نے آنچل کا کردار عارش کے سامنے صاف کر دیا تھا۔

''چلو اٹھو بھی اب، منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو۔''

''نہیں بھابی پلیز میرا دل نہیں چاہ رہا آپ چلی جائیں ناں۔'' رائمہ کے بار بار کہنے پر وہ کچھ بیزاری سے بولی تو وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''کسی ایک انسان کے چلے جانے سے دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ جینا پڑتا ہے۔ کبھی اپنے لیے تو کبھی رشتوں کے لیے اپنے اوپر خوشیوں کو حرام کر لینے سے کبھی بسانے والا واپس نہیں آتا۔ او کے اب اٹھو اور تیار ہو جاؤ آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ میری خاطر پلیز لاؤنج میں آ جاؤ۔''

وہ التجا کرتے ہوئے بولی تو آنچل دکھتے دل کے ساتھ تیار ہونے چل دی۔

پانچ منٹ کے بعد وہ جیسے ہی تیار ہو کر لاؤنج میں سے رائمہ کو بولنے آئی ساکت رہ گئی۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر حقیقت ہے...... لیکن نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے اس نے ایک بار پھر سامنے دیکھا کہ شاید منظر بدل گیا ہو لیکن یہ کیا منظر بھی وہی تھا لیکن اس میں ریان اور عارش کے قہقہے گونج رہے تھے وہ حیران سی تھی۔ رائمہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا ہماری آنچل کو...... یقین نہیں آ رہا ناں؟ مجھے بھی نہیں آیا تھا جب عارش نے جا کر ریان سے معافی مانگی تھی اور اب وہ آ گیا ہے۔ جب ریان اپنی امی کے ساتھ تمہارا دوبارہ طلب گار بن کے آیا ہے آؤ۔''

وہ اسے پکڑے اندر لے آئی ریان نے مسکراتی نظروں سے اس کا استقبال کیا تھا اور آنچل کو لگا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ ''دیکھا آنچل میں نے کہا تھا ناں کہ اگر ایک دینے والا در بند ہوتا ہے تو کئی دینے والے در اللہ کھول دیتا ہے۔ بس تم مایوس نہ ہونا کیونکہ جب ہم ناامید اور مایوس ہوتے ہیں تو مایوسی ہم پر اپنا گھیرا تنگ کر لیتی ہے اور امید کے ہزاروں در خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔''

اس نے نم آنکھوں سے ریان کی امی کو دیکھا جو اس کے ہاتھ میں ریان کے نام کی انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ ایک دم ہر طرف مبارک کا شور اٹھا تو ریان اس کے پاس جھکتے ہوئے بولا۔

''تم میری تھیں اور تمہیں میرے پاس ہی آنا تھا اب رونا بند کرو نا پلیز۔''

اس کی بات پر اس نے اپنے آنسو صاف کر لیے۔ اگلے مہینے شادی کی تاریخ فائنل ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆......☆

بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی آخر ایسا کیا ہوا جو عارش بھائی مان گئے۔ آنچل سوچ رہی تھی کہ عارش کمرے میں داخل ہوا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نم آواز میں بولا۔

''آنچل میری پیاری بہن پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر اعتبار نہیں کیا اور تمہیں اس گناہ کی سزا دی جو تمہارا تھا ہی نہیں۔ جیسے ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوا میں نے ریان سے معافی مانگی۔ اب تم سے معافی مانگتا ہوں اپنے بھائی کو......!'' وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا تو وہ اسے ٹوک کر بولی۔

''نہیں بھائی آپ معافی نہ مانگیں۔ غلطی آپ کی بھی نہیں غلطی تو اس رانگ نمبر کی تھی جسے ہم سے ہماری زندگی کے اتنے خوب صورت سال لے لیے آپ معافی نہ مانگیں میں خوش ہوں بہت زیادہ۔ آخر آپ کو احساس ہو ہی گیا کہ میرا کردار صاف ہے۔''

وہ نم آواز میں بولی تو دروازے کے پاس کھڑی رائمہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کی جسٹ فار انجوائے کی عادت اور ایڈونچر نے کسی معصوم کی زندگی کو کتنے برس تک ذہن زدہ رکھا تھا۔ پلیز اپنے ارد گرد ضرور دیکھیں کہیں کوئی اور تو اپنے انجوائے منٹ کے لیے نیا پلان تو نہیں بنا رہا؟

☆☆☆

زندہ دفن کردیا

نسیم سحر

اپنے ہی خون کی سنگدلی کی انتہا' اُس باپ کی کہانی جسے بیٹوں نے زندہ ہی دفن کردیا

میرا نام فضل الٰہی ہے۔ میں ایک فیکٹری میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہوں۔ فیکٹری میرے گھر سے تقریباً تیس چالیس منٹ کی مسافت پر ہے اور یہ مسافت میں بس کے ذریعے طے کرتا ہوں۔ عموماً میں عصر کی نماز پڑھ کر گھر سے نکلتا ہوں اور مغرب اور عشاء فیکٹری میں ہی ادا کرتا ہوں۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے عموماً تین چار بجے تک کام کرتے ہیں۔

کچھ دیر سو بھی لیتے تھے اور صبح میں پھر کام نمٹا کر گھر کی راہ لیتے ہیں۔ میرا بھی یہی معمول تھا۔ کبھی کام زیادہ بھی ہوتا تو ساری رات ہی جاگنا پڑ جاتا تھا اور کبھی ہلکا ہوتا تو لوگ عموماً سو جاتے یا پھر باتوں میں یا تاش میں مشغول ہو جاتے۔

میری تو کوشش ہوتی تھی کہ میں گھر چلا جاؤں مگر رات کو اس وقت ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہوتا تھا۔ بس وغیرہ تو چلتی نہ تھی رکشا کی گنجائش نہیں تھی میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ سائیکل خرید لی۔ کیونکہ موٹر سائیکل میں بھی پیٹرول کا مسئلہ تھا۔ میرے چار بچے تھے اور سب ہی پڑھ رہے تھے۔ فیکٹری کی تنخواہ سے تو بس گزارہ ہی ہوتا تھا۔

☆......☆

ابھی تھوڑے دن پہلے ہمارے ہاں ایک نیا آدمی کام پر لگا تھا۔ اس کا نام ارشد تھا۔ ارشد ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی تھا۔ وہ میرے گھر سے دو اسٹاپ پہلے رہتا تھا۔ اس کے پاس بائیک تھی۔ میری اس سے اچھی دوستی ہوگئی تھی۔

اس کی بھی یہی عادت تھی کہ کام ہلکا ہونے کی صورت میں وہ گھر جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس لیے وہ مجھے بھی گھر چھوڑنے کی آفر دیتا تھا۔

''ارے کہاں رات کو سائیکل چلاؤ گے آجاؤ میرے ساتھ۔'' اس کے اصرار پر میں اس کے ساتھ بائیک پر آجاتا اور سائیکل فیکٹری میں ہی چھوڑ دیتا۔ ارشد پھر دوسرے دن بھی مجھے پک کرلیتا۔ اس طرح ہماری دوستی گہری اور تعلقات مستحکم ہوتے گئے۔

ہمارے گھر کے راستے میں ایک قبرستان پڑتا تھا اگر ہم وہ راستہ اختیار کرتے تو جلدی پہنچ جاتے تھے۔ ارشد سے پہلے میرا وہی روٹ تھا۔ مگر ارشد ذرا ڈرپوک قسم کا تھا۔ اس لیے وہ وہاں سے نہیں جاتا تھا اور مجھے بھی منع کرتا تھا۔

''ارے یار کچھ نہیں ہوتا، وہ بے چارے کیا کیا کہیں گے شہر خموشاں کے لوگ۔'' مگر ارشد نہ مانتا اور میں اس کی خوشی کی خاطر دوسرے راستے سے آنے لگا۔ گو کہ وہ راستہ ذرا طویل تھا مگر پر رونق تھا پھر اسی طرح وقت گزرنے لگا۔

☆......☆

ایک روز ارشد کام پر نہیں آیا اور اس رات کو کام بھی ہلکا تھا تو میں نے سوچا کہ اپنے حصے کا کام کر کے گھر چلا جاؤں۔ میرے چھوٹے بیٹے کی

آوارہ اور نشئی حضرات ہوتے تھے۔ میں ان سے کوئی بھی ٹاکرا کیے بغیر گزر جاتا۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا تھا۔ خیر میں اس دن بھی درود شریف پڑھتے ہوئے اپنی دھن میں مگن سائیکل پر سوار چلا جا رہا تھا۔

یہ ایک پتلی سی سڑک تھی جو قبرستان کے درمیان واقع تھی جس پر عموماً دن میں تو لوگ گزرتے تھے مگر رات کو شاذ و نادر ہی کوئی گزرتا۔ اس لیے وہ سڑک اکثر سنسان و ویران ہونے کا



طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے کام ختم کیا اور سائیکل اٹھائی کیونکہ آج ارشد میرے ساتھ تو نہیں تھا اس لیے میں نے قبرستان والا شارٹ کٹ اپنایا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی میں نے السلام علیکم یا اہل القبور کہا اور درود شریف پڑھتا ہوا راستہ طے کرنے لگا۔

کبھی کبھی گورکن سے بھی سامنا ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ قبرستان میں اکثر بھی باتوں کی

نمونہ پیش کرتی تھی۔

ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ میں نے لمحہ بھر رک کے دیکھا لیکن وہاں تو کوئی نہ تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور آگے چلنے لگا، پھر کچھ عجیب سی آواز آئی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی نہ تھا۔ میں سمجھا کہ کوئی نشئی بک بک کر رہا ہوگا۔ میں نے دھیان نہ دیا اور گھر کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن ارشد بھی فیکٹری میں آیا ہوا تھا۔ میں نے کل کے واقعے کا اس سے ذکر کیا تو وہ ڈر گیا اور مجھے منع کرنے لگا کہ وہاں سے نہ جاؤں۔ میں نے لاپروائی سے کہا۔

’’ارے یار کچھ نہیں ہوتا۔ یہ میرا روز کا معمول ہے۔‘‘ مگر وہ تو بہت ہی ڈرپوک تھا۔ کہنے لگا۔

’’ہاں ہاں بڑا تمیں مار خان ہے نا کچھ ہو گیا تو پتا چلے گا۔‘‘ میں نے اس کا ڈر دیکھتے ہوئے اس کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا۔

’’اچھا بابا نہیں جاؤں گا۔‘‘ اتفاق ایسا ہوا کہ ہمیں آئے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ارشد کے گھر سے فون آ گیا۔ کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔

ارشد تو فوراً چھٹی لے کر چلا گیا۔ اس رات کو بھی کام ختم کر کے میں نے سائیکل لی اور چل پڑا اور وہی قبرستان والا راستہ اختیار کیا اندر داخل ہوتے ہی میں نے السلام علیکم یا اہل القبور کہا اور درود شریف پڑھتے ہوئے پیڈل مارنے لگا۔ تھوڑی دور ہی جانے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی آواز آئی ہے۔ میں رک گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک تازہ قبر بنی ہوئی تھی۔ میں ایسے ہی ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پھر آواز آئی کوئی کیا بول رہا تھا یہ سمجھ نہ آئی مگر جیسے کوئی بہت دور سے آواز دیتا ہے آواز ہلکی مگر واضح تھی اور اس قبر سے آئی تھی جو تازہ بنی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ایک طرف کی اور قریب ہو کر کان لگا دیئے۔ قبرستان میں اِکا دُکا بلب ہی لگے ہوئے تھے حالانکہ اہل محلہ نے روشنی کا معقول بندوبست کیا تھا مگر یہ نشئی حضرات بلب بھی نہیں چھوڑتے۔ ملگجی سی روشنی میں، میں نے قبر سے کان لگائے ہوئے تھے، شاید وہاں دوپہر کو یا ایک دن پہلے ہی تدفین ہوئی تھی۔ پھر آواز آئی۔

’’مجھے نکالو میں کہاں ہوں؟‘‘ میں نے آس پاس دیکھا۔ گورکن بھی اپنی کوٹھڑی میں سو چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ تقریباً رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ میں گورکن کو لے کر اسی قبر کے پاس آیا اور اس کو آواز سنوائی۔ پہلے تو وہ ٹالنے لگا۔

’’ارے بھائی کچھ نہیں ہے تمہارا وہم ہے بابا، یہ قبرستان ہے۔ یہاں تو روحوں کا بسیرا ہے، جاؤ تم گھر جاؤ۔‘‘

پہلے تو میں نے سوچا واقعی میرا وہم ہو گا شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو لیکن میں نے جیسے ہی قدم بڑھایا پھر آواز آئی۔

’’مجھے نکالو۔‘‘ میں قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے واضح طور پر لگا کہ اندر کوئی زندہ انسان ہے۔ میں نے گورکن کو کہا کہ وہ قبر کھودے۔

’’ارے تمہارا دماغ خراب ہے گیا۔ جا بھائی اپنا کام کر۔‘‘ وہ جھنجھلا کر گیا۔

جب وہ نہیں مانا تو میں نے اسے دھمکی دی کہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں وہ تھوڑا سا ڈرا پھر تیار ہو گیا۔ میں نے سوچا کوئی مسئلہ ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لیے چند اور لوگوں کو بھی بلا لینا چاہیے۔ میں نے اسے روکا اور خود سائیکل پر جلدی سے جا کر قریبی محلے کے دو چار لوگوں اور مسجد کے امام صاحب کو لے کر آ گیا۔

ہم پانچ افراد کی موجودگی میں قبر کھودی گئی جیسے ہی تختہ ہٹایا سامنے کفن میں حرکت ہوئی۔ ہم سب باآواز بلند آیتیں پڑھ رہے تھے جیسے کسی کو چادر میں باندھ دیا جائے اور وہ اندر کسمسا رہا ہو۔ امام صاحب کے کہنے پر جب کفن کھولا تو اندر سے ایک زندہ شخص برآمد ہوا۔

وہ خوب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پھر وہ زمین پر گر گیا۔ جلدی سے اسے پانی پلایا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مسلے، نبض چیک کی جو چل رہی تھی۔ ہم لوگ اسے قریبی اسپتال لے گئے پھر ہم لوگ اسے اسپتال چھوڑ کر گھر آ گئے۔ صبح پھر ہم لوگ گئے تو وہ کافی بہتر حالت میں تھا۔

وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا اور یہ اللہ کا کرشمہ ہی تھا کہ وہ ڈیڑھ دن قبر میں رہنے کے بعد بھی زندہ رہا۔ ہم لوگوں نے وجہ پوچھی پہلے تو وہ خاموش رہا

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ نگار نذر

پاکستان کی پہلی خاتون کارٹونسٹ، نگار نذر کی تخلیقات میں ''گوگی'' کو بنیادی حیثیت حال ہے۔ اپنے اس کارٹونک کردار کی مدد سے انہوں نے فکر کو مختلف معنی اور نظر کو سیکڑوں زاویے دیے۔ ''گوگی'' پہلی مرتبہ 1970ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹ' کراچی کے سالانہ میگزین کے ذریعے منظر عام پر آئی اور بعض ملکی روزناموں میں کامک اسٹرپ کی صورت میں شائع ہوئی۔ دنیا بھر میں اس کارٹون کردار نے اپنی شناخت قائم کی۔ نگار نذر کے مطابق گوگی اُن عورتوں کی ترجمان ہے جو معاشرے کے لیے کارآمد بننا چاہتی ہیں۔ اجتماعی وانفرادی اعتبار سے ترقی کی خواہش مند ہیں۔ اپنے حقوق چاہتی ہیں اور ایک ایسی سوسائٹی کی خواہش رکھتی ہیں جہاں انصاف ہو اور شہریوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ گوگی کا کردار کامک اسٹرپس کی صورت میں ملکی اور غیر ملکی روزناموں کے علاوہ کئی میگزین کی زینت بنا اور پاکستان میں اسے ٹیلی ویژن پر بھی پیش کیا گیا۔ نگار نذر کے کارٹونک آرٹ کو بیرونِ ملک بے حد سراہا گیا اور اسے بہت اہمیت دی گئی۔

حسن انتخاب: محمد اسامہ' کراچی

پھر جو کہانی اس نے سنائی وہ کافی طویل تھی۔ مختصر یہ کہ اس کے بیٹوں نے جائیداد ہتھیانے کے چکر میں باپ کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ کافی عرصے سے وہ لوگ باپ کو پریشان کر رہے تھے۔ جب بات نہیں بنی تو اپنی اپنی بیویوں کے مشورے سے انہوں نے پروگرام بنایا۔

ایک دن دعوت میں جانے کا ذکر کیا اور باپ کے لیے جو کھانا رکھ کے گئے تھے اس میں زہر ملا دیا تھا۔ اتفاق سے وہ کھانا بڑے میاں نے ایک فقیر کو دے دیا (اب فقیر کا کیا حال ہوا وہ تو پتا نہیں چلا) خود تو وہ بیمار تھے۔ ان کا دل ہی نہیں چاہا کھانے کو، ایک گلاس دودھ پی کر انہوں نے نیند کی گولی کھائی اور سو گئے۔ بیٹے جب واپس آئے تو انہوں نے باپ کو سوتے ہوئے پایا۔

ہلا جلا کر دیکھا وہ تو نیند کی گولیوں کے زیر اثر گہری نیند میں تھے، بس بیٹے سمجھے کہ باپ نے وہ کھانا کھا لیا۔

انہوں نے شور مچا دیا کہ ابا مر گئے اور آناً فاناً تدفین کا بندوبست کر دیا گیا لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ جب نیند کی گولیاں کا اثر ختم ہوا تو وہ ہوش میں آ گئے اور چلانے لگے اور پھر وہی ہوا جو میں بتا چکا ہوں۔

دو دن بعد وہ ٹھیک ہو گئے تو سب سے پہلے وہ مکان انہوں نے مسجد کے نام کر دیا اور بیٹوں سے لاتعلقی کا اعلان کر کے خود مسجد میں رہنے لگے۔ ہم سب یہ سن کر حیران رہ گئے کہ انسان کتنا خود غرض اور بے حس ہے کہ وہ اپنے اتنے محترم رشتوں کو بھی بھول جاتا ہے اور دولت کے لیے کسی بھی حد تک گر جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ان باتوں سے دور رکھے (آمین)۔

دوسرے دن جب میں نے ارشد اور دوسرے دوستوں کو یہ واقعہ سنایا تو سب افسوس کرنے لگے اور مجھے بھی سراہا کہ میری وجہ سے ایک شخص کی زندگی بچ گئی۔ ارشد میرے گلے لگ گیا۔

''یار تُو تو واقعی بڑا جی دار ہے۔'' اور میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ اللہ نے میرے ہاتھوں ایک اچھا کام کروایا تھا۔ میں اس پر اللہ تعالیٰ کا مشکور تھا۔

☆☆☆

دسویں سچ بیانی

روشنی والا رستہ

رئیسہ خالد

اُس دوشیزہ کی ثابت قدمی کی داستان، جس نے کفر کے اندھیرے میں بھی روشنی والا رستہ پالیا تھا

شہر کے مین بس ٹرمینل پر دہلی سے آنے والی ایک بس آکر رکی۔ اس سے ایک جوڑا اترا۔ نوجوان خوش شکل مگر چالاک نظر آرہا تھا۔ لڑکی کی عمر بیس بائیس سال کے درمیان تھی۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ سادہ شلوار قمیض اور دوپٹے میں بہت اچھی لگ رہی تھی اور کسی اچھی فیملی سے لگ رہی تھی۔ رات کے نو بجے تھے۔ ٹرمینل پر خاصی چہل پہل تھی۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے تھے۔ لڑکا چوکنا اور لڑکی تھوڑی گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اس شہر میں غالباً دونوں نو وارد تھے۔ رات گزار کر لڑکی کا ارادہ تھا کہ وہ تھانے جا کر اپنا بیان لکھوا دے گی۔ لڑکی کے پاس ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں چند جوڑے کپڑے تھے لیکن لڑکے کے پاس ایک بڑا بیگ تھا۔

لڑکے نے کہا۔ ''آج رات کسی ہوٹل میں ٹھہرا جائے۔ رات میں ہم فیصلہ کرلیں گے کہ صبح کہاں جایا جائے اور کیا کیا جائے۔''

لڑکے نے ایک ڈبل بیڈ روم کرائے پر لیا اس پر لڑکی نے اعتراض کیا اس کا کہنا تھا کہ ابھی ہمارا نکاح نہیں ہوا اس لیے ہمیں الگ الگ رہنا چاہیے۔

لڑکے کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ ویسے بھی بہت چالاک مگر بزدل نظر آرہا تھا۔ اس کی نیت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کو لڑکی کی بات پسند نہیں آئی مگر خاموش رہا۔

صبح ہوتے ہی جب لڑکی تھانے جانے کو تیار ہوئی تو اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمہارا باپ ایک طاقت ور آدمی ہے اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں وہ ہم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہتر ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔ میں شاید اب تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔''

لڑکی اب ایک بڑی پریشانی میں تھی لیکن وہ اسے ہوٹل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکی نے ہمت نہیں ہاری اس کے گھر کا ایک ڈرائیور جو مسلمان تھا اس نے اس کو فون کیا۔ اس کا ڈرائیور اس راز سے واقف تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے پسند بھی کرتا تھا۔

☆......☆

شردھا دہلی کے ہندو سیٹھ کی اکلوتی بیٹی تھی جو بہت منت مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ دونوں کی اس میں جان تھی۔ ایک بڑے پوش علاقے میں کئی کنال پر بنی اس کی کوٹھی تھی۔ چار پانچ گاڑیاں ہر وقت دروازے پر کھڑی رہتیں۔ شردھا کے لیے اس کے باپ



نے بہت قیمتی گاڑی اس کی سالگرہ پر خرید کر دی تھی۔ جس کا ڈرائیور مسلمان تھا گو وہ کار چلانا جانتی تھی لیکن اس کا باپ کبھی اسے تنہا گاڑی چلانے نہیں دیتا تھا۔ گاڑی کے ساتھ گارڈ ہر وقت ساتھ ہوتا۔ اس کی گاڑی کا ڈرائیور مسلمان تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ والدین بہت غریب تھے اس لیے اس نے انٹر سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ کافی کوشش کے بعد بھی جب کوئی اچھی جاب نہ ملی تو وہ سیٹھ موتی لال کے یہاں ڈرائیور بن گیا۔ وہ مکینک کا کام بھی جانتا تھا۔ اس لیے سیٹھ نے اسے نوکری دے دی تھی۔ وہ کئی سالوں سے ان کے یہاں ملازم تھا۔ شردھا کے ساتھ اس لڑکے کے تعلقات کا بھی اسے پتا تھا۔

پڑوس کی ایک مسلمان فیملی سے بچپن سے شردھا کی دوستی تھی۔ ان دونوں ایک ہی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ اس کے والد ایک بڑے سرکاری افسر تھے دونوں خاندان کا آپس میں کوئی میل جول نہ تھا۔ ان کا بھی وہاں اپنا ذاتی گھر تھا۔ کالج بھی ایک ہی رہا۔ اب یہ دونوں یونیورسٹی میں آچکی تھیں اور ان کی دوستی پہلے کی طرح اب تک برقرار تھی اگرچہ شردھا کے والدین مسلم لڑکی شیما سے اس کی دوستی کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ کٹر ہندو تھے۔ ان کے یہاں لہسن، پیاز تک نہیں کھایا جاتا تھا۔ گھر کے اندر ایک مندر بھی تھا لیکن شردھا نے کبھی اپنے مذہب میں دلچسپی نہیں لی۔ اسے مسلمانوں کے طور طریقے اور ان کا مذہب بہت پسند تھا۔ وہ چپکے چپکے شیما سے بہت سی باتیں سیکھتی رہتی تھی۔

شردھا نے گھر سے نکلتے ہی سیٹھ کو فون کر دیا تھا کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر آئی ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں جائے گی۔ پولیس کی پوچھ گچھ پر اس نے یہی بیان دیا کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ آئی ہے۔ وہ پڑھی لکھی ہے اور بالغ ہے۔ اب وہ مسلمان ہو چکی ہے اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔ میرے گھر سے نکلنے میں کسی کا ہاتھ نہیں ہے۔ پھر بھی اس کے باپ نے ڈرائیور فیاض کے نام سے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی

تھی۔ کیونکہ اس کا شک ڈرائیور فیاض پر ہی تھا۔ شردھا نے پولیس کو بتایا کہ میرا باپ میری شادی کسی ہندو سے کرنا چاہتا ہے جب کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔ وہ میری شادی کسی مسلمان سے ہرگز نہیں ہونے دے گا اس لیے میں نے گھر چھوڑا ہے۔ اس کے لیے کسی کو ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ اب میں واپس گھر نہیں جانا چاہتی اگر میں واپس جاؤں گی تو شاید میرا باپ مجھے اپنا بھی لے لیکن وہ میری شادی ہندو سے ہی کرے گا جب کہ میں اب مسلمان ہو چکی ہوں۔ پھر بھی وہ میری شادی کسی مسلمان سے نہیں ہونے دے گا۔

شردھا کا باپ تھانے پہنچ چکا تھا اور شردھا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ہندو ہوں اور اپنی بیٹی کو بھی ہندو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ایک بار اس سے ملوا دیں۔ لڑکی بالغ ہے، عاقل ہے وہ بیان دے چکی ہے کہ تمہارے جیسے بے جا کے خلاف گھر سے نکلی ہے۔ اس کے خلاف اغوا کا پرچہ کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔ کل صبح لڑکی کو عدالت میں پیش کیا جائے گا آپ کو جو کچھ کہنا ہے عدالت میں کہیں یہ ایک مذہبی منافرت کا غیر معمولی کیس ہے۔''

''میں ہندو ہوں اور اپنی بیٹی کو بھی ہندو ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ عدالت میں جانے سے میری رسوائی ہوگی اور وہ بھی اپنی بیٹی کو اپنے خلاف عدالت کے کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر...... پلیز اس معاملے کو یہیں رفع دفع کرنے کی کوشش کریں اسے ایک بار بلائیں تو میرے سامنے میں اسے منا لوں گا۔''

''وہ پولیس کی حفاظتی تحویل میں ہے اس کا کہنا ہے کہ اسے آپ کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔''

''جھوٹ بالکل جھوٹ کوئی باپ بھلا اپنی اکلوتی بیٹی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟''

سیٹھ بے چارگی سے تھانیدار کا منہ تکنے لگا۔

''سر پلیز ایک بار مجھے میری بیٹی سے ملوا دیں۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔''

''اب عدالت میں ملنا اس سے اس سے پہلے یہ ممکن نہیں۔''

☆.....☆.....☆

فیاض نے اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا تھا وہ لوگ اسے اس پھڈے میں ٹانگ پھنسانے سے منع کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تو اس بنیے سیٹھ کو نہیں جانتا کہ وہ کتنا خبیث آدمی ہے تجھے کبھی نہیں بخشے گا۔ ویسے بھی اس کا شک تجھ پر ہی ہے حالانکہ تو بے قصور ہے۔''

''مجھے پھنسانے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔ میں اس معصوم لڑکی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

شردھا کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس کا باپ بھی داد فریاد کے لیے عدالت میں پہنچا ہوا تھا۔ فیاض کو عدالت میں موجود دیکھ کر وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

''دیکھوں گا تجھے فیاض یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔''

''ارے صاحب جتنا دیکھنا ہے آج ہی دیکھ لو پھر موقع ملے نہ ملے۔''

''پہلے شردھا سے تو نمٹ لوں پھر تجھ سے نمٹوں گا۔''

مقدمہ شروع ہوا۔ سیٹھ خم ٹھونک کر مقابلے کے لیے آ گیا۔ شردھا کو دوبارہ گھر لانا اس کے لیے موت اور زندگی کا سوال بن گیا تھا۔ اس نے عدالت میں اپنی طرف سے ایک ایسے وکیل کو کھڑا کیا جس نے شاید بھی کوئی مقدمہ نہیں ہارا لیکن اس کی بھی ہر تدبیر کا نتیجہ اس کی توقع کے خلاف نکلا۔ وکیل منہ مانگی فیس لینے کے بعد بھی اسے کیس جیتنے کی خوشی نہ دے سکا۔

شردھا کے ساتھ فیاض تھا اور اس کے ساتھ فیاض کا ایک دوست شمیم تھا۔ مقدمہ چلتا رہا۔

شردھا کے کہنے پر اسے دارالامان میں رکھا گیا کیونکہ اس کے باپ کی طرف سے دونوں کو دھمکیاں مل رہی تھیں۔

شروع شروع میں تو شردھا وہاں پریشان رہی۔ اس جگہ کا ماحول گھر کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ اسے حامد بھی یاد آتا جس نے اسے گھر سے نکال کر راستے میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ ورنہ وہ اسے اس طرح بیچ راستے میں چھوڑ کر نہ بھاگتا۔ وہ تو

فیاض اسے مل گیا جو اس کے گھر کا ڈیا ئیور تھا۔ ورنہ آج وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی ہوتی۔ دارالامان میں ہر لڑکی کی ایسی ہی ایک کہانی تھی اور لڑکیوں کی اکثریت دکھی اور معاشرے کی ستائی ہوئی تھی۔

سینتھ کی بد قسمتی کہ عدالت کی کرسی پر بھی وہ منصف بیٹھا تھا جس کی دیانت داری کی شہرت عام تھی۔

شروع شروع میں تو وہ بہت خائف تھی۔ اسٹاف سارا کا سارا مسلمان تھا۔ کچھ ہندو اور کرسچین لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک نو مسلم لڑکی عائشہ بھی تھی جس نے ایک مسلمان سے شادی کرنے کے بعد ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے خاندان والے اس کے اور اس کے شوہر کے جان کے در پے تھے۔ ان کے خوف سے وہ عدالت کے ذریعے دارالامان میں پناہ لیے ہوئی تھی اور شوہر بھی جان کے خوف سے اِدھر اُدھر چھپتا پھر رہا تھا لیکن اس کے رابطے میں تھا۔

شردھا کا خیال تھا کہ ادارے سے مسلمان افراد اس سے متعصبانہ رویہ روا رکھیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف ان کے ہمدردانہ رویے کے باعث ختم ہوتا گیا۔

شردھا تو پہلے ہی اپنی کلاس فیلو شیما سے بہت کچھ اسلام کے بارے میں جان چکی تھی۔ بلکہ نماز پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا اور چپکے چپکے روزے بھی رکھتی تھی جس کی خبر اس کے گھر والوں کو نہیں تھی۔ اب یہاں وہ ایک صاحب سے قرآن کا درس بھی لینے لگی تھی۔ شردھا کا سفر تاریکی سے روشنی کی طرف تیزی سے جاری تھا۔

اللہ تعالیٰ جس بندے پر اپنا کرم کرتا ہے، جس کو راہ ہدایت دکھانا چاہتا ہے اس کے لیے اپنا در اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہی دین کامل ہے۔ شردھا پر رب کی رحمت ہو گئی تھی۔ اس کا مقدمہ اب تک عدالت میں زیر سماعت تھا۔ فیاض اس سے ملاقات کے لیے آتا رہتا تھا۔ اسے اب شردھا پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

ایک دن عائشہ کہنے لگی۔ ''فیاض اچھا لڑکا لگتا ہے۔ تمہارے لیے مخلص بھی ہے۔ تمہارا بہت ساتھ دے رہا ہے۔''

''جی بالکل جو ہمارا برے وقت میں ساتھ دے اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات کا مطلب۔''

''تمہارا مطلب ہے فیاض۔''

''ہاں میرا یہی مطلب ہے۔'' عائشہ نے کہا۔ ایک دانش ور گزرا ہے خلیل جبران وہ کہتا ہے۔ ''میں ان لوگوں کو بھول گیا جو میرے ساتھ کبھی ہنسے تھے لیکن انہیں ہمیشہ یاد رکھتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ آنسو بہائے۔''

وہ عائشہ کے کہنے کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ فیاض کے علاوہ اور کوئی بھی تو اس کی مدد نہیں کر رہا تھا۔ شردھا نے بھی ایک جگہ پڑھا تھا۔ ''میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے برے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے۔''

مقدمہ کی سماعت شردھا کو بے زار کیے دے رہی تھی۔ جن مقدمات کا فیصلہ چند ساعتوں میں ممکن ہے وہ برسوں چلتے رہتے ہیں۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی رہتی ہے اور مختلف وجوہات کی بنا پر تاخیر ہوتی جاتی ہے۔

آخر ایک دن فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا اور وہ مقدمہ جیت گئے۔ پھر اسی دارالامان میں فیاض اور شردھا کا نکاح ہوا۔ جب شردھا گھر سے نکلی تھی تو اس کے پرسنل اکاؤنٹ میں تقریباً چار پانچ لاکھ روپے تھے لیکن اس نے نکاح کے فوراً بعد ساری رقم اپنے باپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دی۔ گھر سے بھی وہ کوئی قیمتی سامان لے کر نہیں نکلی تھی۔ انہوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کی۔ انہوں نے ایک کمرے کا مکان کرائے پر لے کر رہنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک وہ ٹیوشن پڑھاتی کیونکہ فیاض کی آمدنی سے تو گھر نہیں چل سکتا تھا۔ وہ چاہتی تو کوئی نوکری کر سکتی تھی کیونکہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی لیکن اس نے گھر پر رہ کر ٹیوشن پڑھانا بہتر سمجھا۔ اب تو ان کی شادی کو کافی سال ہو گئے۔ ان کے دو بچے بھی ہیں لیکن اس نے پلٹ کر کبھی پیچھے نہیں دیکھا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ محنت کر کے اس نے اپنے بچوں کو بھی اچھی تعلیم دی ہے اور ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہ اس نے بہتر راستہ اپنایا۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔

☆☆☆

ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط:06

انتقام کی ایک نئی داستان، جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔

برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکہ آرا سلسلہ

اگر میں برق رفتاری سے پیچھے نہ ہٹ جاتی تو میرا چہرہ اور لباس بھیجے کے خون آلود ٹکڑوں سے لتھڑ جاتا۔ بمشکل میں اپنا لباس تباہ ہونے سے بچا سکی تھی۔





دیو قامت شخص نے سر کے اشارے سے ان پر دو چار بار سے لیے اور ساکت ہو گیا۔ میں نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور مجھے سامنے والے لیمپ پوسٹ کے نیچے ایک شخص نظر آیا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی براہ راست اس کے چہرے پر پڑی۔ اور میں بری طرح اچھل پڑی۔

وہی مقامی باشندہ وہی مکروہ چہرہ جس کے سامنے کے خرگوش نما دانت اس کے نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے۔ اس نے اپنا نام اونیو بتایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی ایر گن نما گن دبی ہوئی تھی اور اس نے دیو قامت پر اس گن سے دو فائر کیے تھے۔ جس کی وجہ سے میری زندگی بچ گئی تھی۔ ورنہ لگتا تھا کہ دیو قامت کو مجھے جان سے مار دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔

مگر یہ شخص......

اچانک میں نے اسے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ایک موٹر بائیک کی طرف بڑھا۔ اس پر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ہوا ہو گیا۔

میں کچھ دیر کے لیے ذہنی طور پر معطل ہو گئی۔ او مائی گاڈ۔ دیو قامت مجھے بری طرح دبوچے ہوئے تھا۔ جن گولیوں نے اس کا چہرہ اڑا دیا تھا وہ صرف آدھے انچ اِدھر اُدھر لگ جاتیں تو میں گئی تھی۔ لیکن کتنے اعتماد سے اس نے دونوں فائر کیے تھے۔

اچانک اس عمارت کے کچھ حصے روشن ہوئے جس میں ڈاکٹر لیونسکی قیدی تھا۔ اور مجھے شدید خطرہ محسوس ہوا۔ اس خوف سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دیو قامت قتل ہو چکا تھا اور اس کے قریب صرف میں تھی۔ ایک لمحے کے اندر اس کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو سکتی تھی۔

بھاگو۔ میرے اندر سے آواز ابھری۔ اور میں وہاں سے فرار ہو گئی۔ کافی پیدل چلنا پڑا تھا تب کہیں جا کر ایک ٹیکسی ملی جس نے مجھے میرے ہوٹل پہنچا دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر جیسے میرے پورے بدن کی جان نکل گئی۔ کم بخت دیو قامت نے جس طرح میری گردن دبائی تھی اس کے اثرات ابھی تک میرے اعصاب کشیدہ کیے ہوئے تھے۔ اُف کس قدر ہیبت ناک انسان تھا۔

لیکن اونیو۔ یہ کون ہے؟ کتنا عجیب کردار ہے۔ اس نے مجھے ہی بچانے کے لیے دیو قامت کو ہلاک کیا تھا۔ لیکن کیوں؟ اور وہ وہاں کہاں سے آ پہنچا تھا۔ کیا میرے لیے...... اس کا مطلب ہے وہ میری نقل و حرکت پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا تھا۔ کیوں؟

اور دوسری بات۔ ڈاکٹر لیونسکی نے کھل کر بتا دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا۔ بلکہ اسے اس کے بیوی بچوں کے معاملے میں بلیک میل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹا ان کے قبضے میں ہے۔ اور اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ دونوں اپنی جگہ موجود تھے۔ میں ان سے مل کر آئی تھی۔ البتہ اب احساس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کی بیوی کے رویے میں کوئی خاص بات تھی۔ کیا؟ اس کا تجزیہ نہیں ہو رہا تھا۔

اُف۔ میں نے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سوچیں، سوچیں، مسلسل سوچیں، ڈاکٹر لیونسکی شائریکا جیسے بڑے اور طاقتور ملک کا مفرور سائنسدان ہے۔ اور کھل کر لائی چن سے اظہار وفاداری کر رہا ہے۔ اسے تو بڑی حفاظت سے 70 تالوں میں رکھنا چاہیے۔ نہ کہ ایسی جگہ جہاں اس تک اتنی آسانی سے رسائی ہو سکے۔ میں اگر شائریکا کی کوئی خاص ایجنٹ ہوتی اور جیسا کہ مجھے بھی یہ کہا گیا تھا کہ اگر لیونسکی کی آسانی سے واپسی نہ ہو سکے تو اسے ختم کر دیا جائے۔ میری اس سے جس آسانی سے ملاقات ہو گئی تھی وہ ناقابل یقین تھی۔ میں اسے قتل کر کے واپس آ سکتی تھی۔

اور پھر۔ اونیو۔

کسی کھڑکی سے روشنی کی ایک کرن نے جھانکا تو میں چونک پڑی۔ یہ کس نے روشنی ماری ہے۔ باہر سے کچھ آہٹیں سنائی دیں تو میں اپنی جگہ سے اٹھ آئی اور پھر خود پر خوب ہنسی۔ کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ میں ساری رات جاگتی رہی تھی۔ خود کو

تروتازہ ہوئے اور رات بھر کی تھکن دور کرنے کے لیے میں غسل خانے میں جا گھسی۔ خوب دیر تک غسل کیا تو رات سے تھکن کسی گندے لباس کی طرح اتر گئی۔ پھر لباس تبدیل کر کے خود کو ہلکا سا سنوارا اور پھر نیچے ہال میں آ گئی۔ جہاں میں نے اپنے لیے ناشتا طلب کر لیا۔

ناشتا کرتے کرتے میری نظر ہال کے دروازے کی طرف اُٹھ گئی۔ اور میرا بدن سنسنا کر رہ گیا۔ میں نے اس شخص کو پہچان لیا جو مجھے ڈاکٹر کے قید خانے میں ملا تھا اور دیو قامت کا ساتھی تھا۔ وہ شاید ابھی ہال میں داخل ہوا تھا۔ اور اس طرح نظریں دوڑا رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پھر اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میں نے اس کا چہرہ سرخ ہوتا محسوس کیا۔ وہ کچھ لمحے اپنی جگہ سوچتا رہا۔ پھر رک کر قدم میری طرف چل پڑے۔

بڑی ہمت والا تھا بھرے پرے ہوٹل میں وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے اپنی عادت کی مطابق نرم لہجے سے کہا۔ ''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں میڈم۔''

''ضرور۔'' میں نے بھی اس خوش اخلاقی سے کہا۔ اور وہ بیٹھ گیا۔

''آپ ناشتہ کریں گے۔ کیا منگواؤں آپ کے لیے۔''

''آپ نے مجھے پہچان لیا میڈم ایلسی۔''

''ارے واہ۔ آپ کو تو میرا نام بھی معلوم ہے۔ آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کے لیے کیا منگواؤں۔''

''میں ناشتا نہیں کرتا۔ ہاں اگر آپ کا خون پی سکا تو ضرور پیوں گا۔ آپ نے میرے ایک قیمتی ساتھی کا خون کر دیا ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا لیکن کم بخت کا لہجہ اتنا ہی نرم اور پرسکون تھا۔ جتنا پہلے ہوتا تھا۔

''ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق میرا خون سخت زہریلا ہے۔ اسے پی کر انسان بچ نہیں سکتا۔'' میں نے بے خوفی سے ہنس کر کہا۔ وہ شدید غصے سے مجھے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

''تم سے گفتگو کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ کیا تم کسی جگہ مجھے تنہائی دے سکتی ہو۔''

''اوپر میرا کمرہ موجود ہے۔ پرسکون اور آرام دہ۔'' میں نے فوراً کہا۔

''ہم وہاں چل سکتے ہیں؟''

''میں نے اس لیے تمہیں اس کا حوالہ دیا ہے۔''

''نمبر کیا ہے تمہارے کمرے کا۔''

''کیوں؟''

''ہم الگ الگ وہاں چلیں گے تاکہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکیں۔''

''او کے۔'' میں نے کہا۔ پھر بولی۔ ''میں چلتی ہوں تم دو منٹ کے بعد آ جانا۔'' اس نے گردن ہلا دی۔ پھر میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے بعد پھرتی سے لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ گئی۔ کوریڈور عبور کر کے میں اپنے کمرے کے سامنے پہنچی۔ دروازے کا لاک کھولا اور اندر داخل ہونے کے بجائے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ تنہا ہے یا اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہیں۔

لفٹ سامنے ہی تھی۔ چنانچہ میں نے لفٹ اور زینوں پر نگاہ رکھی۔ چند منٹ کے بعد وہ لفٹ سے باہر نکلا۔ میں اس کی حرکات و سکنات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ تنہا ہی ہے۔ پھر بھی میں انتظار کرنے لگی۔ وہ کمروں کے نمبروں پر نگاہ ڈالتا میرے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے شریف آدمیوں کی طرح میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اور میں ستون کی آڑ سے باہر نکل آئی۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔

''آیئے۔'' میں نے کہا۔ اور آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ مجھ سے پہلے کمرے میں داخل ہو گیا پھر میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

''پلیز۔'' میں نے میزبانوں باتوں کے انداز میں اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر مجھے گھورنے لگا۔

''جی۔ فرمائیے۔ کیا کہنا ہے آپ کو۔''

''تم کون ہو۔''

''اگلا سوال؟'' میں نے کہا۔

''تم ہیمر لیونسکی کی سیکریٹری نہیں ہوسکتیں۔''

''اگلا سوال۔'' میں نے غرا کر کہا۔

''تم ضرور حکومت شائریکا کے کسی خفیہ محکمہ کی ایجنٹ ہو۔ کوئی سیکریٹری اتنی اسمارٹ، اتنی خطرناک نہیں ہوسکتی۔ تم نے ایک ایسے آدمی کو ہلاک کردیا جو دس افراد پر بھاری تھا۔''

''ٹھیک۔ آگے؟'' میں نے کہا۔

''میری زندگی موت کے دہانے پر کھڑی کردی ہے تم نے۔ ڈاکٹر کی حفاظت کے لیے مجھ پر بھروسہ کیا گیا تھا۔ میں ناکام رہا ہوں۔''

''کیا؟ کیا ڈاکٹر غائب ہوگیا۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن اسے وہاں سے ہٹادیا گیا ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے بارے میں مکمل تحقیقات کر کے رپورٹ دوں کہ تم کون ہو۔''

''اوہ گڈ۔ تو تم مجھ سے یہ پوچھنے آئے ہو کہ میں کون ہوں۔''

''اور اسمارٹ بن رہی ہو لیکن زندگی کے آخری لمحات گزار رہی ہو۔ بتاؤ کون ہو تم؟'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ خالی تھے۔ قہقہہ لگانے کو دل چاہا۔ وہ مجھ پر تشدد کر کے میرے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

لیکن اس وقت میری اداکاری مار کھا گئی۔ میں نے اپنی جنگی مہارت پر غرور کیا تھا۔ اور اسے کچھ نہیں گردانا تھا۔ لیکن اس نے اس قدر برق رفتاری سے میرے پیٹ پر لات ماری کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور پھر یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہوں گی کہ اس دنیا میں مردوں کی صرف ایک ہی قسم نہیں ہوتی۔ سارے عورت پرست نہیں ہوتے۔ جن میں یہ کم بخت تھا۔ جوتے کی نوک پر لوہے کا خول تھا۔ نا جانے میں کون کون سی نسوانی صفات سے محروم ہوگئی ہوں گی۔ میں بری طرح فرش پر گری۔ اس نے ساتھ ہی مجھ پر چھلانگ لگادی۔

ہرچند کہ پیٹ پر پڑنے والی لات نے میرے چودہ طبق روشن کردیے تھے لیکن میری کوئی رگ بھی یقیناً خراب ہے۔ سخت درد کے باوجود میں نے زمین پر پڑے پڑے پاؤں اٹھا کر اس کی گردن پر سوٹن لگایا۔ سوٹن اتنی خطرناک ضرب ہے کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور اس نے کرب کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑلیا۔

میں کھڑی ہوگئی۔ سب سے پہلے میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھر اس کی طرف پلٹی۔ اس کے چہرے پر کرب اور آنکھوں میں حیرت نظر آرہی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ مجھ جیسی بظاہر نرم و نازک لڑکی ایسی خوف ناک ضرب لگاسکتی ہے۔ میرے پیٹ میں اب بھی تکلیف تھی لیکن مجھے غصہ بھی آگیا تھا۔ میں تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔

''اور اب تم بتاؤ گے کہ تمہیں کس نے میرے پیچھے لگایا ہے۔ ڈاکٹر لیونسکی نے خود شائریکا چھوڑا ہے یا اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اسے اتنی غیر محفوظ جگہ کیوں رکھا گیا ہے۔ جہاں کوئی بھی آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ ان تمام سوالات کے جواب تمہیں دینا ہوں گے۔''

اس کے چہرے پر سخت ہیجان نظر آرہا تھا لیکن وہ اس قدر بزدل نکلے گا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے چشم زدن میں کوئی چیز جیب سے نکال کر منہ میں رکھ لی۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے سوچا۔

دوسرے لمحے میرے دماغ میں بجلی سی کوندگئی۔ زہر۔ او مائی گاڈ۔ یہ بہت خوفناک عمل تھا۔ ایک انسان کی موت کا نہیں بلکہ میرے لیے عذاب کا۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھی اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ کر کھولا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ اس قابل ہی نہیں رہا تھا۔ کٹی ہوئی شاخ کی طرح گرا اور مر گیا۔

اسے مرنے میں بمشکل چھ سیکنڈ لگے تھے۔ یہ برق رفتاری "سائنائڈ" ہی کی ہوسکتی تھی۔ اس نے دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک زہر استعمال کر لیا تھا۔

میں اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ سچی بات ہے کہ اس وقت میرے آہنی اعصاب بھی میرا ساتھ نہیں دے سکے اور میں بستر پر جا بیٹھی۔ بس پھر اندھیرے میں چلی گئی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ پیٹ میں جہاں لوہے کی نوک والے بوٹ کی ٹھوکر پڑی تھی، سخت درد ہو رہا تھا۔

دیر تک اس حالت میں پڑی رہی۔ پھر اُٹھ کر واش روم میں داخل ہوگئی اور شاور کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ بہت دیر تک میں شاور کے نیچے کھڑی درد، دھوتی رہی، پھر لباس پہن کر باہر نکل آئی۔ درد کم ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ دو لڑکیوں کی تصویریں، لانڈری کا بل، نوے ہانگ کانگ ڈالر یہ اس کا اثاثہ تھا۔ البتہ غور سے دیکھنے پر لڑکیوں کی ایک تصویر کے پیچھے لکھا تھا۔

بیس۔ وکٹوریہ کسیل۔

"بیس وکٹوریہ کسیل۔ شاید اسی لڑکی کا پتا ہو جس کی یہ تصویر ہے۔ میرے خیال میں یہ کام کی چیز تھی۔ میں نے اس شخص کی لاش کی طرف دیکھا۔ مرنے کا شوق تھا۔ مر گیا۔ مگر اب اس کی لاش کا کیا کروں۔ کسی بھی وقت ویٹر کمرے کا دروازہ بجا سکتا تھا۔

ابھی انھیں سوچوں میں تھی کہ میرے خاص سیل پر اشارہ موصول ہوا۔ اور میں خوشی سے اچھل پڑی۔ پاپا کی کال تھی۔ اس وقت یہ کال میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ دل کو ایک عجیب سی ڈھارس بندھی۔ میں نے آن کر کے لرزتی آواز میں کہا۔

"ہیلو پاپا۔"

"ہیلو میری جان کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں پاپا، کام جاری ہے، بہت سے کھیل ہو رہے ہیں۔"

"ایک کھیل کے بارے میں شاید تمھیں معلوم نہیں ہے۔"

"کیا پاپا۔"

"آخر کار ڈاکٹر ہیمر کے بعد اس کی بیوی کو بھی شائریکا سے غائب کر دیا گیا۔"

"ایں؟" میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں۔ اس کے بارے میں جو رپورٹیں ہیں وہ یہ ہیں کہ پرسلا لیونسکی اور اس کے بیٹے کو ایک فلائٹ سے ہانگ کانگ روانہ ہوتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے کاغذات مکمل تھے۔ لیکن اس کے گھر سے روانہ ہونے کی رپورٹ یہ ہے کہ وہ دو آدمیوں کے ساتھ کار میں گئے تھے اور پھر واپس نہیں لوٹے۔ ائیر پورٹ پر چیک کیا گیا تو پتا چلا دو آدمی ایک عورت اور ایک لڑکا ایک فلائٹ سے ہانگ کانگ گئے ہیں۔ لیکن ان کے نام اور کاغذات جعلی ناموں سے تھے۔

"اس کا مطلب ہے پاپا کہ عورت اپنی مرضی سے گئی تھی۔"

"شاید ایسا ہو۔"

"میرے خیال میں ایسا ہی ہے۔"

"اوہ۔ کیوں تم اتنے اعتماد سے کہہ رہی ہو۔"

"میں اس سے مل چکی پاپا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"مجھے وہ مشکوک لگی تھی۔ اور اس کا بیٹا بھی۔ مطلب یہ کہ بچے کو بریف کر دیا گیا تھا کہ اسے کیا بولنا ہے۔"

"ہوں۔ تم بتاؤ تم نے کیا کیا ہے۔ کچھ کام ہوا یا نہیں۔"

"نہیں پاپا۔ مجھے ہر قدم ایک تاریک گلی میں لے جا رہا ہے۔ سراغ کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔"

"کیا تم کسی طور پر صرف ایک کام کر سکتی ہو۔"

"کیا پاپا۔"

"جس طرح بھی بن پڑے تم ڈاکٹر ہیمر کو اس جگہ سے نکال لاؤ۔"

"اس کی بیوی اور لڑکے کی زندگی کے عوض؟" میں نے طنزیہ کیا۔

"اونہیں۔ انھیں کچھ نہیں ہوگا۔ انھوں نے ہیمر کو دھمکانے کے لیے یہ حربہ اختیار کیا ہے۔" پاپا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ پاپا کی اس بات سے مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"نہیں پاپا ہو سکتا ہے آپ کا خیال ٹھیک ہو۔ لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ میرے خیال میں یہ خود کو مشکلات سے بچانے کی کوشش ہوگی۔ میں ایک کام کو جلد کرنے کے لیے بے گناہ زندگیوں کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔"

"نہیں بے بی۔ یہ صرف ایک اطلاع، ایک مشورہ تھا۔"

"تھینک یو پاپا۔ لیکن ایک سوال میں نے اب تک نہیں کیا آپ سے۔"

"بولو۔"

"پاپا! اس قسم کی معلومات کا ذریعہ کیا ہوتا ہے آپ کے پاس۔"

"ہاں مجھے حیرت تھی کہ آج تک تم نے یہ سوال کیوں نہیں کیا۔"

"بتائیے۔"

"میں اور وانچی دنیا کو بہت مشکل حالات میں دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے ہولناک اثرات نے دنیا کو آج تک اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے۔ معصوم اور پرسکون ہوتا ہے لیکن انسانوں نے اس سے سکون اطمینان چھین لیا ہے۔ ہم نے سوچی آرگنیو میں ایک شعبہ معلومات کا بھی رکھا ہے۔ ذہین ترین نوجوان منتخب کیے ہیں جنھیں بہترین معاوضے دیے جاتے ہیں اور وہ ہمیں ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔"

دفعتاً میرے ذہن سے چھناکا ہوا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "پاپا"

"جی جان۔"

"کیا ایک بار پھر میں آپ سے اللہ دین کے بارے میں بات کر سکتی ہوں؟" میں نے سوال کیا تو مسٹر سارترے کچھ لمحات کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر بولے۔

"سوچی آرگنیو بلاشبہ ایک نیک مقصد کے لیے پوری نیک نیتی سے کام کر رہا ہے۔ اس طرح کمپارٹو کے مقاصد میں بھی کھوٹ نہیں ہے اور بے بی ان دونوں اداروں کے روح رواں ہم تینوں ہیں۔ باقی سب ہمارے مددگار ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم تینوں ایک دوسرے سے کبھی کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس طرح دوسرے کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات ہمارے منشور میں شامل ہے۔"

"اس پراسرار کردار نے آج بھی مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے کہ آخر وہ کون ہے۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ بالکل نہیں ہے۔ ہم اسے آج تک ٹریس نہیں کر سکے۔ کیا تمھیں میری بات پر یقین آیا۔"

"سو فیصدی پاپا۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"کیا وہ تمہیں دوبارہ ملا۔"

"نہیں پاپا۔"

"ہو سکتا ہے کبھی ملے۔" پاپا نے کہا۔ اور میرے دل میں ایک کسک سی بیدار ہو گئی۔ پاپا کے ان جملوں نے ایک عجیب سا تاثر پیدا کیا تھا۔

"اوکے پاپا۔ اجازت۔"

"اوکے بے بی۔ اپنا خیال رکھنا۔" رابطہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس پر ایک عجیب سی الجھن طاری ہو گئی تھی۔ کیا ہی مزے کی بات تھی۔ میرا قیام ایک مصروف ہوٹل میں تھا اور میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی جسے ٹھکانے لگانے کی کوئی تجویز میرے ذہن میں نہیں تھی اور اب۔ ڈاکٹر ہیمر کے بیوی بچوں کا معاملہ بھی میرے سر آ پڑا تھا۔

ویسے میں جینئس ہوں۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ بلاوجہ سر پر ایک عذاب طاری کرنے کے بجائے میں نے سب سے آسان طریقہ اختیار کیا ہے۔ احتیاط سے لاش کو گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئی اور سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیا۔ نشانات کی احتیاط برت کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد شور بلند ہوا تو باہر نکل کر لوگوں میں شامل ہو گئی۔ سارے گاہک اور ویٹر جمع تھے اور مختلف باتیں کر رہے تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ اس شخص کا پاؤں پھسل گیا ہو گا کوئی کہہ رہا تھا کہ اس نے زیادہ نشہ استعمال کر لیا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ پھر پولیس آ گئی اور معمول کی کارروائی کے بعد لاش اٹھا کر لے گئی۔

اس کے بعد سوچ کے دائرے پھیل اور سکڑنے لگے۔ وہ دونوں افراد زندگی سے محروم ہو گئے تھے جو اس مکان میں ڈاکٹر لیونسکی کے خلاف تھے۔ اب وہاں کون ہو گا۔ نئے لوگ یا ڈاکٹر کو وہاں سے ہٹا دیا گیا ہو گا۔ دوسرا اہم خیال میرے دل میں یہ تھا کہ خود ڈاکٹر کو یہ بات معلوم ہے یا نہیں کہ اس کے بیوی بچے کو شائر یکا سے لے آیا گیا ہے یا نہیں۔

بہت غور و خوض کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس مکان میں جا کر ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔ لیکن اس بار زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔ مختصر تیاریاں کرنے کے بعد باہر نکلی۔ پھر بالکل اتفاقیہ طور پر میرا رخ بندرگاہ کی طرف ہو گیا۔ کوئی خاص بات ذہن میں نہیں تھی بس ادھر کا منظر ذرا مختلف محسوس ہوا تھا اس لیے اس طرف نکل آئی تھی۔ میں وہاں کے نظارے دیکھتی رہی لیکن پھر میں بری طرح اچھل پڑی۔ میری نگاہ ایک چھوٹے سے مال بردار جہاز پر پڑی تھی جس پر واضح الفاظ میں وکٹوریہ کیسل لکھا تھا۔

وکٹوریہ کیسل۔ اس نام کا ایک کارڈ اس شخص کی جیب سے نکلا تھا جس نے سائنا نڈ کھا کر خودکشی کی تھی۔ اس جہاز سے میری دلچسپی بے پناہ بڑھ گئی۔ ضرور اس جہاز کی کوئی خاص اہمیت ہے۔ میں اس کی اہمیت کا کوئی تعین نہیں کر سکی تھی لیکن میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بڑی اہم چیز ہے۔ لمحوں کے اندر میں نے ایک فیصلہ کیا اور اس طرف بڑھ گئی۔ جہاں کشتیوں کی ایک لمبی قطار نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیسی کشتیاں تھیں اور کس کی ملکیت تھیں۔ میں نے یہ جاننا ضروری نہیں سمجھا۔ ان میں سے ایک مضبوط سی کشتی کے پاس پہنچی اور اس پر چڑھ گئی۔ جب کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا تو میں نے چپو اٹھا لیا۔ خاموشی سے اسے کشتیوں کی قطار سے نکالا اور آگے بڑھ گئی۔ کشتی مدھم رفتار سے آگے بڑھتی گئی اور میں نے اسے جہاز کے قریب سے لے گئی۔ میں نے جہاز کے گرد ایک چکر لگایا۔ عرشہ خالی تھا۔ باقی جہاز بھی خالی محسوس ہو رہا تھا لگتا تھا جیسے کوئی نفس اس پر نہ ہو۔

لیکن پھر کچھ تبدیلی ہوئی۔ میرا خیال غلط ثابت ہو گیا۔ ایک شخص عرشہ کی ریلنگ کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ کسرتی بدن کا مالک شخص تھا اور چہرے ہی سے بہت چالاک اور شاطر معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کے سامنے سے گزر گئی میں نے محسوس کیا تھا کہ اس شخص نے سرسری نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اب مجھ پر اس جہاز پر جانے اور اسے اندر سے دیکھنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے کشتی کا رخ موڑ دیا اور جہاز سے دور نکل گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مڑ کر جہاز کی طرف آئی تو دیکھا کہ عرشہ پر اس شخص کے ساتھ کوئی عورت بھی کھڑی ہے۔ دور سے اس عورت کے

نقوش نہیں نظر آ رہے تھے۔ میں پھر وہاں سے آگے نکل گئی۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ جہاز پر جانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ جہاز کہیں روزانہ نہ ہو جائے۔ اس لیے اس طرف سے غفلت نہیں برت سکتی تھی۔ میں نے کشتی دور جگہ لے جا کر ساحل سے لگا دی اور اتر کر عمارتوں کی طرف چل پڑی۔ وہاں دو تین بار اور ریستوران تھے لیکن سب جہازوں کے افسروں اور بندرگاہ کے اسٹاف سے بھرے پڑے تھے۔ ایک بھی میز خالی نہیں تھی۔

میں نے ایک ریستوران سے سینڈوچ، ابلے ہوئے انڈے، آلو کے قتلے اور بیئر کی بوتل خریدی اور دور جا کر پام کے جھنڈ تلے جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ دو خلاص ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ادھر سے گزرے۔ اور مجھے دیکھ کر رک گئے۔ ان میں ایک یورپین اور دوسرا ایشیائی تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے مجھے دیکھتے رہے۔

ایک دم میرے دل میں نفرت سی جاگی۔ کیا شے ہوتے ہیں یہ انسان۔ کیا کہوں۔ لیکن ان دونوں کے لیے دل میں نہ جانے کیوں کراہیت ابھری اور میں ان کی پٹائی کے بارے میں سوچنے لگی۔ البتہ میں نے کھانا نہیں چھوڑا تھا۔ چند منٹ تک وہ اپنی جگہ کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے میری طرف قدم بڑھائے اور میں نے دانت بھینچ کر آہستہ سے کہا۔ ''آؤ۔''

''تم فری ہو؟'' یورپین نے بتیسی نکال کر کہا۔

''فی الحال تو کھانے میں مصروف ہوں۔''

''کھانے کے بعد تو فری ہو نا۔'' اس بار ایشیائی نے کہا۔

''کوئی کام ہے مجھ سے۔'' میں نے لگاوٹ سے کہا۔ اور دونوں بھونڈے انداز میں ہنسنے لگے۔ پھر ایشیائی بولا۔

''ہاں۔ دنیا کا سب سے ضروری کام ہے جسے تم جانتی ہو۔''

''جیب میں کچھ ہے؟'' میں نے پورے اطمینان سے کھاتے ہوئے کہا۔

''بہت کچھ ہے۔'' یورپین جیب تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''تم کس جہاز میں ہو۔''

''ایڈ سویتا میں۔''

''دونوں ایک ساتھ بولے۔''

''ہاں۔'' ایشیائی نے کہا اور پھر میں نے کہا۔

''مگر میں نے تمھیں اس جہاز سے اترتے ہوئے دیکھا ہے''

''کس سے۔''

''وہ۔ وہ دور دیکھو۔ شاید اس پر وکٹوریہ کیسل لکھا ہے۔'' میں نے اشارہ کیا اور وہ نظریں دوڑانے لگے۔ پھر یورپین بولا۔

''ارے نہیں۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔''

''پتا نہیں وہ جہاز کہاں کا ہے اور اس پر کتنے آدمی ہیں۔''

''ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''تم میرا ایک کام کر سکتے ہو۔ مطلب تم میں سے کوئی۔''

''کیا کام ہے؟''

''اس کے بارے میں معلوم کر کے آؤ۔ کوئی ایک چلا جائے اور دوسرا میرے ساتھ رہے۔ دونوں تو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' میں نے اٹھلا کر کہا اور دونوں خوشی سے کھل اٹھے۔

''تم جاؤ۔'' یورپین نے ایشیائی سے کہا۔
''نہیں۔ تم جاؤ۔'' ایشیائی بولا۔
''جھگڑتے کیوں ہو۔ ٹاس کرلو۔'' میں نے مزے سے جوس پیتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' یورپین نے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''لیکن تم یہ کیوں معلوم کرنا چاہتی ہو۔ وکٹوریہ سے تمھیں کیا دلچسپی ہے۔''
''اس پر ایک عورت ہے۔ اس عورت کے بارے میں، میں جاننا چاہتی ہوں اور یہ بھی کہ اس کا کپتان کون ہے۔ اور اس میں کتنے آدمی ہیں۔ اس عورت سے میری ایک پرانی دشمنی ہے۔ لیکن سنو۔ اس کا شبہ کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔''
''تم بے فکر رہو۔ یہ بہت چالاک آدمی ہے۔ ایک طرح سے ہوشیار جاسوس۔ آرام سے ساری باتیں معلوم کر کے آئے گا۔'' یورپین نے کہا۔
''یہ سفید نسل کے چوہے آج تک خود کو ضرورت سے زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں۔ ٹاس کرو ٹاس۔'' ایشیائی نے جیب سے سکہ نکال کر اچھالا۔ سکہ زمین پر گرا اور ایشیائی جیت گیا۔ اس نے مسکرا کر یورپین سے کہا۔
''چلو اپنا کام کرو۔''
یورپین منہ بنا کر چلا گیا۔ اور ایشیائی میرے پاس آ بیٹھا۔ میں نے بیئر کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی اور اس نے تین چار بڑے بڑے گھونٹ لے کر بوتل واپس کر دی۔
''تمہارا نام کیا ہے...... یہیں رہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں۔ میرا نام یوجین ہے اور میں یہیں رہتی ہوں۔''
''بہت پیاری ہو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا۔ چلیں؟'' وہ بولا۔
''جگہ بھی تلاش کی ہے۔'' میں نے پوچھا۔
''یہ بری جگہ ہے کیا؟'' وہ بے حیائی سے ہنسا اور پام کے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔
''او کے۔'' میں فوراً کھڑی ہوئی اور جھنڈ کی طرف بڑھی لیکن وہ بڑی نامناسب جگہ تھی چنانچہ میں آگے بڑھ گئی۔ یہاں سے کوئی دو سو گز دور سیمنٹ کا ایک بڑا سا زیر زمین پانی کے نکاس کا گٹر پائپ نظر آیا۔ میں اس کے قریب جا کر رک گئی۔
وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔
''کیسی جگہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''اے ون۔'' اس نے مسرت سے بے قابو ہو کر کہا۔
''چلو۔ اندر چلو۔'' میں نے کہا۔
وہ جونہی اندر جانے کے لیے جھکا، میں نے کراٹے کا ایک ہاتھ اس کی گردن پر مارا اور پیچھے ہٹ کر ایک لات اس کی کمر پر رسید کی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا ماتھا پائپ کی سطح سے ٹکرایا، خون کی دھار نکلی تھی اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔
میں نے پاؤں سے اسے مزید اندر دھکیل دیا اور مطمئن ہو کر ہاتھ جھاڑے۔ پھر میں اس دوسرے کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے دور سے آتے ہوئے دیکھا اور پائپ سے کچھ قدم دور ہٹ آئی۔ وہ قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کے دونوں پاؤں دیکھے اور بولا۔
''ارے اسے کیا ہو گیا۔''
''سو گیا ہے کم بخت۔'' میں نے کہا۔
''کیوں؟ کیا ہو گیا؟''

"پتا نہیں خود دیکھ لو۔" میں نے منہ بنا کر کہا اور وہ اسے دیکھنے کے بجائے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں نکال لوں۔ تاہم میں نے خود کو قابو میں رکھا۔ وہ بولا۔
"الو کا پٹھا اندر بے نشا کرتا ہے۔ اسے نکال کر باہر پھینکو۔" وہ پائپ کی طرف بڑھا تو میں نے پیچھے سے اس کا کالر پکڑ لیا۔
"نشہ اس نے کیا ہے چڑھ تمہیں گئی ہے۔"
"کیوں؟" وہ حیرت سے بولا۔
"کس کام کے لیے گئے تھے تم۔" میں غصے سے بولی۔
"ارے ہاں وہ تم اتنی خوب صورت ہو کہ تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔
"لیہ پار کرلو۔ ورنہ......"
"وہ پرائیویٹ مال بردار جہاز ہے۔ مالک کا پتا نہیں کپتان کا نام وانگ ہو ہے۔ جہاز کے عملے میں کل تین آدمی ہیں۔ سب ملا کر کل چار ہیں جن میں ایک عورت ہے اس کا نام نہیں معلوم لیکن شائز یکن معلوم ہوتی ہے۔ یہ جہاز آج ہی رات یہاں سے روانہ ہونے والا ہے اور اس کتے کی ٹانگیں گھسیٹ کر باہر پھینکو۔" آخری جملے اس نے غصے سے اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے کہے تھے۔
مجھے اس کے انداز سے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ کام تم خود کرو۔"
"ہاں میں یہی کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ اور میں تیار ہو گئی۔ جونہی اس نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑیں، میں نے اچھل کر ایک ٹھوکر اس کی کمر پر جما دی۔ اس کے حلق سے ایک تیز چیخ نکلی اور اس کا سر پائپ کے اوپری حصے سے ٹکرایا۔ وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ دو تین ضربوں نے اس کا تیا پانچہ کر دیا اور وہ بے ہوش ہو کر اپنے ساتھی پر گر پڑا۔ میں نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی دوسری اطراف میں چاروں طرف کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا چنانچہ میں اطمینان سے واپس چل پڑی۔
میرا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ چنانچہ میں اس طرف بڑھ گئی۔ ہوٹل کے گیٹ کے پاس پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ میں ٹھٹک گئی لیکن ہوٹل میں داخل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میں اندر چل پڑی۔ میرا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ اسی بارے میں تحقیقات ہو رہی تھی۔ پولیس افسر نے کئی لوگوں کو اکٹھا کر رکھا تھا لیکن اس وقت میں تھوڑی سی ابھی جب ہوٹل کے ایک ویٹر نے دور سے ہی میری طرف اشارہ کیا اور پولیس افسر میری طرف دیکھنے لگا۔ یہ چند قدم طے کرتے ہوئے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے۔
"ہیلو۔" پولیس افسر نے بڑی شرافت سے کہا۔
"ہیلو سر۔" میں بھی اسی انداز سے بولی۔
"آپ کا نام میڈم؟"
میں نے اسے اپنا نام بتایا اور ان کاغذات کے حوالے سے بتایا جو میرے پاس موجود تھے۔ یہاں آنے کی وجہ سیاحت بتائی۔ پولیس افسر نے کہا۔
"یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ویٹر کا کہنا ہے کہ اس نے مقتول کو آپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ بظاہر اس شخص کی موت سیڑھیوں سے گرنے سے ہوئی ہے لیکن اصل میں اسے ایک خطرناک زہر سے مارا گیا ہے۔"
"سوری میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"
"یہ شخص آپ کے کمرے میں آیا تھا۔"
"آیا نہیں تھا۔ بس اس نے دروازہ ناک کیا میں نے سمجھا ویٹر ہے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا میں نے ویٹر سمجھ کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ یہ اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ پھر اس نے کہا کہ کیا یہ سوزی وانگ کا کمرہ نہیں

ہے۔ میں نے انکار کر دیا تو وہ معذرت کر کے واپس مڑ گیا۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔"
"آپ کو یہ علم نہیں ہوا کہ یہ سیڑھیوں سے گر کر مر چکا ہے۔"
"بالکل نہیں۔"
"کیا نام پوچھا تھا اس نے۔"
"سوزی وانگ۔" میں نے جواب دیا۔ اس نام کو اس نے نوٹ کیا پھر میرا شکریہ ادا کر کے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔
میں اپنے کمرے میں آ گئی جو کہانی میں نے لمحوں میں تیار کر کے آفیسر کو سنائی تھی وہ اس قدر جامع تھی کہ آفیسر کو کسی قسم کا شک کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا جب کہ میرے دماغ میں مختلف فلمیں چل رہی تھیں۔ وکٹوریہ کیسل بہت سے رازوں کی بنیاد تھا۔ ویسے ان دو خلاصیوں کی درگت پر مجھے ہنسی آ جاتی تھی۔ بے چاروں کی حسرتیں دل میں رہ گئیں۔ ویسے بھی بے حد مکروہ تھے۔
میں نے اپنے ذہن کو پھر وکٹوریہ کیسل کی طرف موڑ دیا۔ وہ آج رات روانہ ہو جائے گا لیکن اس کے روانہ ہونے سے پہلے مجھے اس پر بہت کام کرنا تھا۔ چنانچہ جس وقت کو میں نے اس مشن کے لیے تعین کیا تھا اس وقت میں بھرپور تیار ہو کر باہر نکل آئی۔
دن کی روشنی میں، میں نے بندرگاہ کے علاقے کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا۔ یہاں چھوٹی بڑی کشتیاں ادھر اُدھر کھڑی نظر آ جاتی تھیں۔ بے شک ان کے مالکان ضرور ہوتے ہوں گے لیکن یہاں ان کشتیوں کو کوئی خطرہ نہ ہوتا ہوگا۔ اس لیے وہ آسانی سے انہیں کسی بھی جگہ چھوڑ دیتے ہوں گے۔
مجھے ایک ڈونگی نظر آ گئی اور میں نے اسے اپنی ملکیت تصور کر لیا۔ میں نے اس پر قبضہ کیا اور چھوٹے چھوٹے چپو چلاتی ہوئی جہاز کی طرف چل پڑی۔ رات تاریک تھی لیکن میں بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنا سفر کر رہی تھی۔ براہ راست وکٹوریہ کیسل تک پہنچنے کے بجائے میں نے لمبا سفر اختیار کیا اور گھوم کر جہاز تک پہنچی۔ مشکل مرحلے حل کرنا میری فطرت ہے۔ جہاز پر اوپر چڑھنا کس قدر مشکل کام تھا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اتنی ہی مشکل پیش آئی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح لنگر کی موٹی زنجیر کے سہارے اوپر پہنچ گئی۔
عرشہ خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس جہاز کے لوگ نیچے کیبن میں ہیں۔ میں احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ اس وقت گوشت بھننے کی خوشبو آئی۔ وہاں کھانا تیار ہو رہا ہے۔ میں زینے طے کر کے نیچے پہنچی۔ میرے دائیں ہاتھ پر دو دروازے اور بائیں پر ایک تھا۔ ان سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے بائیں ہاتھ کا دروازہ کھولا۔ اندر تاریکی تھی ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور مدھم روشنی والی خصوصی پھول نما ٹارچ جلائی۔ یہ جہاز کا مال خانہ تھا۔ بوریوں اور کنستروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ لکڑی کے بڑے بڑے صندوق تھے۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں جو میرے لیے بے کار تھیں۔ اب دوسرے کیبنوں کا معاملہ تھا لیکن اس کے لیے انتظار کرنا تھا۔
انہی چیزوں کے درمیان جگہ بنا کر میں بیٹھ گئی۔ ادھر اُدھر سرسراہٹیں سنائی دے رہی تھیں جن کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ چوہے ہیں۔ مجھے شدید کراہیت ہونے لگی۔ چوہوں کی تعداد کافی تھی، کئی بار وہ میرے پیروں پر بھی چڑھے اور میں نے انہیں جھٹک دیا۔ ان چوہوں سے بچنے کے لیے میں نے کسی اونچی جگہ بیٹھنے کے بارے میں سوچا اور پھر لکڑی کا ایک صندوق منتخب کر کے اس پر چڑھ گئی۔
لیکن صندوق کی لکڑی خستہ تھی۔ وہ نیچے بیٹھ گئی اور مجھے سنبھلنا پڑا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی صندوق میں ڈالی تو میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ صندوق میں اسٹین گنیں، شاٹ گنیں اور کارتوس کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسرے صندوقوں میں بھی اسلحہ بھرا ہوگا۔ لازمی طور پر یہ اسلحہ اسمگل کیا جا رہا تھا۔
دوسرے صندوق دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اگلے اقدامات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ دروازے کے

دوسری طرف آہٹ سنائی دی بعد میں جلدی سے ایک صندوق کی آڑ میں بیٹھ گئی لیکن مجھے خود بھی احساس تھا کہ صندوق اتنا اونچا نہیں ہے کہ میں بالکل چھپ جاؤں۔ میرا سر دیکھا جا سکتا تھا۔

پھر کوئی کیبن میں داخل ہوا۔ چٹ کی آواز ہوئی اور کیبن روشن ہو گیا۔ وہی ہوا مجھے دیکھ لیا گیا۔ ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''اٹھ جاؤ لیکن عقل کے استعمال کے ساتھ۔ تم اسٹین گنوں کی زد پر ہو ذرا سی غلط حرکت کی اور......''

آواز میں بے حد سفا کی تھی۔ پھر کوئی اور بھی اندر آ گیا۔

''سنا نہیں تم نے۔'' اس بار آواز میں خوفناک گرج تھی۔ اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کہ میں کھڑی ہو جاؤں۔ چنانچہ میں کھڑی ہو گئی۔

لیکن کھڑے ہوتے ہی میرے ذہن کو جو جھٹکا لگا وہ بہت شدید تھا۔ ایک پستہ قامت مقامی شخص کے ساتھ جو عورت کھڑی تھی وہ پریسلا لیونسکی تھی۔ ڈاکٹر ہیمر کی بیوی پریسلا۔

اس وقت جب میں نے پہلی بار وکٹوریہ کیسل کے عرشے کو دور سے دیکھا اور اس پر ایک مرد کے ساتھ مجھے ایک عورت نظر آئی تھی تو دور سے مجھے اس کے چہرے کے نقوش نہیں نظر آئے تھے لیکن اس وقت بھی جونہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کہیں یہ پریسلا نہ ہو۔

لیکن اس وقت میں اسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھی۔ دوسری طرف پریسلا نے مجھے دیکھا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ارے واہ...... تم...... میری جان...... مجھے تمہاری کس قدر تلاش تھی تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' پریسلا لیونسکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ کھڑے لمبے چوڑے آدمی نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔

''کون ہے یہ؟''

''پیارے لیونسکی کی محبوبہ۔ ایلسی براؤن۔''

''کیا مطلب۔'' وہ بولا۔

''کوئی مطلب نہیں وانگ۔ یہ میرا شکار ہے۔''

''شکار؟''

''ہاں۔''

''لیکن یہ جہاز پر کیسے آ گئی؟''

''یہ ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ اتنی ہی خطرناک ہے۔''

''تلاشی لو اس کی۔'' وانگ بولا۔ وہی کپتان تھا جس کے بارے میں وہ بہت سا معلومات حاصل کر کے میرے پاس آیا تھا۔

''تم اس کی فکر مت کرو، اس کی تلاشی تو میں لوں گی۔'' پریسلا نے کہا۔

''یہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔'' وہ بولا۔

''بکواس مت کرو، میں جانتی ہوں اسے دیکھ کر تمہاری رال ٹپک رہی ہے لیکن......'' پریسلا نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ ہنسنے لگا۔ ''جاؤ! دروازے پر رکو۔ وہ پھر بولی اور کپتان وانگ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ تب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''سارے کپڑے اتار دو۔''

''کیوں؟ تم اس طرح بھی میری تلاشی لے سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''جلدی کرو، ورنہ میں وانگ کو بلاتی ہوں۔ وہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی اور خوشی سے سرانجام دے لے گا۔'' وہ غرا کر بولی۔

''پلیز میری بات سنو۔'' میں نے لجاجت سے کہا لیکن اس دوران میں پچویشن بنا چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ پیچھے کر

کے قمیض کی زپ کھولنے کا انداز اختیار کیا اور اس کی توجہ اس طرف ہوئی لیکن دوسرے لمحے میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر پڑی اور اس کے حلق سے چیخ نکلنے لگی لیکن میں نے بجلی کی طرح کوند کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر دبا دیا اور چیخ حلق میں واپس اتار دی۔ ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے پوری قوت سے موڑ دیا۔ پھر غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''میرے لیے تمہاری گردن کی ہڈی توڑ کر تمہیں ختم کر دینا مشکل نہیں ہے۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو چیخنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیا کہتی ہو؟''

اس نے زور زور سے گردن ہلائی اور میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ انتہائی تکلیف سے بولی۔ ''میرا پاؤں چھوڑ دو پلیز۔''

میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میرا بازو توڑ دیا۔ لیکن تم...... تم ایسی ہو نا؟''

''تم شاید وقت ضائع کرنا چاہتی ہو لیکن بے فکر رہو، وانگ اندر آئے گا تو تمہیں زندہ نہیں پائے گا۔'' میں نے غرا کر کہا اور دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے پھر چیخنے کی کوشش کی تو میرا اٹھا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور اس کی گردن کو زوردار جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی خون کی لکیر اس کی باچھوں سے نکل پڑی۔

''تم...... تم جو کر رہی ہو...... اس کا......'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔

''میں نے ابھی کچھ نہیں کیا لیکن اب میں انتظار نہیں کر سکتی۔''

''سنو میری بات سنو۔'' وہ خون تھوکتی ہوئی بولی۔

''وہی تو میں سننا چاہتی ہوں ڈیئر پریسلا۔'' میں نے کہا۔

''تم ڈاکٹر ہیمر کو پولیس شائریکا کے جانے آئی ہو نا؟''

''ہاں۔''

''ایسا تم کبھی نہیں کر سکو گی سوائے اس کے کہ اپنی جان کھو بیٹھو۔ تم نے شاید یہاں آ کر کئی افراد ہلاک کر دیئے ہیں۔ انہیں تمہارے بارے میں یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی خطرناک ہو اور اب تمہارے ڈیتھ وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔''

''ڈیتھ وارنٹ؟'' میں ہنس پڑی۔

''ہاں یہ کہ تمہیں جہاں دیکھا جائے ہلاک کر دیا جائے لیکن میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔''

''میرے لیے......''

''ہاں۔''

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم یہاں ڈاکٹر کے پاس بدستور اپنی خدمات انجام دینا چاہو تو تمہارے سارے قصور معاف کر دیئے جائیں گے۔ تمہیں یہاں کی شہریت دے دی جائے گی کیونکہ تم ڈاکٹر کے سارے کاموں سے واقف ہو۔''

''میرے صرف ایک سوال کا جواب دو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بولو، آہ...... میرا ہاتھ......'' وہ کراہ کر بولی۔

''تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ تم ڈاکٹر سے غداری کیوں کر رہی ہو؟''

''میں ان فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں دوں گی کبھی نہیں دوں گی۔ اور تم...... تمہارے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ڈاکٹر کی سیکریٹری نہیں داشتہ ہو اور...... اور میری جگہ لینا چاہتی ہو سمجھیں۔ تم کبھی......''

اس نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ باہر سے آواز آئی۔

''پریسلا کیا تم اپنے کام سے فارغ ہو گئی ہو۔'' وانگ کی آواز تھی۔

''وہ کتا تمہاری قربت کے لیے مرا جا رہا ہے۔ بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑ کھانے کا نہیں۔ مجھ سے جاسوسی کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اس سے بچاؤ۔'' وہ بولی۔

''اسے بلالو۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''بکواس کر رہی ہو۔ اسے جانتی نہیں ہو۔ وہ انسان نہیں ہے۔''

''بلالو اسے۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' پریسلا عجیب سے لہجے میں بولی اور اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' میں نے دل میں سوچا اور پھر خود ہی بلند آواز میں بولی۔

''وانگ۔ تم آسکتے ہو۔''

''میں کہتی ہوں۔'' پریسلا نے مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی وقت وانگ اندر داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی۔ اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر شکایتی لہجے میں پریسلا سے کہا۔

''تم نے اسے کپڑے بھی واپس پہنا دیئے۔ میرا انتظار بھی نہیں کیا۔''

میرا خیال تھا پریسلا میرے بارے میں زہر اگلے گی لیکن مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب اس نے کہا۔

''نہیں اس کے پاس سے کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اسے جانے دو۔''

''یہ جہاز پر کیوں آئی تھی؟''

''شاید چوری کرنے۔ اس کے پاس رقم ختم ہوگئی ہے۔''

''اوہ بے چاری لڑکی یہ تو بھرپور مدد کے قابل ہے۔ چلو ٹھیک ہے تم آرام کرو، میں اس کی مدد کردوں۔'' وہ شیطانی لہجے میں بولا۔

''میری بات سنو، میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتی ہوں۔'' پریسلا بولی۔

''وہ بعد میں سن لوں گا جلدی کیا ہے۔'' وانگ شریری مسکراہٹ سے بولا۔

میں دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظریں حریصانہ انداز مین میرے بدن کا طواف کر رہی تھیں۔

''پریسلا کی آنکھوں میں صاف رقابت نظر آرہی تھی۔ اسے شاید ڈاکٹر کی نسبت ہوتی اس کے اس بھیڑیے سے زیادہ الفت تھی اور اس کہانی کا رخ شاید کچھ اور تھا لیکن یہ بھی لگتا تھا کہ وہ اس پر حاوی نہیں ہے کیونکہ وانگ نے کس قدر کرخت لہجے میں کہا۔

''تم کہاں کھو گئیں؟''

''کہیں بھی...... کہیں بھی نہیں۔''

''چلو آرام کرو، میں اسے دیکھتا ہوں۔'' وہ پھر بولا اور پریسلا خاموشی سے کیبن سے باہر نکل گئی۔ تب وانگ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''چلو باہر نکلو۔'' یہ کہہ کر اس نے شاٹ گن سے اشارہ کیا اور میں خاموشی سے باہر نکل آئی۔

''اس طرف'' اس نے مجھے دوسرا حکم دیا اور میں نے اس کے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ وہ مجھے زینے کے پاس لے گیا۔ پھر نیچے اترنے کے لیے کہا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم انجن روم کے قریب پہنچ گئے۔

''یہاں کھڑی ہو جاؤ۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ مجھے بتاؤ کون ہو تم اور میری بات سنو خوب صورت لڑکیوں سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔ میں تمہیں معاف بھی کرسکتا ہوں اور یہاں سے جانے کا موقع بھی دے سکتا ہوں اور دوسری صورت میں......'' اس نے شاٹ گن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے دھمکی دی۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں ڈاکٹر ہیمر کی سیکریٹری ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

''صرف سیکریٹری اتنی اسمارٹ اور نڈر نہیں ہوسکتی۔''

میں نے فوراً موڈ بدل لیا اور ہنس کر بولی۔ ''بس اتنی سی بات، کیا سیکریٹری اسمارٹ اور نڈر نہیں ہوسکتی؟''

''تب یہ بڑی بات ہے تم مجھے پسند آئی ہو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی سخت سلوک نہیں کروں گا۔ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔''

''تم مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہو؟''

''تم مجھے پسند ہو۔'' وہ بولا۔

''اوہ یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے او کے۔'' میں نے ادا سے کہا اور وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا تو میں نے دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ تم میری کیا مدد کرو گے؟''

''تمہیں حفاظت سے تمہارے وطن بھجوا دوں گا۔ یہاں ہانگ کانگ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ اور جو تم چاہو۔''

''اس گروہ میں تمہاری پوزیشن کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے سوالات سے گریز کرو اور وقت ضائع نہ کرو۔ وہ انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی۔'' اس نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا اور میں ہنس دی۔

''ٹھیک ہے جناب۔'' میں نے محبوبانہ انداز میں کہا اور پھر اس نے شاٹ گن بائلر کے ساتھ کھڑی کی اور میرے بالکل قریب آگیا۔ دوسرے لمحے میں نے اپنا دائیں گھٹنا اس کے پیٹ میں مارا اور اس کے حلق سے ''اوہ'' کی آواز نکلی۔ میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ سے عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ پیٹ کے نیچے لگنے والی چوٹ کچھ زیادہ ہی زور سے لگ گئی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگا کر اسے نیچے گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہوگئی۔ میری اسٹیل کی انگلیاں اس کی گردن میں دھنسی جارہی تھیں اور اس کے بدن میں تھرتھراہٹ ہورہی تھی۔

''ہاں پیارے وانگ اب مجھے میرے کچھ سوالات کے جواب دو۔''

''میں تمہیں سارے سوالات کے جواب دوں گی جان من چلو اسے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوجاؤ۔ ورنہ ایک لمحے میں تمہاری کھوپڑی اڑ جائے گی۔''

یہ آواز پریسلا کی تھی جو شاٹ گن لیے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے بھی کچھ خلاص نظر آرہے تھے جن کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ مجبوراً مجھے وانگ کے اوپر سے ہٹنا پڑا۔ میرے ہٹتے ہی وانگ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اس کی حالت کافی خراب تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی جارہی تھیں اور وہ جھوم رہا تھا۔

''تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے وانگ۔'' پریسلا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں اسے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلاؤں گا۔'' وانگ نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

''شکر کرو میں آگئی۔ ورنہ اب تک یہ تمہیں موت کی نیند سلا چکی ہوتی۔ تمہیں واقعی تمہاری ہوس کی ایسی ہی سزا ملنی چاہیے تھی۔''

وانگ سے بولا بھی نہیں جارہا تھا ورنہ وہ کوئی جواب ضرور دیتا۔

''باندھ دو اسے۔'' پریسلا نے خلاصیوں سے کہا۔

(اینی پارک...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔

اس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

نظرو کی گھر والی



ارم ناز

عزت دار معاشرے کا آئینہ ’ایک زہر بجھا نشتر‘ جو زہر قاتل بھی ہے

نظرو کی گھر والی نے سال بچھے سات لڑکے جنے۔ کوئی ایک لڑکا بھی کمزور نہ تھا، گدگدے نرم نرم گل گوتھنے سے سات لڑکے خود نظرو کی گھر والی بھی کوئی کمزور نہ تھی۔ سات بچوں کی ماں تو کہیں سے دکھائی نہ دیتی تھی۔ پلنگ پر بیٹھی گوشت کا ڈھیر دکھائی دیتی تھی۔ گھر والی کے آرام کے لیے نظرو نے ایک لونڈی کام کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ گھر والی تو صرف بچوں کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ جھاڑو برتن کھانا پکانا تو لونڈی کرتی تھی۔

نظرو پیشے کے اعتبار سے قصائی تھا۔ چرب زبان تھا۔ اس لیے دکان بہت چلتی تھی۔ جو عورت بھی دکان پر گوشت لینے آتی پندرہ منٹ تو ضرور بات کرتا۔ کمبخت ہر موضوع پر بات کرلیتا تھا۔ بڑی معلومات تھیں۔ قصائی سے زیادہ صحافی معلوم ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر وقت دکان پر عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا اور قصائی دکان پر مکھیاں ہی جھلتے رہ جاتے اور نظرو کی بچھیا پل بھر میں بک جاتی۔

مارکیٹ میں نظرو بڑے غرور سے گھومتا پھرتا تھا اور غرور کیوں نہ کرتا کامیاب قصائی ہونے کے ساتھ ساتھ سات بیٹوں کا باپ جو تھا۔ نظرو اپنی گھر والی کا خاص خیال رکھتا، خشک میوہ، دودھ اور بچھیا کے بہترین حصوں کا گوشت نظرو کی گھر والی کی خوراک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عورت سے زیادہ موٹی تازی گائے نظر آتی۔ لڑکوں کی فوج ایک جیسے کپڑے پہنتی، اسکول سے آکر بچے اتنا شور کرتے کہ خدا کی پناہ۔

نظرو نے پیر سائیں سے موٹے موٹے سات تعویذ ساتوں لڑکوں کے گلوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ کہیں کسی کی ہائے یا نظر نہ لگے۔ نظرو بچوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ اسے اپنا بڑھاپا عیش وعشرت سے کٹتا نظر آتا تھا۔ سات جوان بیٹوں کی کمائی جب نظروں کے ہاتھ آئے گی تو وہ بے تاج بادشاہ ہوگا۔

پاکستانی فلموں کی طرح گاڑی کا پہیہ چلا اور لڑکے جوان ہوگئے۔ نہ صرف جوان ہوگئے بلکہ نظرو نے سب کو مارکیٹ میں ایک ایک دکان کھلوادی البتہ چھوٹا ابھی بڑے بھائی کی ہی دکان پر بیٹھتا۔

جو نظرو کے بیٹوں کو دیکھتا یہی آواز کستا۔

”نظرو نے تازے تازے قصائیوں کی کھیپ مارکیٹ میں اتاردی۔“

☆......☆

نظرو کی گھر والی نے بڑے لڑکے کی نسبت رشتہ داروں کی ایک لڑکی سے ٹھہرادی تھی۔ بڑا لڑکا چوبیس سال کا ہوچکا تھا۔ شادی سال بعد ہونی طے ہوا تھا مگر

مہینہ بھر بعد ہی شادی کی تیاری کرنی پڑی۔ نظرو کا بڑا لڑکا چوبیس سال کی نفسی فاقہ پرستی برداشت نہ کر پایا۔ نظرو کو اس کے چند دوستوں نے کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ نظرو کو لڑکا ہاتھ سے جاتا نظر آیا۔ اس لیے سال بھر بعد ہونے والی شادی اسی مہینے ہونا قرار پائی۔

نظرو کے گھر کی پہلی شادی تھی اس لیے دل کھول کر پیسہ لٹایا گیا۔ یہ ایسی شادی تھی کہ لوگ برسوں یاد رکھیں۔

بہو گھر آ گئی اور بگڑتے ہوئے لڑکے کو سدھار دیا۔ بڑے کی شادی کو سال بھی نہ ہوا تھا کہ چھوٹے کو شادی کا شوق چرایا۔ اس بار نظرو کی گھر والی نے دو لڑکیاں دیکھ کر اکٹھا دو لڑکوں کی شادی کی۔

شادی کیونکہ برادری میں ہی ہوتی تھی اس لیے لڑکیاں ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی اس طرح چھ لڑکے نمٹ گئے باقی بچا چھوٹا والا۔ چھوٹا تو بڑے نخرے والا تھا۔ تمام بھائیوں میں سب سے خوب صورت اور صحت مند تھا کیسے بھرے بھرے بازو تھے آدھی آستین کی بنیان میں تو باڈی بلڈر نظر آتا تھا۔ سرخ سفید رنگ، مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا نظرو کا چھوٹا۔

نظرو کی گھر والی چھوٹے کے لیے بڑی حسین و جمیل حور پری ڈھونڈ رہی تھی۔ بڑے لڑکے کی ساس نے بتایا تھا کہ میر پور میں ان کے ایک رشتے دار ہیں جن کی سات بیٹیاں ہیں۔ وہ بڑی لڑکی کا رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ لڑکی بڑی حسین ہے۔ قصائیوں میں اتنی حسین لڑکی اور کوئی نہیں۔

نظرو کی گھر والی سمدھن کے ساتھ میر پور روانہ ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر لڑکی دیکھی تو وہ ان کی امید پہ پوری اتری۔

سترہ سالہ نیلوفر عرف نیلی نظرو کی گھر والی کو بہت پسند آئی۔ نیلی کے گھر والے غریب تھے اور نیلی کے بعد ان کی چھ بیٹیاں اور تھیں اس لیے لڑکے کو دیکھے بغیر ہاں کر دی اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جہیز کے نام پر ان کے پاس ایک دھیلہ بھی نہیں۔ سچ تو یہ تھا کہ نظرو کی گھر والی



جو سونے کے موٹے موٹے زیورات پہن کر گئی تھی اس سے نیلوفر کے ماں باپ کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ ان زیورات کے ساتھ پہنا بروکیڈ کا مونگیا رنگ کا لشکارے مارتا جوڑا کمال کر گیا تھا۔

اُس دور میں لوٹ مار نہ ہوا کرتی تھی اسی لیے خواتین با آسانی زیور پہن کر گھومتی پھرتی تھیں۔ اب تو ذرا ایک گھر سے دوسرے گھر تک ہی جا کر دکھا دیں۔ بہر حال دو مہینہ بعد کی تاریخ طے پائی۔

☆......☆

چھوٹا کیونکہ سب بھائیوں اور ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ اس لیے تیاری زور و شور سے ہونے لگی۔ سلک بروکیڈ، لیڈی کریب کے شوخ رنگوں کے جوڑے بری کے لیے تیار کیے گئے غرارہ کے دوپٹے پر سلمیٰ ستارے کا کام کروایا گیا۔ چھوٹے نے اپنی دلہن کے لیے خاص طور پر مہین جارجٹ کی سرخ فٹنگ والی جمپر سلوائی۔ گوٹا کناری والا سرخ دوپٹہ اور سلک کا چست پائجامہ۔ بھابیاں دیکھ دیکھ کر من ہی من میں مسکراتی رہیں کہ چھوٹا کیسا شوقین مزاج ہے۔ گھر کا رنگ روغن چھوٹا موٹا کام مکمل کر لیا گیا۔ بارات سے ایک دن پہلے مہندی ہوئی۔ محلہ اور رشتہ دار تمام عورتیں ڈھول لے کر گانے گانے لگیں۔ محلے کی ایک بچی کمال کا ناچی۔

بچی کو دیکھ کر چھوٹے کو بھی جوش آیا کمر میں دوپٹہ باندھ کر کیسا زوردار ناچا، بڑا مزا آیا کیسا موج میلہ لگا تھا آج نظرو کے گھر۔

اگلی صبح بارات نیلوفر کے محلے میں اتری نکاح کے بعد زردہ بریانی کی دیگیں کھل گئیں کیا اشتہا انگیز خوشبو تھی۔ نیلوفر کے ماں باپ نے جہیز تو نہ دیا تھا مگر کھانا بہترین کھلایا تھا۔ صاف صاف بوٹیوں والی باسمتی چاول کی بریانی۔ جس نے کھائی انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ عورتوں نے بدائی گائی اور نیلوفر رخصت ہو کے نظرو کے گھر آ گئی۔

کھیر چٹائی کی رسم کے بعد نیلی کو چھوٹے کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کیا سجا سجایا کمرا تھا۔ غریب نیلوفر نے ایسا کمرا صرف ڈراموں اور فلموں میں دیکھا تھا۔ رنگ و خوشبو میں بسا کمرا بڑی سی مسہری، سامنے سنگھار میز اور اس پر رکھا طرح طرح کا میک اپ، دوسری طرف الماری اور فرش پر بچھا بھورے اور سرخ رنگ کا دبیز ایرانی قالین۔ بڑی بھابی نے نیلوفر کو بتایا کہ یہ کمرا چھوٹے نے خود بڑی محنت سے سجایا ہے۔

بھابی اٹھ کر باہر نکلی تو چھوٹا کمرے میں آ گیا۔ نیلوفر نے دوپٹے کی اوٹ سے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اتنا حسین مرد اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے رشتے داروں میں تو تمام مرد اور نوجوان موٹی توند والے تھے۔ خود اس کے ابا جب کھانا کھانے بیٹھتے تو ان کی اوجھڑی کا ڈھیر دستر خوان پر جگہ گھیر لیتا۔ سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ چھوٹا کھنکھارتا ہوا مسہری پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے نے آگے سرکتے ہوئے نیلوفر کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

”ماشاء اللہ آپ تو بہت خوب صورت ہیں۔ اماں نے آپ کی تعریف بے جا نہ کی تھی۔ آپ اپنے نام کی طرح نازک ہیں۔“

نیلوفر کے دل میں آیا کہ فوراً بدلہ چکا دے، اور کہہ دے کہ آپ بھی بہت خوب صورت ہیں۔ بالکل فلمستار شاہد کی طرح...... مگر لڑکی ہونے کے ناتے حجاب آڑے آ گیا۔ چھوٹے نے نیلوفر کو منہ دکھائی میں سونے کی بھاری جھمکیاں دیں، چھوٹا اٹھ کر چلا گیا کچھ دیر بعد ململ کا کرتا اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہن کر آیا اور مسہری پر لیٹتے ہوئے نیلوفر کو کپڑے بدل کر سونے کی تاکید کرتا ہوا لیٹ گیا۔ نیلوفر کو کپڑے بدلنے اور میک اپ اتارنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ وہ واپس آئی تو چھوٹا خراٹے لے کر سو رہا تھا۔ نیلوفر کے دل میں ہزاروں وسوسوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا مگر وہ یہ سوچتے ہوئے لیٹ گئی کہ میر پور کا سفر کتنی دور کا ہے۔ تھک کر سو گئے ہوں گے۔

اگلے دن ولیمے کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ مہمان میر پور سے آنے تھے اس لیے دو پہر کا ولیمہ رکھا گیا۔ نیلوفر کو سجا بنا کر تیار کر دیا گیا۔ تیاری کے دوران بھابیاں طرح طرح کی باتوں سے نیلوفر کو گدگداتی رہیں۔ نیلوفر بھی آہستہ آہستہ مسکرا کر شرماتی رہی۔ نیلوفر اپنے گھر والوں سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ نیلوفر کا کمرا اس کے کپڑے دیکھ کر اس کی بہنیں دنگ رہ گئیں۔ نیلوفر کی اماں

اس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے سدا سہاگن رہنے کی دعائیں دیتی رہیں۔

نظرو نے بھی بہترین کھانے کا انتظار کیا تھا۔ تقریب اختتام کو پہنچی۔ نیلوفر کی اماں نے نظرو کی گھروالی سے اجازت لیتے ہوئے نیلوفر کو کچھ دنوں کے لیے ساتھ لے جانے کی اجازت لی کیونکہ یہی رواج تھا۔ نظرو کی گھروالی کے بولنے سے پہلے ہی چھوٹا اینٹھ گیا۔

''میں اپنی دلہن کو نہ جانے دوں گا۔''

لوگ سمجھے نئی نویلی دلہن کی محبت میں ایسا کہہ رہا ہے مگر چھوٹے کو ڈر تھا کہ نیلوفر رات کا فسانہ اپنے گھر جا کر نہ کہہ دے۔ نیلوفر کی اماں کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھیں کہنے لگیں۔

''چھوٹے تمہارا جب دل کرے نیلوفر کو ہم سے ملانے لے آنا۔''

یوں بات ٹل گئی۔

چھوٹے کی پریشانی دیکھ کر بھابیاں منہ پر پلو ڈال کر ہنسنے لگیں۔ رات آئی اور پہلی رات کی طرح خاموشی سے گزر گئی۔ اس کے بعد لگاتار پندرہ راتیں گزر گئیں۔ نیلوفر کو یقین ہو چلا تھا کہ جس چھوٹے کو وہ فلمسٹار شاہد سمجھی تھی حقیقت میں وہ شاہدہ تھا۔

نیلوفر پیاسی تھی پیاسی رہی۔ اس کے حصے کا بادل سوکھا تھا اور سوکھے بادل بھلا کب برستے ہیں۔ لب کھولتی تو بقیہ چھ بہنوں کے لیے پریشانی تھی۔ ابھی تو انہیں بھی بیاہنا تھا۔ اگر وہ میکے بیٹھ جاتی تو انہیں کون بیاہتا...... دل میں آتا کہ ساس کو کہے اماں تمہارا چھوٹا تو واقعی چھوٹا ہے۔

ادھر چھوٹے نے کشتے اور مربوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ہری نیلی سفید پڑیاں، نشاستہ، دودھ، تازہ پھل غرض یہ کہ طاقت کی ہر چیز تھی مگر طاقت کا چشمہ ابھی نہ پھوٹا تھا۔ چھوٹے جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے نیم حکیم اور سنیاسی باوا کے مطب چلتے ہیں۔

ہر حربہ آزما لیا تھا یہاں تک کہ چھوٹے کی بنوائی ہوئی جارجٹ کی مہین اور چست جمپر بھی پہن لی اور ہر زاویے سے چھوٹے کے آگے لیٹ بیٹھ گئی مگر چھوٹے کے جذبات تو انٹارکٹیکا کی برف کی طرح ٹھنڈے اور منجمد تھے۔ اب نیلوفر چھوٹے کے رویے سے اکتا گئی تھی۔ چھوٹے کے بڑے بھیا تجربہ کار آدمی تھے وہ معاملے کو بھانپ گئے انہیں تو پہلے دن سے چھوئی موئی جیسی نیلوفر پسند آئی تھی۔ بڑے بھیا کا کردار تو ان کی شادی سے پہلے بھی مشکوک رہا تھا۔ اب بات تھی سترہ سالہ نیلوفر کی تو وہ یہ موقع کیسے ہاتھ سے جانے دیتے۔

بات شروع ہوئی تحفے تحائف سے۔ پھر ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، آخر کار بڑے بھیا نے چھوٹے کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیلوفر کو فتح کر لیا۔

☆......☆

ایک دن بڑے بھیا کچن میں گھسے تو نیلوفر چائے بنا رہی تھی، ہو گئی پھر چھیڑ چھاڑ شروع۔ اچانک کچن کے دروازے پر نیلوفر کی ساس وارد ہو گئیں۔ بڑے بھیا تو زقند لگا کر کچن سے باہر ہو گئے البتہ نیلوفر چوری بنی کھڑی رہی۔

اماں نیلوفر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ نیلوفر نے سوچا معافی تلافی کر کے بڑھیا کو رام کر لیا جائے ابھی نیلوفر نے اتنا ہی کہا تھا۔ ''اماں وہ میں......''

اماں بول پڑیں۔

''نیلوفر تیرا قصور نہیں ہے۔ تیرا نصیب بھی میرے جیسا ہے۔ یہ سات لڑکے جو تو دیکھ رہی ہے...... نظرو ان کا صرف نام کا باپ ہے۔ معاون کار تو نظرو کا چھوٹا بھائی اجو ہے اور نظرو یہ سب جانتا ہے منہ کھولے گا تو اپنی ہی عزت جائے گی۔ زمانے کی نظر میں مرد بنا بیٹھا ہے۔ حقیقت صرف میں جانتی ہوں۔ میں بھی تیرے طرح سوکھی دھرتی تھی۔ بارش کی پیاسی۔ میری زندگی میں اجو نے بارش برسائی۔ نظرو تو سوکھا بادل تھا۔ اسے نہ برسنا تھا نہ برسا تو جو کر رہی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ ہم عورتیں تو کنویں کے مینڈک کی طرح ہیں۔ جتنا اونچا بھی اچھل جائیں مگر کنویں سے باہر نہیں جا سکتیں کیوں نہ کنویں میں رہ کر ہی دل لگی کا سامان پیدا کریں۔ بس ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔'' نیلوفر کھڑی یہ سوچتی رہ گئی نظرو اور اس کی گھروالی کی کہانی پھر سے وقت دہرا رہا ہے۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دوسرا شعلہ

بدمعاش



محمد پرویز احمد دولو

اُس نوجوان کی داستان' جو اپنے بدلے کی آگ بجھانے کے لیے سب سے بڑا بدمعاش بن گیا تھا

آدھی رات کا وقت اور انتہائی پریشانی کا عالم تھا۔ دو مریض زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پڑے تھے۔ نہر کنارے بیچ جنگل میں اچانک جان لیوا افتاد آن پڑی تھی۔ گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ گولی ڈرائیور کے شانے کو چیرتے ہوئے پار ہو گئی تھی۔ گاڑی قابو میں نہ رہی تو لہرا کر درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ ہولناک دھماکہ ہوا اور گاڑی الٹ گئی تھی۔ گاڑی میں سوار لوگ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ عجیب رلا دینے والا منظر تھا۔

مصائب کا دہانہ تو اس وقت کھلا جب نقاب باندھے ڈاکوؤں نے زخمی ڈرائیور کی بے حرمتی کی انتہا کر دی انہیں شدید علالت سے دوچار بوڑھے مریضوں پر بھی ترس نہ آیا۔

لمحوں کی مہمان مریضہ بڑھیا کے کانوں سے پیتل کی بالیاں انتہائی بے دردی سے اتاری گئیں۔ غموں کی گٹھڑی، جوان بیٹی کی عزت کے اثاثے کو مالِ مفت کی طرح لوٹا گیا۔

گاڑی میں سوار لوگوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ گاڑی کے چاروں ٹائروں میں گولیاں مار کر اسے ناکارہ بنا دیا گیا۔

اف! یہ کیسے درندہ صفت لوگ تھے ان بھیڑیا نما انسانوں کو مریضوں پر بھی ترس نہ آیا۔ بیچ جنگل آدھی رات کے وقت بربریت کی انتہا کر دی گئی تھی اور پھر اس مکروہ فعل پر شرمندہ ہونے کی بجائے وہ خوشی سے بڑھکیں مار رہے تھے اور اپنی اس کامیابی پر خوشی سے نہال ہو رہے تھے۔

آج کے کارنامے پر وہ بے حد خوش تھے۔ ایک دیرینہ خواہش کو انہوں نے مکمل کیا تھا۔ آج برسوں پرانا سپنا ان کا شرمندہ تعبیر ہوا تھا۔ اس خوشی نے تو ان کے اندر نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دوسری طرف بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے مریض اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا۔ جب کہ مریضہ لمحوں کی مہمان تھی، کٹے پھٹے کانوں کی تکلیف نے موت سے اس کا فاصلہ گھٹا دیا تھا تو جوان بیٹی عزت کے زیور سے محروم ہو کر زندہ درگور ہو گئی تھی۔ اتنے بڑے ظلم پر آسمان پھٹا نہ زمین پر زلزلہ آیا۔

☆......☆

میاں فیض مجبوروں کی آس، غریبوں کی آواز پر لبیک کہنے والا، دکھ درد، تکلیف میں ساتھ دینے والا، کتنے ہی لوگوں کی امیدوں کا سہارا تھا۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ عزت، دولت، شہرت کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس جاہ وچشم، دولت اور عزت کو وہ غریبوں کی امانت سمجھتا تھا۔ سخاوت سے کتنے ہی دکھوں کے مارے لوگوں کے زخموں پر محبت ومہربانی کے پھاہے رکھتا تھا۔ دور ونزدیک کے کتنے ہی لوگ اس کی دریا دلی کے معترف تھے۔ اپنی مانگ کے کاسے بھرنے کے لیے اس کے در پر حاضری دیتے تھے۔ مانگنے والوں کی فوج ظفر موج دیکھ کر مجال ہے جو اس کی پیشانی پر بل آتا ہو۔

غریبوں کی مدد کر کے اس کو روحانی خوشی ہوتی تھی۔ نیکی کرنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا، کوئی بھی سوالی آج تک اس کے دروازے سے مایوس نہیں لوٹا تھا۔

جوں جوں اپنی دولت کے خزانے حاجت مندوں پر لٹاتا، اللہ تعالیٰ اس کی دولت میں اور اضافہ کر دیتا۔

اس نے صدقہ خیرات یا کسی کی بھی حق یا مدد کرتے وقت سوچ وفکر کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ ہمیشہ اس نیت سے مدد کرتا کہ مجبوروں کی پریشانیاں دور ہوں اور وہ خوش ہو کر مجھ کو دعاؤں کے خزانے دیں، جو میری آخرت کا سامان بنیں۔

کتنے ہی حالات کے مارے لوگوں نے اس کے گاؤں میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ جس بستی میں وہ رہتا تھا اب بہت بڑے گاؤں کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ لوگ اس گاؤں میں آباد ہونا فخر سمجھتے تھے۔ انہیں کتنے ہی مسائل سے نجات مل جاتی تھی۔ ہر شخص امن سکون اور چین سے اس گاؤں میں رہ رہا تھا۔

دریائے راوی کے کنارے شہر سے کافی دور یہ گاؤں آباد تھا۔ بڑی حد تک لوگوں کی ضرورتیں ادھر ہی پوری ہو جاتیں۔

لیکن شہر سے دور ہونے کی وجہ سے بہت سی بنیادی ضرورتوں کا حل یہاں موجود نہ تھا۔ جب بھی



کوئی شدید بیمار ہو جاتا تو اس وقت بہت تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو جاتی۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج تو گاؤں کا حکیم ہی گولیاں اور پھکی دے کر کرتا مگر جس مرض کا علاج اس کی سمجھ میں نہ آتا وہ مریض سنگین صورت حال سے دوچار ہوتا۔

لوگوں کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی۔ ہر بیمار شخص کا بروقت شہر جانا ممکن نہ تھا۔

کچی سڑکیں، سواری کا دستیاب نہ ہونا، شہر میں واقفیت نہ ہونا، کتنے ہی مسائل تھے جن سے نبرد آزما ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔

ایسی مایوس کن صورت حال میں کتنے ہی مریض بروقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔

☆......☆

بشیر بچپن ہی سے بری عادات کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ تھوڑا سا ہوش کی سیڑھی پر قدم رکھا تو پتا چلا کہ دو وقت کی روٹی کے لیے ماں باپ کو بہت پاپڑ بیلنے ہیں۔ صبح سے شام تک محنت مزدوری کرنے سے زندگی کی سانسوں کو جاری و ساری رکھنے کا سامان ملتا۔

ماں گھروں میں کام کرتی، واپسی پر بچا کھچا کھانا لاتی جس سے ماں باپ کے ساتھ بشیر اور بیٹی زینب پیٹ کا دوزخ بھرتی۔ باپ سارا دن نوکری سے پچھاڑ ہونڈتا، گارے سے دیواروں کی لیپا پوتی کرتا تب جا کر گھر کا چولہا گرم ہوتا۔ سب لوگ اپنا پورا زور لگا کر زندگی کی گاڑی کو کھینچنے میں مصروف تھے۔

ماں باپ کی عدم توجہ، غربت کے تھپیڑوں اور ماحول کی بے رحمی نے بشیر کو شرافت کے راستے سے بھٹکا کر آوارہ گرد، سڑک چھاپ اور لفنگوں کے نگر کا باسی بنا دیا تھا۔ دیہاتوں میں ویسے ہی تعلیمی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ وہ تو اسکول کے دروازے سے بھی نہیں گزرا تھا، تعلیم کہاں حاصل کرتا۔ معاشرے کے راندے ہوئے ناسوروں نے اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے اس کی اپنی مرضی سے تربیت کے فرائض سرانجام دیئے۔ توجہ سے برائی کے زہر کو اپنے اندر اتارنے سے وہ ان کے مطلب کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہو گیا اور ان کا دست و بازو بن کر اپنی خدمات سرانجام دینے لگا۔

وہ ایک ایسے گروہ کا کارندہ بن گیا۔ جو معاشرے کے راندے ہوئے نوجوانوں پر مبنی تھا انہوں نے اپنی مایوسیوں، ناکامیوں اور احساس کمتری کا بدلہ لینے کے لیے اپنی ناعاقبت اندیشی کے گھوڑوں پر زینیں کس لیں۔

معاشرے کے ہر صاف ستھرے، پرسکون، محفوظ اور سایہ فگن راستے کو اپنی نفرت کے کانٹوں سے بھر دیا۔ ان پرخار راستوں پر چلنے سے ہر امیر، غریب، چھوٹے بڑے معاشرے کے معزز شہری کے پاؤں زخموں سے خون آلود ہو گئے۔

برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ جب لوگوں کا صبر جواب دے گیا تو گاؤں کے معزز لوگوں نے متفق ہو کر ان کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆

میاں محسن، میاں فیض کی نرینہ اولاد تھی۔ پیروں فقیروں کی دعاؤں اور کتنے ہی درباروں پر "چلے" باندھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔

اگرچہ میاں محسن منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا مگر باپ نے شروع دن سے ہی اس کی تربیت بہت اچھے طریقے سے کی تھی۔ اخلاقیات کے جھولے میں سلا کر ناز و نعم کی لوریاں دی گئیں۔ تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ امیر گھرانے کا بچہ ہونے کا اسے احساس ہی نہ ہونے دیا گیا۔ اس طرح اس کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا گیا کہ حصول تعلیم کو ہی اس نے زندگی کا مقصد سمجھ لیا اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے دن رات ایک کر دی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کو شہر کے معیاری تعلیمی ادارے میں داخل کروایا گیا۔ میاں فیض کے اندر انسانی

خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس بناء پر اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ ہر خاص و عام کی زبان پر اس کی شرافت اور رحم دلی کے چرچے تھے۔ وہ اس وصف کو جس کی بناء پر اس کی شہرت اور احترام کو چار چاند لگے ہوئے تھے۔ اپنے بیٹے میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے شروع دن سے ہی اس کی تربیت ایسے کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو گاؤں کے عام کسانوں کے بیٹوں کی طرح سمجھتا۔ اس کے اندر یہ سوچ پیدا کی گئی کہ بہتر مستقبل کے لیے خوب محنت کرو اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرو گے تو معاشرے میں بلند مقام ملے گا۔

مقاصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی تمام آسائشیں اور سہولیات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ شوق سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ ہر سال نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا تھا۔ والدین کی امیدوں پر پورا اتر رہا تھا۔ شاندار تعلیمی ریکارڈ کا حامل تھا۔

☆......☆

بشیر اور اس کے ساتھیوں کی عادات جنگلی درندوں سے بھی ابتر تھیں۔ علاقے کا ہر خاص و عام ان کی بری سرگرمیوں سے تنگ تھا۔ آخر کب تک برداشت کرتے۔ حالات سے تنگ آ کر ان کے ظلم کے دریا کے آگے بل باندھنے پر سبھی لوگ متفق ہوئے۔ گاؤں کے معززین پر مشتمل پنچائیت نے متعلقہ تھانے میں ان کی بدکرداری کی شکایات درج کروائی۔ علاقے کے وڈیروں سے تھانے سفارش کروائی گئی۔ اس بناء پر پولیس ان کے خلاف بھرپور آپریشن پر تیار ہو گئی۔ جلد ہی گروہ کے افراد سرغنہ سمیت قانون کے شکنجے میں پھنس گئے۔ پولیس نے اپنے مخصوص حربوں سے انہیں ناکوں چنے چبوائے۔ پولیس کی عبرتناک مارپیٹ اور سزا کے باوجود ان لوگوں کی کارروائیوں میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ اور شدت پیدا ہو گئی۔ اب ان کی سرگرمیوں نے دیگر علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان بدمعاشوں کو نکیل ڈالنے کی ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ گاؤں کے شرفاء پر مشتمل ایک جرگہ بلایا گیا کہ اگر یہ لوگ اپنی مذموم حرکات سے باز نہیں آتے تو ان کو گاؤں بدر کر دیا جائے۔ ساتھ ہی پولیس کی مدد لینے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

صبح شام پولیس کے چھاپے پڑنے لگے۔ گاؤں والوں نے بھی ان کا حقہ پانی بند کر دیا۔ پولیس کے چھاپوں نے گھر والوں کا جینا حرام کر دیا۔ آئے روز پکڑ کر تھانے لے جاتے، بے عزتی کی جاتی، مار پیٹ ہوتی، بڑی مشکل سے دے دلا کر گلو خلاصی پاتے۔

ان لوگوں کا پولیس کی کارروائیوں اور معززین گاؤں کے تعاون کی وجہ سے اب اس جگہ رہنا محال ہو گیا۔

بشیر کے والدین کا آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا۔ مزدور آدمی تھے۔ پولیس نے ان کے تمام کس بل نکال دیئے۔ اب تو دو وقت چولہا جلنا بھی مشکل ہو گیا۔ گاؤں کے لوگوں کے عدم تعاون نے مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔

ایک دن بشیر کو اس کے باپ مراد نے بلایا۔ بڑی منت سماجت کی برے کاموں سے توبہ کرنے کی نصیحت کی اور ساتھ ہی اس گاؤں کو چھوڑنے کا فیصلہ سنایا۔

''تیرے کرتوتوں کی وجہ سے ہماری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ گاؤں کا کوئی آدمی ہم کو منہ نہیں لگاتا۔ پولیس الگ تنگ کر رہی ہے اس لیے ہم نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ قریبی گاؤں کا سردار میاں فیض بہت غریب پرور اور نیک خصلت انسان ہے۔ ہمارے دکھوں کا مداوا کرے گا۔ پولیس سے بھی نجات مل جائے گی اور مالی امداد بھی ہوتی رہے گی۔''

''میں تیری ماں نذیراں اور بہن زینب تیرے پاؤں پڑتے ہیں۔ بری عادات ترک کر کے اچھے انسان بن جاؤ۔ خود بھی سکھ کی زندگی گزارو، ہمیں بھی زندگی کی آخری سانسیں سکون سے لینے دو، دوسرے

گاؤں ابھی کوئی حرکت نہ کرتا کہ میں وہاں سے بھی بے عزت کر کے نکال دیا جائے۔

اور پھر اگلے دن مراد، نذیراں، بیٹے بشیر اور بیٹی زینب کے ہمراہ اگاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا اور یہاں فیض کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ غربت کا رونا رویا، سر چھپانے کی جگہ کا سوال کیا، جب کہ بیٹے کے کردار کو چھپا گیا۔

میاں فیض نے رہائش کے لیے ایک مناسب گھر کا انتظام کیا۔ ماں بیٹی کو گھر میں اور باپ بیٹے کو ڈیرے پر کام کرنے کے لیے رکھ لیا۔

☆......☆

میاں محسن کی محنت رنگ لائی۔ اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر اس کو ایم بی بی ایس میں داخلہ مل گیا۔ پورے گاؤں میں اس کامیابی پر خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے۔

میاں فیض کی خوشی دیدنی تھی۔ بیٹا ڈاکٹر بن کر اس کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا محاذ سر کرنے نکل پڑا تھا۔

اب اس کے گاؤں میں اسپتال بنے گا۔ مفت علاج معالجہ کی سہولت ہر خاص و عام کو میسر ہوگی۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بچانے والا نجات دہندہ آنے والا تھا۔ اب غریب لوگوں کا علاج بھی ماہر ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ہوگا۔

سسک سسک کر بیماری، لاچاری اور کمزوری سے مقابلہ کرنے کا سیاہ دور ختم ہونے والا تھا۔

خدمت خلق کے تمام دروازے حویلی کے مالکان پہلے ہی کھلے رکھتے تھے اب تو وہ ہونے جا رہا تھا جو غریبوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

آنے والی حقیقی خوشی کے ملنے پر میاں فیض کا انگ انگ خوشی سے نہال تھا۔

☆......☆

بشیر جن بری عادات کا عادی ہو چکا تھا ان کو ترک کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ اس گاؤں میں بھی اس نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا یہاں لوٹ مار کے مواقع پہلے گاؤں کی نسبت زیادہ ہیں لیکن اکیلا واردات کرنے سے گھبراتا تھا اور یہ تنہا آدمی کا کام بھی نہ تھا۔

پہلے تو اس نے گینگ بنانے کا ارادہ کیا۔ اپنے جیسے سے آوارہ لڑکے تلاش کیے لیکن جب ان سے بات کی تو اسے سخت مایوس ہونا پڑا، کسی نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی بلکہ منہ توڑ جواب دیا۔ کسی بھی زیادتی کے خلاف میاں فیض کے عتاب سے ڈرایا۔ ویسے بھی لوگ پرسکون اور خوش حال زندگی گزار رہے تھے ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ مختصر ضروریات آسانی سے پوری ہو رہی تھیں۔ کسی بھی مجبوری کی صورت میں رحمت کا فرشتہ بن کر میاں فیض مدد کرتا تھا۔ کسی کو لوٹ مار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ایسے خوش حال گاؤں کے نوجوان بھی صاف شفاف سوچ کے مالک تھے۔ انہوں نے صرف بشیر کی حوصلہ شکنی نہ کی بلکہ اس کو بھی سکون کے ساتھ زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کی نصیحت کی۔ مگر جیسے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ بشیر کی سرشت میں بدمعاشی، چوری چکاری، خون کی طرح رواں تھی۔ اپنی عادت پوری کیے بنا وہ کیسے رہ سکتا تھا۔

اس نے مایوس ہونے کی بجائے تنہا ہی وارداتیں کرنا شروع کر دیں۔

پُرسکون گاؤں کے ماحول میں شرارت کے پتھروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ چھوٹی موٹی چوریاں ہونے لگیں۔ آئے روز بھیڑ بکریاں غائب ہونے لگیں۔ انجانے چور کے خوف سے لوگوں نے جانوروں کے باڑوں پر پہرے دینے شروع کر دیے اب تو اِکا دُکا گائیں بھینسیں بھی چوری ہونے لگیں۔

ان حالات سے لوگ سخت پریشان تھے۔ اب تو ہر کسی کو اپنے جانوروں کی فکر ستانے لگی۔ مرد حضرات نے پہرہ بڑھا دیا۔ باڑوں کے اندر چھپ کر پہرہ دیا

جانے لگا۔
آخر کب تک سلسلہ چلتا رہتا۔ ایک رات ایک ڈیرے سے ڈالہ میں بھینس سوار کراتے وقت پہرے داروں کو خبر ہوگئی۔ ابھی بھینس کو مار پیٹ کر کے ڈالے میں چڑھایا ہی جا رہا تھا کہ پہرے داروں نے شوروغوغا کر کے آسمان سر پر اٹھالیا۔
اردگرد ڈیروں پر موجود لوگ آن کی آن میں شور والی جگہ پہنچ گئے کیا دیکھتے ہیں کہ بشیر بھینس کو ڈالے میں سوار کر رہا ہے۔ موقع پر پکڑ کر اس کی خوب چھترول کی۔ پھر میاں فیض کے ڈیرے میں لائے۔ پولیس کو فون کر کے بلایا گیا۔ پولیس آنے پر میاں فیض نے بشیر کو پولیس کے حوالے کیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی اس پر واضح کر دی کہ آئندہ تاحیات میرے گاؤں میں قدم نہ رکھنا، ورنہ تیرا بہت برا حشر ہوگا۔
اور پھر اس کے باپ کو متنبہ کر دیا کہ "اگر بیٹے سے تعلق رکھنا ہے تو اس گاؤں کے باہر رکھنا تمہارا بیٹا مجھے اس گاؤں میں نظر نہ آئے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

☆......☆

میاں محسن نے ایم بی بی ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔
عملی طور پر پریکٹس کرنے کے لیے ایک دوست ڈاکٹر کے اسپتال میں اپنی خدمات سرانجام دینے لگا۔
کام کی لگن، محنت اور ذہانت کی بناء پر جلد ہی اس کا شمار ماہر ڈاکٹروں میں ہونے لگا۔ میاں محسن کی اسپتال میں خدمات کا ذکر گاؤں میں بھی پہنچ گیا۔ پھر کتنے ہی مایوس چہروں پر آس امید کے دیے ٹمٹمانے لگے۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے مریض میاں محسن کے اسپتال میں جانے لگے۔ علاج بھی مفت ہونے لگا۔ دیگر اخراجات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ وسائل جن کو دستیاب تھے وہ تو شہر جا کر میاں محسن کی خدمات سے مستفید ہو رہے تھے مگر جن کے گھروں میں مجبوریوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ شہر کے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ ایسے کتنے ہی لوگ میاں محسن کی گاؤں واپسی کے منتظر تھے۔
میاں محسن اپنے کام میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ڈاکٹروں کی ٹیم بھی تیار کرنا چاہتا تھا جو گاؤں میں اس کا ساتھ دے، مشن کی تکمیل میں اس کا دست راست بنے، اس کے خوابوں کی تعبیر میں ممدومعاون ثابت ہو۔
مقاصد کے حصول کے لیے وہ ابھی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ جدید تحقیقات پر مکمل توجہ دے رہا تھا۔ کتنے ہی تجربات سے گزر چکا تھا اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا چکا تھا۔

☆......☆

پولیس بشیر کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔
سلاخوں کے پیچھے پہنچا ہی تھا کہ کتنے ہی شناسا چہروں سے ملاقات ہوگئی۔ دوست تو اس کی دید کو ترس چکے تھے۔ پرانے ٹھکانے پر ملاقات ہوئی تو کتنی ہی بھولی بسری یادوں کو دہرایا جانے لگا۔ اپنی کرتوتوں کی ڈینگیں مارنے لگے۔ مرچ مسالا لگا کر اپنے اپنے کارنامے بیان کرنے لگے۔
بشیر وارداتوں کے معاملے میں بہت مایوس تھا۔ اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک دفعہ پھر ان کے ساتھ پیار اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ان کے ساتھ مل کر نام کمانے کا وعدہ کیا۔
اگلی صبح گینگ کا سربراہ آیا۔ تھانے والوں سے مک مکا کر کے بشیر سمیت سارے ساتھیوں کو رہا کروا کر لے گیا۔ علاقے میں پہنچنے کی دیر تھی کہ علاقے میں ظلم وزیادتی کا کہرام مچ گیا۔ لوگوں کی جان مال، عزت، سامان، کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ اب تو انہوں نے لوگوں سے گن گن کر بدلے لینے شروع کر دیئے۔
جو بھی ان کے ظلم وزیادتی پر احتجاج کرتا، ان کی شکایت کسی بھی شخصیت یا ادارے کے پاس کرتا، اس کا جینا محال ہو جاتا۔ زندگی اجیرن ہو جاتی، سانس

بھی پوچھ کر لینی پڑتی۔ گھر دکھوں کی آماجگاہ بن جاتا۔ ان کا عتاب زندہ درگور کر دیتا۔

علاقے میں ان کی بدمعاشی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ان کا نام لینے پر زبان ڈگمگانے لگتی۔ سانسوں کی روانی نفرت کے پتھروں کی وجہ سے رکنے لگتی۔ اب تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قہر کو بانگ دہل للکارنا شروع کر دیا تھا۔ رب العزت کی زمین پر فرعون کے لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ زمین پر چلتے کم اور اکڑتے زیادہ تھے۔ اپنے علاوہ ان کو سب کچھ ہیچ نظر آتا تھا۔

وارداتوں کے ساتھ ساتھ اب انہوں نے لوگوں کی بہو، بیٹیوں کی عزت کو بھی تاراج کرنا شروع کر دیا۔

☆......☆

مراد کو بیٹے بشیر سے بچھڑنے کا غم اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ ماں جدائی کی آگ میں جل کر اٹک چارپائی سے جا لگی تھی۔ بہن کا رو رو کر برا حال تھا۔

لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ مجبوری کی ہتھکڑی نے جدائی کے اندھے کنویں میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ گاؤں آ نہیں سکتا تھا اور ان کو پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ملے گا۔

بشیر کی وارداتوں کی شہرت نے ماں باپ سے سکھ کی سانسیں چھین لی تھیں۔ ہر واردات پر ان کی سانسوں کی روانی رک جاتی، خون کی گردش تھم جاتی، اس روگ نے ان کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ دن کا سکون اور رات کی نیندیں غارت ہو گئیں۔

دن رات وہم کا ناگ ڈسنے لگا۔ جن راستوں پر ان کا بیٹا محو سفر تھا۔ وہ تھانے کچہری سے جیل کو جاتے تھے۔ جیل جانے سے بچ جاتا تو کسی اندھی گولی کا شکار ہو کر موت کا لقمہ بن جاتا۔

وہ تخیل میں جب بیٹے کو کال کوٹھری میں بند یا گولی کا نشانہ بن کر لاش کی صورت میں دیکھتے تو ان کی چیخیں گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیتیں بیٹے کی جدائی کے روگ نے ان کو زندہ درگور کر دیا تھا۔

بیٹی زینب حویلی میں کام کرتی۔ بدلے میں بہت کچھ مل جاتا جس سے گھر کی دال روٹی کا انتظام آسان ہو گیا تھا۔ اپنے تئیں زینب والدین کا علاج ذمے داری سے کروا رہی تھی اور ان کی صحت کے بارے میں سخت پریشان تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو اپنی صحت مند زندگی ان کے حوالے کر دیتی اور خود کو دکھوں کے حوالے کر دیتی۔

ماں باپ کی بیماری اور بھائی کی جدائی نے زینب کی زندگی کو دکھوں اور پریشانیوں کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ مایوسیوں کے پاتال میں اتر چکی تھی۔

اگرچہ حویلی کا ہر فرد ان کے دکھ درد میں شریک تھا مگر رات کی تاریکی زینب کے لیے سخت اذیت کا موجب بنتی۔ آنکھوں کا ساون ہر وقت برستا رہتا۔

گاؤں کا حکیم علاج کر رہا تھا۔ روزانہ آ کر چیک کرتا، گولیاں اور پھکی وغیرہ دیتا اور پرہیز کا بتا کر چلا جاتا۔

دودھ اور پھل وغیرہ حویلی سے مل جاتے تھے لیکن کمزوری میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ نقاہت کی وجہ سے اب تو اٹھ بھی نہ سکتے تھے۔

وہ بیٹے کی جدائی کی آگ میں جل رہے تھے اور اس کا علاج ممکن تو تھا مگر ہو نہیں رہا تھا اس لیے یہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کا علاج گاؤں میں ممکن ہی نہ رہا۔

جون کی حبس زدہ رات تھی۔ شام ڈھلے ہی مراد اور اس کی بیوی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ رات کے سائے لمبے ہونے کے ساتھ ہی مرض میں شدت آتی گئی۔ دونوں میاں بیوی کا تکلیف کے مارے برا حال تھا۔ چارپائیوں پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ ان کا کراہنا آہوں میں بدلنے لگا۔

پریشان زینب، دکھوں کی ماری بیٹی کے پاس حویلی کے مالکان کے سوا دوسرا کوئی سہارا نہ تھا۔

جوان بھائی تو علاقے کا نامی گرامی بدمعاش بن کر مجبور لوگوں کی خواہشات کا خون پی کر اپنی ہوس کی پیاس بجھا رہا تھا۔ ماں باپ کی مجبوریوں سے بے خبر دور عیاشیوں کے جنگل میں خوشیوں کے سنگ محو رقص تھا۔

ہر قسم کے تفکرات سے اپنی غنڈہ گردی کی نگری کا بے تاج بادشاہ تھا۔ لوگوں کو سسکا سسکا کر مارنے سے اس کو عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ بشیر نے علاقے میں دہشت کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس کو اس نے خون کے آنسو نہ رلایا ہو۔

اب تو گلی محلے کے لفنگوں نے بھی اس کا نام استعمال کر کے بدمعاشی اور لوٹ مار شروع کر رکھی تھی۔ اس کا نام خوف کی علامت بن چکا تھا۔ اس کا نام سنتے ہی کتنے ہی دلوں کی دھڑکن رک جاتی تھی۔

☆......☆

آج بشیر کے پرانے زخم جاگ اٹھے تھے جس نفرت، انتقام اور بدلے کی آگ کے الاؤ کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا آج وہ بھڑک کر شعلے سے طوفان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ انتقام شعلوں کی طرح آنکھوں سے بھڑک کر میاں فیض کے گاؤں کو جلانے پر تل گیا تھا۔ بے شک میاں فیض خدا ترس انسان تھا اس کے ماں باپ کو پناہ دے رکھی تھی۔ ان کے دکھ درد بٹانے میں مددگار بن رہا تھا مگر اس نے بشیر کو چوری کے الزام میں پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا تھا۔ اور پھر اس پر بس نہیں کیا تھا بلکہ اس کو گاؤں بدر کر دیا تھا اور ماں باپ سے ملنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ یہ سب زیادتیاں بشیر کو ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں اور اس کے جذبۂ انتقام کو بھڑکا رہی تھیں۔ جب بھی اس کو پولیس حوالگی کا منظر یاد آتا۔ اس کا خون کھولنے لگتا آنکھوں سے نفرت کے شرارے نکلنے لگتے۔ اس کا جی چاہتا وہ میاں فیض کو دانتوں کے درمیان رکھ کر پیس دے، مگر اس کا بس نہ چلتا تھا۔

بدلے کی چنگاری جل جل کر اب شعلے کی مانند بھڑکنے لگی۔ گینگ کے سربراہ کی آشیر باد سے جرم کی دنیا میں اس کے نام کا طوطی بولتا تھا اب تو وہ بھتہ بھی لینے لگا تھا۔ اس کا سایہ بھی خوف زدہ کر دیتا تھا۔

آج اس نے میاں فیض کے گاؤں کے لوگوں کو لوٹنے کا آغاز کر کے اپنے انتقام کی بنیاد رکھی۔

☆......☆

سر شام ہی سے مراد اور نذیراں کی طبیعت خراب تھی۔ ہلکی کھانسی کے دورے تو پہلے بھی پڑتے تھے مگر آج تو انہوں نے خون کی قے کی تھی۔ بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے پریشانی نے زینب کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی بس یاد رہا تو اتنا کہ اگر اس مصیبت کے وقت کوئی میری مدد کر سکتا ہے تو وہ میاں فیض ہے۔ وہی خدا ترس انسان اس مشکل گھڑی میں میرے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔'' یہ سوچ ذہن میں آتے ہی اس نے حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازے پر پہنچتے ہی زور زور سے دستک دینے لگی۔

ملازم نے آ کر دروازہ کھولا تو رو رو کر اپنے والدین کی طبیعت کے بارے بتایا اور میاں فیض کے بارے پوچھا۔

ملازم نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جو میاں فیض کا خصوصی کمرہ تھا۔

جب وہاں پہنچی تو میاں فیض فون پر ڈاکٹر بیٹے میاں محسن سے مصروف گفتگو تھا۔

میاں محسن بتا رہا تھا۔

''پاپا! میں نے اپنی پریکٹس کا دورانیہ مکمل کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹروں اور نرسوں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ آپ اسپتال کی تعمیر شروع کروا دیں، اب وہ دن دور نہیں جب گاؤں کے مریض بھی جدید اور معیاری علاج سے مستفید ہو سکیں گے۔'' باپ بیٹے کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ روتی دھوتی زینب کمرے میں داخل ہوئی بکھرے بال، آنکھوں سے آنسو جاری اور زبان پر گریہ زاری تھی۔

والدین کی ناسازی طبیعت خون کی قے اور بے ہوشی کے بارے بتایا اور مدد کے لیے جوتوں پر

بیٹھ کر پاؤں پکڑ کر منت سماجت کرنے لگی۔

"میاں صاحب خدا کے واسطے، میرے ماں باپ کو بچالو، وہ تو لمحوں کے مہمان ہیں اس دنیا میں میرا ان کے سوا کون ہے؟ ان کے بغیر کیسے جیوں گی۔ وہ میرے سامنے خون تھوک رہے ہیں۔ میں بے بس، لاچار ان کو علاج کے لیے کہاں لے جاؤں۔ آپ ہی میرے مہربان ہیں، اس مشکل گھڑی میں سوائے آپ کے میرا کوئی مددگار نہیں۔"

میاں صاحب نے ڈاکٹر بیٹے سے بات کی۔ زینب کے والدین کی صحت کے بارے میں بتایا اور مشورہ مانگا۔

اس نے مریضوں کو فوراً شہر لانے کو کہا۔

گاؤں میں تین گاڑیاں تھیں۔ ایک میاں فیض کی جب کہ دو اور گاؤں کے لوگوں کے پاس تھیں۔

آدھی رات کے وقت کسی بھی اور شخص سے گاڑی مانگنا مناسب نہ تھا کیونکہ میاں فیض کی حویلی میں بھی تو گاڑی موجود تھی۔

مگر یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور کی بہن کی شادی تھی۔ وہ دو دن قبل چھٹی لے کر دوسرے گاؤں گھر چلا گیا تھا۔ اسے اس وقت بلانا ممکن نہ تھا اور حویلی میں دوسرا کوئی ماہر ڈرائیور نہ تھا جو اس وقت گاڑی کو ڈرائیو کر کے شہر لے جاسکے۔

اللہ تعالیٰ کا نام لے کر میاں فیض نے گاڑی نکالی۔ مراد، نذیراں اور زینب کو اس میں سوار کیا اور شہر کی طرف گاڑی بھگانا شروع کر دی۔

گاڑی جونہی گاؤں کے قریب واقع نہر کا پل عبور کر کے موڑ مڑنے لگی، گھات لگائے بشیر اور اس کے ساتھیوں نے فائرنگ کر دی۔

ایک فائر اگلے پہیے پر لگا جس سے وہ پھٹ گیا۔ دوسرا فائر ونڈ اسکرین چیرتا ہوا ڈرائیور میاں فیض کے شانے سے پار ہو گیا۔

ٹائر پھٹنے اور ڈرائیور کے زخمی ہونے کی وجہ سے گاڑی بے قابو ہو کر ہچکولے کھاتی ایک درخت کے ساتھ ٹکرانے کے بعد رک گئی۔

بشیر کے کارندے گاڑی پر ٹوٹ پڑے جب کہ بشیر دور کھڑا یہ تماشا دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

میاں فیض کو گاڑی کا گیٹ توڑ کر گھسیٹ کر باہر نکالا گیا اور بشیر کے سامنے پیش کیا گیا۔

بشیر نے جونہی میاں فیض کو دیکھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زخمی میاں فیض پر لاتوں، ٹھڈوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

دیگر ساتھی گاڑی کی تلاش لینے لگے۔ گاڑی میں لیٹے مریضوں کی تلاشی لی۔ بوڑھی نذیراں کے کانوں سے پیتل کی بالیاں کانوں سے کھینچ لی گئیں۔ جوان زینب کو دیکھ کر ان کی شیطانی حیوانیت جاگ اٹھی اسے گھسیٹ کر دور ویرانے میں لے گئے۔

بشیر کو اطلاع دی گئی کہ ایک حسینہ بھی ہاتھ لگی ہے۔ کیوں نہ اس سے لطف اندوز ہوا جائے۔

سب سے پہلے آپ اس حسینہ کے خوب صورت جسم سے لطف اندوز ہوں۔ مگر پرانے دشمن کو سامنے بے بسی کی حالت میں دیکھ کر آج وہ حاتم طائی بن گیا تھا۔ پہلے ان لوگوں کو اس بنت حوا کی عزت سے کھیلنے کی اجازت دی اور آخر میں خود جانے کا فیصلہ کیا۔

زینب نے ہاتھ جوڑے، بے بسی کے واسطے دیے، اللہ رسول کے نام کے وسیلے سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

بہت تڑپی، چیخی چلائی مگر وہ درندے ٹس سے مس نہ ہوئے نہ تو خوف خدا آیا اور نہ ہی بے بسی پر ترس آیا۔

یوں لگتا تھا ان درندوں کو آج پہلی بار شکار ہاتھ لگا ہے۔ اس کی عزت کو تار تار کر کے اپنی شیطانی ہوس کی پیاس بجھائیں گے۔

پھر سب کارندے باری باری اس کی عزت کو نوچ کر اپنی ہوس کی بھوک مٹانے لگے۔

جب بشیر اپنی باری لینے وہاں گیا اور ٹارچ کی روشنی اس مظلوم حوا کی بیٹی پر ڈالی تو اس نے دیکھا اس کی جواں بہن زینب اس کے سامنے برہنہ پڑی تھی اور اپنی رہی سہی عزت کو بچانے کے لیے اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

مرد اور عورت

عطیہ ہدایت اللہ

اُس دوشیزہ کی داستانِ غم، جس نے ہمیشہ زیست کے پُر پیچ راستے ہی منتخب کیے تھے

میں فوراً سے پیشتر اپنے گھر جانا چاہتی ہوں لیکن میرے لرزتے قدم میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ اس لمبی ویران گلی میں کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا اور پھر جون کی یہ گرم لو سے جھلستی دوپہر! پرانے سے گھر کے باہر بنے ٹوٹے پھوٹے اینٹوں سے بنے تھڑے پر بیٹھ کر میں نے چادر کے پلو سے پانی کی طرح بہتے پسینے کو صاف کیا۔ جب میں گھر سے نکلنے لگی تھی تو میری ہی بہو نے ایک شاپر میں فریج میں سے ٹھنڈی پانی کی بوتل ڈال دی۔

''امی آپ شاپنگ کرنے جارہی ہیں۔ بڑی گرم ہوائیں چل رہی ہیں اس میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک دو گھونٹ بھرلیا کیجیے گا اور کوشش کریں کہ جلد گھر آجائیں۔ آپ کی طبیعت ویسے بھی کچھ اچھی نہیں رہتی۔''

میں نے بوتل کا ڈھکنا کھولا۔ پانی گرم ہو چکا تھا لیکن میرے سوکھے ہونٹ تھوڑے گیلے ہو گئے۔ میرا گلا رندھنے لگا ہے۔ ماضی کی اچھی بری یادیں قطار در قطار کسی ٹڈی دل کی طرح دل و دماغ پر حملہ آور ہو گئیں۔ ایک نوجوان لڑکا دہی کا تھیلا پکڑے گنگناتا ہوا پاس سے گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر چونک سا گیا ہے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

ابا جان کا انتقال ہوا تو میں دو سال کی اور نازیہ آپی چھ سال کے لگ بھگ تھیں۔ چھوٹا بھائی ابا کے اس دنیا سے گزر جانے کے دو ماہ بعد پیدا ہوا۔ اماں پر چھبیس سال کی عمر میں بیوگی کا بھاری پتھر آگرا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ، بھرپور جوانی اور خالی ہاتھ......! عدت کے بعد ہی وہ اپنے بابا کے گھر آگئیں۔ نانا، نانی، ماموں، خالاؤں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اماں انگریزی اسکول و کالج سے پڑھی ہوئی تھیں اس لیے انہیں ایک اچھے اسکول میں مناسب مشاہرہ پر جلد ہی جاب مل گئی۔ ہمارے بارے میں وہ بڑی حساس تھیں۔ ذرا کسی نے ہمیں ٹوکا اور اماں چھکوں پھکوں رونے بیٹھ جاتیں۔

''توبہ ہے ثریا بی بی! تُو نے تو بلی کی طرح بچوں کو منہ میں لٹکا رکھا ہے۔ انہیں زمانے کے سرد گرم سے گزر جانے دے۔ تب ہی تو انہیں عقل آئے گی۔ ہم کوئی ان کے دشمن تھوڑی ہیں۔'' نانی جان اماں کو سمجھانے لگتیں۔

ابا جان باجی نازیہ سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے۔ دن رات گود میں لیے لیے پھرتے۔ ان کے منہ سے بات نکلتی اور ابا اسے کسی جن کی طرح حاضر

کر کے ہی چین پاتے۔

''ثریا! میری نازو ڈاکٹر بنے گی۔ میں اسے بڑا سا اسپتال بنا کر دوں گا۔ جہاں ٹھاٹ سے بیٹھ کر پریکٹس کرے گی۔'' وہ آپی کو پیار کرتے ہوئے کہتے۔ لیکن یہ ارمان پورا ہونے سے پہلے خون کی ایک بڑی سی الٹی نے تیس سال کی عمر میں انہیں قبر میں اتار دیا۔ آپی کی ضدیں پوری کرنے اور لاڈ اٹھانے والا نہ رہا تو چڑچڑی رہنے لگی تھیں۔ ذرا سی بھی کوئی بات مزاج کے ناموافق ہوتی تو زمین پر گر کر پیر رگڑتیں۔ اپنا سر دیوار سے ٹکراتیں، پھر ان کی سانسیں بوجھل ہو جائیں اور چہرہ پیلا پڑ جاتا۔

''ہے ہے لو میری یتیم شہزادی گئی۔ بس اب نہ آنکھیں کھلیں گی۔'' اماں سینہ پیٹتے ہوئے دہائی دیتیں۔ ایک دن وہ اسکول سے آئیں تو سوچوں میں گم بیٹھی رہیں۔ اماں نے پچکارا، نانی نے پیٹھ پر پیار بھری تھپکیاں دیں۔

''بیٹی کچھ تو بول یہ گنگناتی چڑیا اداس کیوں بیٹھی ہے؟''

''اماں چار دن بعد ہماری دسویں کلاس نے نویں جماعت کو پارٹی دی ہے۔ ساری لڑکیاں نئے کپڑے بنا رہی ہیں، میرے سارے جوڑے پہنے ہوئے ہیں۔ مجھے نیا سوٹ اور جوتے چاہئیں۔'' نازیہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن..... لیکن بیٹا مہینے کا آخر ہے، تنخواہ ملنے میں ہفتہ باقی ہے۔ تمہاری نانی کو بھی ماموؤں نے ابھی گھر کے لیے رقم نہیں دی۔ کہاں سے پوری کروں



تمہاری سار وڈز، روناکی فرمائشیں؟"

بس یہ کہنا غضب ہو گیا۔ آپی نے دھواں دھار رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر نانی اماں کی سلائی والی پٹاری سے قینچی نکال کر گول کمرے کے نئے نکور پردے چارے کی طرح کاٹ دیے۔ اماں کے بستر پر بچھی چادر پھاڑ ڈالی۔ سب نے منہ میں انگلیاں دبا لیں اب اگر کوئی بولتا تو آپی کو دورہ پڑ جاتا، پھر سنبھالنا مشکل ہوتا۔ سو شام تک جوڑا، جوتا سب آ گئے اور ساتھ والی ہمسائی خالہ نے دو دن میں سی بھی دیے۔

☆......☆

وقت کب کسی کا انتظار کرتا ہے وہ تو بند مٹھی میں سے ریت کی طرح پھسل جاتا ہے۔ تین بچوں کی انگلیاں تھامے، زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے چلتے اماں کے کالے سیاہ بالوں میں چاندی اتر آئی۔ ناز یہ آپی پر جوانی ٹوٹ کر آئی۔ وہ اماں کی جوانی کی ہو بہو تصویر تھیں۔ گورا چٹا رنگ، شربتی بڑی بڑی آنکھیں، بے حد گھنے اور کمر سے نیچے لٹکتے بال، قد جیسے چنار کا درخت اور پر سے غرور حسن اور طنطنہ۔ جو بھی دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ نانی اماں نہ جانے دن میں کتنی بار ان پر آیۃ الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پھونکتیں۔

''ہزار بار منع کیا ہے بالوں کی کس کر چٹیا بنا، خوب سارا تیل بھی ڈال لیا کر۔ پر تُو تو نیلے پیلے ربن باندھ کر گھوڑے کی دم کی طرح کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ ارے بیٹا پھر نظر لگ جائے گی۔'' جب وہ لمبے بالوں کا پونی ٹیل باندھ کر نکلتیں تو نانی چیخنے لگتیں۔

''دیکھا! پھر کسی بدنظر کی نظر لگ گئی۔'' اور آپی شہزادیوں والی شان بے نیازی سے ہمیں تکتیں۔

آپی کے سامنے میری یا بھیا کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ہمیشہ ان کی اترن ہی پہننے کو ملتی۔ ان کے سوتے ہوئے ہم نے ذرا تیز آواز میں بات کی اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتیں۔ وہ بارہویں کلاس میں تھیں، جب بڑے چچا جان کے بیٹے کا رشتہ آ گیا۔ آپی کو پتا چلا تو نیلی پیلی ہو گئیں۔

''خبردار جو میری مرضی کے خلاف کسی نے میرا رشتہ دیا ہو تو۔ مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے۔ میں کسی چچا

وجہ ان کو نہیں جاتی۔''

آپی نے تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا تو میں بھی نویں کلاس میں آ گئی۔

''شیریں جب میں کالج بس کے لیے نکڑ میں کھڑی ہوتی ہوں نا تو کچھ دنوں سے ایک لڑکا بھی سڑک پار دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب میں بس میں سوار ہو جاتی ہوں تو مسکراتا ہوا چل پڑتا ہے۔ کبھی سلام کے لیے ہاتھ ماتھے پر لے جاتا ہے۔ مجھے بڑا ہی ڈرلگ رہا ہے۔''

''ہائے آپی یہ تو بہت بری بات ہے۔ تم بس اس کی طرف بالکل مت دیکھو اور برقعے کی بڑی نقاب کے ساتھ چھوٹی نقاب سے بھی چہرہ ڈھانپا کرو۔'' اب میں بڑی ہو گئی تھی اور آپی مجھے کچھ کچھ اہمیت دینے لگی تھیں۔

☆......☆

ایک دن جب میں اسکول جانے کے لیے تیاری کر رہی تھی تو آپی اِدھر اُدھر دیکھتیں غسل خانے میں میرے قریب آ گئیں۔

''شیریں، تمہیں پتا ہے وہ لڑکا اب اپنی گاڑی میں میری کالج بس کے پیچھے پیچھے کالج بھی پہنچ جاتا ہے اور اکثر تو چھٹی کے وقت اسٹاپ پر بھی آ کھڑا ہوتا ہے اب کیا ہوگا۔''

''دیکھو آپی! کوئی غلط کام نہ کرنا ورنہ اماں تو جیتے جی مر جائیں گی۔ کتنی تو وہ احتیاط کرواتی ہیں۔ جب تک میں اور آپ گھر نہیں آ جاتے ان کا دم لبوں پر اٹکا رہتا ہے۔ خدا نہ کرے جو ہماری وجہ سے انہیں کوئی دکھ پہنچے۔'' یتیمی کے تھپیڑوں نے مجھے وقت سے پہلے سمجھدار بنا دیا تھا۔ اس لیے میں نے سختی سے آپی کو تنبیہہ کی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ آپی نے نہا دھو کر ہلکا سبز کاٹن کا سوٹ پہنا۔ ہم رنگ ململ کا چنا ہوا دوپٹہ گلے میں ڈالا۔ کانوں کے پاس کس کر دو چوٹیاں بنا کر سبز ربنوں کی ٹائیاں بنائیں۔ بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھار کھینچی۔

''اماں میں شیریں کو لے کر عذرا کے گھر جا رہی

ہوں۔ امتحان سر پر ہیں اور مجھے انگلش کے نوٹس لینے ہیں اور تھوڑی سی ساتھ مل کر پڑھائی بھی کرلوں گی، دوپہر تک آجائیں گے۔‘‘

اماں نے دس ہزار ہدایات دے کر جانے کی اجازت دی۔ کچھ دور پیدل چل کر آپی نے تانگہ رکوایا چوک پر پہنچ کر ہم تانگے سے اترے۔

’’آپی عذرا باجی کا گھر تو ابھی دور ہے۔ آپ اس جگہ کیوں اتریں؟‘‘ شیریں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

’’ہاں ہاں مجھے معلوم ہے۔ بس تُو چپ کر کے کھڑی رہ۔‘‘ آپی نے جھنجھلا کر گھر کا۔ پیچھے سے بڑی سی گاڑی نے ہارن دیا۔ آپی نے جھٹ نقاب اٹھا کر میرا ہاتھ پکڑا۔

’’آپی یہ کس کی گاڑی ہے، آپ کیوں اس میں بیٹھ رہی ہیں؟‘‘ میں نے سہے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

’’شیریں! یہ فاروق ہیں اور فاروق یہ میری چھوٹی بہن ہے۔‘‘

’’کیسی ہو سسٹر! ڈرو مت تمہاری مدد کے لیے میں مشکور ہوں۔ ہم تھوڑا وقت ساتھ گزاریں گے پھر میں جلد آپ کو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔‘‘ فاروق کی آواز میں مٹھاس تھی۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ میرے ساتھ اس نے بڑے پیار اور نرمی سے بات کی۔

آپی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ فاروق بھائی نے ریکارڈ پلیئر پر ایک خوب صورت سا رومانوی نغمہ چلایا۔

’’آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم، تم ملے تو ویرانے میں بھی آجائے گی بہار۔‘‘ فاروق بھائی آپی کی طرف جھک کر کوئی بات کرتے اور آپی برقعے کا پلو منہ میں دبا کر شرما جاتیں۔ اُدھر میں پیچھے بیٹھی مسلسل پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ ’اگر اماں یا نانی کو پتا چل گیا تو؟ یہ آپی نے مجھے کہاں پھنسا دیا۔‘

شہر سے باہر ایک پکنک اسپاٹ پر ایک طرف سرسبز درختوں کے جھنڈ، خود رو پھولوں سے اٹی جھاڑیوں اور نزدیک ہی اجلے چمکیلے پانی والی سبک رو، ندی کے کنارے ہم لوگ بیٹھ گئے۔ مجھے ان دونوں کی پیار بھری حرکات اور باتوں سے الجھن ہونے لگی۔ میں ذرا دور بڑے سے پتھر پر منہ موڑے بیٹھ گئی۔ گھنٹہ ڈیڑھ بعد جب بیٹھے بیٹھے میری کمر اور گردن اکڑنے لگی، تو آپی نے مجھے آواز دی۔ فاروق بھائی نے بڑی سی ٹوکری سے سامان نکال کر پلاسٹک شیٹ پر سجانا شروع کر دیا۔ تلی ہوئی مچھلی، چپلی کباب، چکن روسٹ، سلاد اور موٹے موٹے پھولے نان۔ ڈر کے مارے نوالے میرے گلے میں اٹکنے لگے جسے میں پانی کے بڑے بڑے گھونٹوں کے ساتھ مجبوراً نگل رہی تھی۔

کھانے کے بعد میں نے فریاد بھری التجا کی کہ اب گھر چلا جائے۔ دوپہر کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ جب ہم گھر پہنچے۔

’’شیریں...... تم اپنی زبان بند رکھنا، کسی کو آج کے بارے میں بھنک بھی پڑ گئی تو میں جان دے دوں گی۔ تمہیں پتا تو ہے میری ضد کا۔‘‘ ایک دفعہ جب آپی نے اس وادی پُرخار میں قدم رکھا تو پھر وہ آگے بڑھتی ہی چلی گئیں۔ انہیں میری مدد کی بھی ضرورت نہ رہی۔ انہیں جھوٹ اور بہانے بازی کے ایسے ایسے طریقے ازبر ہو گئے کہ امیر خسرو نے کیا صحیح فرمایا۔ ’’تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا‘‘ ان کی الماری فاروق بھائی کے دیئے ہوئے تحفوں سے بھر گئی۔

اسٹڈی کرتے کرتے وہ دور خلاؤں میں گم ہو جاتیں اور کسی آواز پر چونک کر ہولے، ہولے مسکرانے لگتیں۔

☆......☆

آپی نے بی ایس سی کیا تو چچا جان ایک بار پھر ان کا رشتہ لینے آ پہنچے۔ اس دفعہ آپی نے وہ واویلا مچایا، اتنے دورے ڈال لیے کہ اماں کو انہیں صاف انکار کرنا پڑا۔

اس طرح سے پورے سسرال نے اماں کا بائیکاٹ کر دیا۔ فاروق بھائی کے گھر والوں نے آپی کے رشتے کے لیے چکر پر چکر لگانے شروع کر دیئے لیکن جب تک بڑے ماموں آمادگی ظاہر نہ کرتے، اماں کیسے ہاں کر سکتی تھیں؟ بڑے ماموں ڈاکٹر تھے اور

ایک انٹرنیشنل بیالوجی کانفرنس میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر وہ گھر آئے۔ مسئلہ ان کے آگے رکھ دیا گیا۔ چار پانچ مزید رشتے بھی آچکے تھے۔ ماموں نے باقاعدہ تفتیش کی، فاروق بھائی وغیرہ کا انٹرویو لیا، تب یہ بھید کسی بم کی طرح پھٹا کہ وہ تو گیارہ سال پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ جب وہ ایف اے کے اسٹوڈنٹ تھے۔ ان کی بیوی نے جو ان کی بڑی بہن کی نند بھی ہوتی ہیں انہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ کافی عرصے سے دوسری شادی کے آرزومند تھے اور اب انہیں اپنے مطلب کی لڑکی ملی تھی۔ ان کے بچے بھی نہیں تھے۔

''ماموں جان میں ترازو کے ایک پلڑے میں سونا اور دوسرے میں آپ کی بھانجی کو تول کر لے جاؤں گا۔ جہاں چاہیں اسے علیحدہ گھر اور مہر کی بھاری رقم پیشگی ادا کردوں گا لیکن اب میں اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' فاروق بھائی نے التجا بھرے لہجے میں ماموں سے کہا۔

''نہیں صاحبزادے میرے اوپر یتیم بھانجی کی بھاری ذمہ داری ہے۔ میں اسے سوکن کے اوپر نہیں دے سکتا، ویسے بھی کسی بے قصور عورت کے اوپر رشتہ دے کر میں اس کی بددعائیں مول نہیں لے سکتا۔'' ماموں صاف ہتھے سے اکھڑ گئے۔

ان کے سامنے اماں کیسے بولتیں۔ پھر ماموں نے ایک پروفیسر کا رشتہ منظور کرنے کا عندیہ دے دیا۔

سارے گھر میں ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی۔ آپی بھوک ہڑتال کیے کمرے میں بند ہوگئیں۔ اماں کو آپی کے افیئر کے بارے میں پتا لگ گیا تھا۔

''کتنی مصیبتوں، کتنے لاڈ اٹھا اٹھا کر اسے پالا ہے اور اس نے کس طرح خاموشی اور مکاری سے محبت کا چکر چلا کر سب کے سامنے مجھے شرمندہ کرا دیا ہے۔'' اماں، نانی جان کے کندھے پر سر رکھ کر بلک اٹھیں۔

ان ہی دنوں میں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ ماموں نے جاتے جاتے شُرلی چلادی۔

''بی بی آپا اچھا رشتہ دیکھ کر چھوٹی کو بھی بیاہ دو۔ اپنے سر سے بوجھ اتارو۔'' اور واقعی ان دنوں جب میرے لیے ایک اچھا سا رشتہ آیا تو ماموں اور نانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور مجھے پڑھائی سے اٹھا کر بیاہ دیا۔ آپی کی بات درمیان میں رہ گئی۔ کیونکہ پروفیسر صاحب پی ایچ ڈی کے لیے باہر چلے گئے۔ آپی نے بقایا کسی بھی رشتے سے صاف انکار کرنا شروع کردیا اور بی ایڈ کر کے ہزارہ کے ایک شہر میں ہیڈ مسٹریس لگ گئیں۔

☆......☆

''میں دن اور رات کو انسانوں کے درمیان گردش میں رکھتا ہوں۔'' یہ قرآن پاک کا بیان ہے۔ انہی دنوں جب میں یکے بعد دیگرے تین پیارے پیارے بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اسی پروفیسر صاحب کا رشتہ دوبارہ آگیا۔ اگرچہ عمر میں زیادہ تھے لیکن آپی بھی تو چھوٹی بچی نہ رہی تھیں، سو عجلت میں یہ رشتہ منظور کر کے بیاہ کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

فاروق بھائی کی جانب سے دھمکی بھرا فون آیا۔

''اگر ناز یہ میری نہ ہو سکی تو کسی اور کو اس کی ڈولی نہیں اٹھانے دوں گا۔''

مہندی کی رات سے اماں، نانی اور خالائیں سورہ یاسین اور سورہ نوح کے ختم پر بیٹھ گئیں لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور اس طرح سے آپی ذاکر بھائی سے بیاہ دی گئیں۔

☆......☆

زندگی کا ساز بجتا رہا اور ہم اس کی دھن پر مست رقص کرتے رہے۔ پچیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ میرے بیٹے اور آپی کی دونوں بیٹیاں جوان ہوگئیں۔ بدقسمتی سے ذاکر بھائی سے آپی کے تعلقات ہمیشہ تناؤ کا شکار رہے۔ وہ خاموش اور کم گو انسان تھے۔ ان میں یہ خرابی تھی کہ وہ گھریلو اخراجات اور بچوں کی تربیت سے بالکل لاتعلق رہے۔

آپی اپنی تنخواہ سے گھر کا چولہا اور بچوں کی ضروریات پورا کرتیں۔ انہوں نے اپنے زیور بیچ کر پلاٹ لیا، ہاؤس بلڈنگ والوں سے قرض لے کر گھر بنایا اور دونوں بیٹیوں کی شادی کی۔ جب بھی ذاکر بھائی سے مانگا یہی کہتے۔

''میرے اوپر بوڑھی ماں اور بیوہ بہن بمع تین بچوں کی بھاری ذمہ داری ہے۔ اس محاذ پر تم خود لڑو۔

میرے پاس دینے کو کچھ نہیں۔'' آپی کے دل میں شوہر کے خلاف نفرتیں، کدورتیں اور شکوے بڑھتے رہے۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح جھلستا لاوا اپنے اندر دبائے جیتی رہیں۔

''شیریں میں اس مشقت بھری زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ میری زندگی کسی گوشت پوست کے انسان کے ساتھ نہیں بلکہ برف کے سل کے ساتھ گزر رہی ہے۔ ذاکر کو میرے جذبات، میری قربانیوں کا کوئی احساس نہیں۔ بس اس کے لیے میں پیسہ بنانے کی مشین ہوں۔ اس نے کبھی ململ کا ایک دوپٹہ تک مجھے نہیں اوڑھایا۔''

مجھے ذاکر بھائی پر غصہ تو آتا لیکن آپی کو تسلی دیئے بنا اور کیا کرتی۔ انہی دنوں ان کا ٹرانسفر گھر سے کافی دور دوسرے شہر میں ہو گیا۔ وہ گھر سمیٹ کر تو لے جا نہیں سکتی تھیں۔ سو آنے جانے لگیں۔

''تمہیں پتا ہے شیریں میں صبح اذان کے وقت اٹھ کر سب کے لیے ناشتا بنا کر رکھتی ہوں۔ ذاکر اور اپنے کپڑے استری کر کے، ابھی لوگ مسجدوں سے نکلتے ہیں کہ بس اڈہ پر پہلی بس پکڑنے پہنچ جاتی ہوں۔ شام کو واپسی پر سبزی ترکاری، گوشت، پھل سب مجھے لانا پڑتا ہے۔ اس آدمی کی طرف سے کوئی مدد، نہ دلاسہ پتا نہیں اماں نے کیا دیکھ کر میری زندگی برباد کر دی۔'' آپی روہانسی ہو کر اکثر فریاد کرتیں۔

پھر میں سوچتی ہم لوگ اپنے پالتو جانور کو بھی دن کے آخر میں پیار بھری تھپکی دیتے ہیں۔ گاڑی ذرا سی خراب ہو تو فوراً ورکشاپ کی طرف دوڑتے ہیں لیکن بیوی کو ایک پیار بھری نظر کیوں نہیں بخشتے؟

اس فرسٹریشن اور مایوسی کے دوران ایک دن انہوں نے اخبار اٹھایا تو مشہور کنٹریکٹر فاروق کی بیوی کی فوتگی کی خبر چھپی تھی۔ آپی نے پوچھ پاچھ کر نہ جانے کہاں سے نمبر حاصل کیا۔ بس وہی لمحہ بغاوت کا تھا۔ اپنی پرانی محبت سے ناتا جوڑنے کا۔ اس سسٹم سے، مردوں کے ناروا رویوں سے۔ برسوں کے جذبات پر باندھے بند پل بھر میں ٹوٹ گئے اور اپنے جلو میں معاشرے کا ڈر، رشتوں ناتوں اور روایات کا احترام، ڈر، خوف سب کچھ اس ریلے میں بہہ گیا۔ دونوں نے اپنے سلگتے دن راتوں اور زمانے کے جور و ستم کا رونا رویا، وہ برقی رو جس کی مثبت، منفی تاریں کاٹ دی گئی تھیں پھر سے کرنٹ دوڑ گیا۔ ایک رشتے دار کی شادی میں آپی بھی آئیں۔ آتشی گلابی سوٹ، ہم رنگ سینڈل، سفید رنگوں والے آویزے اور ننھی منی گھنٹیوں والے بریسلٹ کے ساتھ وہ بہت تر و تازہ اور پرکشش لگ رہی تھیں۔ ان کے گلابی ہونٹ آپ ہی آپ مسکرا رہے تھے۔

''واہ آپی آج تو آپ غضب ڈھا رہی ہیں۔ کہاں سے لیا یہ سوٹ؟ بڑا ہی عمدہ کپڑا ہے اور یہ بریسلٹ بس آپ کے سپید ہاتھوں کے لیے بنا ہے۔'' میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر کپڑے کی نرمی کو محسوس کیا۔

''ادھر ایک طرف میرے ساتھ آ کر بیٹھو، تم سے کوئی بات کرنی ہے۔'' آپی نے اپنی جگہ سے کھسکتے ہوئے میرے لیے جگہ بنائی۔

''شیریں تمہیں فاروق یاد ہے نا۔ ہم دونوں میں پاگل پن کی حد تک پیار تھا لیکن ماموؤں، خالاؤں نے ظلم کیا میرا رشتہ نہ دے کر۔ ...یاد آیا؟'' آپی کے لہجے میں حسرت سی تھی۔ ''میں نے اس کی بیوی کی موت پر تعزیت کا فون کیا تھا۔ پتا ہے اسے اللہ نے اس بیوی سے دو لڑکیاں بھی دے دی تھیں۔ حیرت انگیز بات دیکھیں اسے میرے حالات کے بارے میں مکمل انفارمیشن تھی۔ وہ میرے لیے کڑھتا رہا ہے۔ پتا ہے اب وہ مجھے دوسرے اسٹیشن لاتا لے جاتا ہے۔ روتا رہتا ہے میرے سامنے، یہ سب کچھ اس نے دلایا ہے۔ وہ اب بھی مجھ سے والہانہ محبت کرتا ہے۔''

اس انکشاف سے میں سکتے میں آ گئی۔ آف آپی کی ازدواجی زندگی تو ویسے بھی کچے دھاگے سے بندھی ہچکولے کھا رہی تھی اب تو تڑاخ کر کے ٹوٹنے والی ہے۔ میں بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی۔

''آپی آپ بالکل اچھا نہیں کر رہیں۔ ذاکر بھائی جیسے بھی تھے، ان کے ساتھ بہت سا وقت گزار چکی ہیں۔ معاشرے میں آپ کی عزت اور مقام ہے۔

بچیوں کی سسرالیں ہیں۔ ہمارے بیٹے کی شرافت کی دھاک ہے۔ آپ سب کچھ داؤ پر لگا رہی ہیں۔ سب لوگ آپ پر تھوکیں گے۔ آپ کے ٹوٹے دل کو نہیں بلکہ ذاکر بھائی کے ٹوٹے سر کو لوگ دیکھ کر آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ فاروق بھائی کا گھر اجڑا ہے۔ اس وقت وہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ انہیں سہارا دینے کی خاطر اپنا گھر، اپنا شوہر اپنے بچے مت کھوئیں۔'' میری آواز بھرا گئی۔

آپی بالکل گنگ سی ہو گئیں۔ آپی اور فاروق بھائی کے درمیان فاصلے تیزی سے سمٹنے لگے۔ ذاکر بھائی کو کچھ شک سا ہو گیا۔ آپی دو تین بار روٹھ کر اماں کے پاس چلی گئیں۔ چند بار وہ ہمارے ہاں بھی آئیں۔

میرے شوہر قیصر نے ذاکر بھائی سے کہا۔ ''اگر تمہیں بیوی کے کردار پر شک ہے تو اسے گھر بٹھا دو۔ نوکری چھڑوا دو۔''

''نہیں نہیں وہ بری نہیں، میں کیوں اس کی نوکری ختم کرواؤں۔ ویسے ہی زود رنج ہو گئی ہے۔ ذرا ذرا بات کو پکڑ لیتی ہے۔'' ذاکر بھائی رسان سے جواب دیتے۔

''شیریں! ذاکر تو پاگل ہو رہا ہے وہ ڈر رہا ہے کہ کمانے والی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ راتوں کو اٹھ کر چیختا ہے کہ گلی میں مجھے مارنے کے لیے لوگ پھر رہے ہیں۔ ابھی تم دروازہ کھول کر مجھے مروا دو گی۔ اسکول سے آتے ہوئے پانچ منٹ لیٹ ہو جاؤں تو قرآن شریف اٹھوانے لگتے ہیں کہ میں سیدھی گھر آرہی ہوں۔ پھر ہسٹریائی انداز میں چیختے اور مغلظات بکنے لگتا ہے۔ آخر میں منہ سے جھاگ نکلتی اور بلڈ پریشر بڑھنے کا واویلا کرتا ہے۔ اس کی ماں اور بہنوں نے بھی ڈیرے جمائے ہیں اور ہر وقت طعنے دیتی رہتی ہیں۔''

کاش ذاکر بھائی اور ان کے گھر والے حالات کو ہوشیاری سے ہینڈل کرتے۔ بچپن سے ضدی اور زود رنج آپی مزید بکھرنے لگیں اور فاروق بھائی کی ذات ہی انہیں پناہ گاہ نظر آنے لگی۔ پھر ایک دن صبح ہی ذاکر بھائی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''چھوٹی! تمہاری آپی گھر سے چلی گئی ہیں اور ایک خط چھوڑ گئی ہے۔ اس نے اسکول سے طویل چھٹی لی ہے اور اپنا ضروری سامان بھی لے گئی ہے۔ اس نے مجھ سے طلاق مانگی ہے۔ تم سب کی ملی بھگت لگتی ہے مجھے۔ اپنی ماں اور بھائی کو بھی بتا دو اور ہاں اسے جلدی سے ڈھونڈھ کر میرے پاس لاؤ، ورنہ تم سب کے لیے اچھا نہ ہوگا۔''

غم، پریشانی، شرمندگی اور بے عزتی کے احساس نے مجھے اندر تک سلگا دیا۔ پھر جب ذاکر بھائی نے میری بوڑھی ماں اور بے قصور بھیا کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت اور بیٹے نعمت ہوتے ہیں۔ نعمت ماں باپ کو اتنا تباہ نہیں کرتے جتنا رحمت کے بگڑنے سے والدین ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتے ہیں۔ ہم سب نے آپی کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے سود۔

پھر نامعلوم مقام سے انہوں نے فون کیا۔ ''شیریں میں محفوظ جگہ پر ہوں۔ ذاکر سے کہو مجھے طلاق دے دے۔ میں اب اس جہنم میں بھی نہیں آؤں گی۔'' میں نے چیخنے کی کوشش کی لیکن فون بند ہو چکا تھا۔

اماں، بھیا کے ساتھ ملتان چلی گئیں کہ اس کی پوسٹنگ وہاں کی تھی۔ ذاکر بھائی کے داماد اور چچا زاد انہیں گھیر گھار کر ہمارے ہاں لائے اور طلاق کے کاغذات لکھوا کر بھیا کے ایڈریس پر بھیج دیئے۔ بڑوں سے سنتے آرہے ہیں کہ جس جگہ طلاق دی جا رہی ہو خفت اور تکلیف کے مارے وہاں کی زمین شق ہو جاتی ہے۔ اماں نے طلاق کے کاغذات دیکھے تو انہیں دل کا شدید دورہ پڑ گیا اور تین دن بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میں اس شہر میں لوگوں کے طعنے سہنے اور مذاق کا نشانہ بننے کے لیے تنہا رہ گئی۔ میرے اپنے شوہر، سسرال اور رشتے داروں نے وہ، وہ تماشے کیے، مجھے اتنا رلایا، میرے خاندان عزت اور شرافت کی دھجیاں بکھیر دیں۔

''ارے بہن بھاگ گئی، کہیں یہ بھی اس کے نقش قدم پر نہ چل پڑے۔ باگ کھینچ کر رکھو، بے اعتبارے لوگ ہیں۔'' سسرال والے مجھے دیکھ کر میرے شوہر کو

آوازیں دے کر کہتے۔

''آپی یہ تم نے کیا کر دیا۔ دیکھو آکر تمہاری وجہ سے میرا کتنا نقصان ہوا۔ جگر چھلنی کر دیا ہے لوگوں اور گھر والوں کے طعنوں نے۔'' میں بند کمرے میں روتے ہوئے آپی کو آوازیں دیتی۔ اماں کی لاش نانی اماں کے گھر لائی گئی تو آپی دھڑام سے دروازہ کھول کر روتی بلکتی ان کی لاش پر گر گئیں۔ آنگن میں بیٹھے لوگ آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے طنزیہ اور کٹیلی نظروں سے آپی کو گھورنے لگے پرائے تو کیا، خاندان کا بھی کوئی فرد ان کے قریب نہ آیا۔ جب سب لوگ رات کو تھک ہار کر اِدھر اُدھر پڑ کر سو گئے تو میں دالان میں گھٹنوں میں سر دیئے سسکتی ہوئی آپی کے قریب بیٹھ گئی۔

''آپی آپ نے بہت برا کیا۔ اماں کی جان لے لی۔ مجھے اپنے شوہر، سسرال اور بچوں کے سامنے ذلیل کیا۔ بھیا کسی سے آنکھ نہیں ملا پاتے۔ سب لوگ ہمارے جنم پر تھوک رہے ہیں۔''

''شیریں تم تو ایسا نہ کہو۔ میں اس جہنم میں مزید اس پاگل شخص کے ساتھ کیسے رہتی۔ اس کے رویے سے میری اپنی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ مجھے شدت کے دورے پڑنے لگے تھے۔ سائیکاٹرسٹ نے کہا یا اس ماحول سے پیچھا چھڑاؤ ورنہ پاگل ہونے میں دیر نہیں۔ میں نارمل زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تم سب نے دوسرے لوگوں نے اور میرے اپنے شوہر نے مجھے نہ جانا، میری مدد نہیں کی تو میں کیوں دنیا کا خیال رکھوں؟ میں ایک محفوظ جگہ رہ رہی ہوں۔ مجھے طلاق کا علم ہو گیا ہے۔ عدت گزار کر اپنے بارے میں فیصلہ کروں گی۔''

''آپی شکستہ دل اور منتشر الذہن تو آپ پہلے سے تھیں، ذاکر بھائی کا سلوک بھی اچھا نہ تھا لیکن فاروق بھائی نے دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی۔ میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بندے کو آج سے دس سال بعد کا بھی سوچنا چاہیے کہ اس اقدام کے نتائج کیسے نکلیں گے۔ کتنا خسارہ نصیب ہوگا۔''

''شیریں میں اپنے کیے پر نادم نہیں ہوں۔ ذاکر ایک خود غرض انسان ہے اس نے کبھی میری مشکلات کو نہ سمجھا۔ پیسہ ہی اس کے لیے سب کچھ ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔ اب میں اپنے بھلے کے لیے سوچوں گی۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اتنے میں بھیا اُدھر آ گئے۔ وہ شاید ہم دونوں کی ٹوہ میں تھے۔

''شیریں اس عورت کو کہہ دو کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے، ہمارا اور اس کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔ میں اپنی بوڑھی، دکھی اور پارسا ماں کی سسکیاں اور بہنے والے آنسوؤں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ اس کی وجہ سے مر گئیں۔ ہم اس کی وجہ سے آنکھ اٹھا کر نہیں چل سکتے۔'' بھیا کی دبی دبی آواز میں زمانے بھر کی تلخی اور نفرت بھری ہوئی تھی۔

آپی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے سرہانے رکھی چادر اٹھا کر اوڑھی، حسرت بھری نظر سے گھر اور ہمیں دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتیں گھر کی دہلیز پار کر گئیں۔ بھیا چند لمحے سُنتے ہوئے چہرے کے ساتھ دروازے کو دیکھتے رہے اور پھر میرے قریب زمین پر بیٹھ کر سر جھکائے سسکیاں بھرنے لگے۔

''شیریں مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا، میرا سینہ پھٹ رہا ہے وہ ہماری ماں جائی اور بڑی بہن ہے لیکن ہم نے اسی معاشرے میں زندگی گزارنی ہے۔ یہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کر دیا۔''

چار پانچ ماہ تک آپی کا کچھ پتا نہ چلا۔ پھر اچانک معلوم ہوا کہ آپی نے اپنی ٹرانسفر صوبے کے دور دراز پہاڑی علاقے میں کرا لی ہے۔ انہوں نے فاروق بھائی سے نکاح کر لیا ہے اور وہ ان کے بڑے سے گھر میں لاتعداد اور رشتوں کے درمیان آ بیٹھی ہیں۔ ان کے بیٹے، بہوئیں، پوتے پوتیاں، بھائی اور ان کی بیویاں، بھرا پرا خاندان تھا۔ اٹھتے بیٹھتے سب کی تحقیر آمیز نگاہیں، طنز، گستاخانہ فقرے اور نفرت انگیز رویے ان کا مقدر بن گئے۔ ایک فاروق بھائی کب تک انہیں تیر و تفنگ کے واروں سے بچا پاتے۔ آپی کی بیٹیاں تڑپ تڑپ کر روتیں۔

''خالہ ہم اپنے سسرال میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی جاتی ہیں۔ سب ہمارے اوپر ہنستے ہیں، کاش ہم پیدا ہوتے ہی مر جاتیں۔ ان سب نے ہمارے ساتھ بھی رشتے توڑ دیے۔ ہمارے شوہر کہتے ہیں جیسی ماں تھی ویسے ہی یہ لوگ بھی ہوں گے۔ اس قابل نفرت عورت سے وابستہ کسی رشتے سے بھی تعلق نہ رکھو۔''

میری بھانجیوں نے خفت سے سر جھکا کر بتایا۔

آہستہ آہستہ آپی کو سب لوگ بھولنے لگے تھے کہ اچانک آج اتنے عرصے بعد ان کی رشتہ دار نے مجھے فون کر کے گھر آنے کی تاکید کی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس گھر سے لرزتے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی اس ویران گلی میں آبیٹھی ہوں۔ اپنی اس سسرالی رشتے دار کے گھر مجھے دراصل نازیہ آپی نے بلایا تھا۔ خوب صورت شوخ رنگوں والے لباس، میچنگ جیولری، سلیقے سے مختلف قسم کے ربنوں اور کنگھیوں سے آراستہ لمبے بال، رنگے ہوئے ناخن اور موٹی موٹی آنکھوں میں کجلے کی دھار، جو کسی بھی صاحب ایمان کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ پر یہ وہ لڑکی تو نہ تھی۔ یہ کون تباہ حال عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ چھدرے سفید روکھے بال، لون کا اڑا رنگ جوڑا زیب تن کیا ہوا، کھوئی کھوئی غیر حاضر دماغ، لاغر جسم، گہرے سیاہ حلقوں میں گم چندھی سی آنکھیں، یہ میری شہزادیوں والا طنطنہ لیے ہوئے نازیہ تو نہیں۔

''آپی کہہ دو کہ یہ تم نہیں ہو۔ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ تمہارا صحت مند وجود تاریکیوں میں کیوں اتر گیا۔'' میں بے اختیار آپی کے ساتھ چمٹ کر بلکتی رہی۔ آپی نے میرے گلے مل کر اتنے آنسو بہائے کہ پلنگ پر ڈھے گئیں۔ بڑی مشکل سے طاقت بحال ہوئی۔

''شیریں تو ٹھیک کہتی تھی کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر بار بار سوچنا چاہیے۔ مجھے حالات سے بھاگنا نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کر کے باعزت راہ تلاش کرنا چاہیے تھا۔ اگر کسی انسان میں بہت سی برائیاں ہیں تو اچھائیاں بھی تو ہوں گی۔ ہم جذبات میں آ کر بندے کی صرف برائیوں کو ہی کیوں انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ایک لمحے کی خطا ہمیں صدیوں پرے دھکیل دیتی ہے میں بالکل اکیلی اور بے توقیر ہوں، فاروق کی ہمدردی نے میرے مجروح جذبات کو شوریدہ سر بنا ڈالا تھا۔ آج وہ مجھے بات، بات پر طعنے دیتا ہے کہتا ہے جو عورت اپنے ماں باپ کی لاج اور بچوں کی عزت کا خیال نہ رکھ کر گھر سے نکل آئی ہو وہ کہاں قابل اعتبار ہوتی ہے۔ کہتا ہے تم آوارہ ہو، آبرو باختہ ہو، بے اعتباری ذلیل عورت ہو، میں جو کماتی ہوں مجھ سے لے لیتا ہے۔ میں اپنے سارے خرچ خود پورے کرتی ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر لاتوں، ٹھڈوں اور تھپڑوں کی بارش برسا دیتا ہے۔ میرے سر کو دیوار سے مار مار کر میرا دماغ ہلا دیا ہے۔ مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں آتی۔ یہ دیکھو میری پیٹھ میرے ہاتھ میرے پاؤں اس کی مار کے نشانوں سے بھر گئے ہیں۔ مجھے اپنا گھر اور اپنے بچے یاد آتے ہیں۔ ذاکر لاکھ لالچی تھا پر برا سلوک تو روا نہیں رکھتا تھا۔''

مجھے ان پر بہت ترس آیا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''آپی تمہیں کیا حق پہنچتا تھا جو سب کے اتنے پیار بھروسے اور یقین کو یوں آگ کی نذر کر دیا۔''

میں بھیا کی سسکیوں اور ماں کی زندگی کی رمق سے خالی ویران آنکھیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ پر آپی کی مجبور و مقہور زندہ لاش کی طرح سسکتے وجود کو دیکھ کر گھٹ کر رہ گئی۔

''آپی! مرد اور عورت اینٹ در اینٹ کسی عمارت کی مانند ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بھروسے کی اینٹ کھسکا دے تو ساری عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔''

اب نہ جانے میں یہاں کب تک بیٹھی رہوں گی جون کی اس تپتی دوپہر کو اپنی بے بس روتی بلکتی ماں جائی کو بے آسرا چھوڑ کر۔ مجھے اب اپنے گھر جانا ہی ہوگا۔

☆☆☆

ایک تصویر، ایک کہانی

ہائے مہنگائی ہائے ہائے...



لیجیے قارئین!

نعرہ سنیے......

'ہائے مہنگائی ہائے ہائے مہنگائی'

لگتا ہے یہ نعرہ آزادی کے بعد تحفتاً ہم ساتھ لائے ہیں۔ مہنگائی کا لفظ سنتے سنتے ہم سیانے ہو گئے مگر مہنگائی کی اٹھان اب بھی کسی کم سن دوشیزہ کی طرح 'بیل منڈھے تو کیا بلکہ آسمان چڑھتی ہی ہے۔ اس مہنگائی کے شکار...... جی ہاں! کوئی اور نہیں' صرف ہم عوام ہیں...... ہم عوام!!!

زیر نظر تصویر میں اگر یہ شخص مہنگائی کا مارا نہ ہوتا...... تو بھلا اس طرح سفر کرتا......

بس اب یہی صورت حال ہے۔ اس سواری کو بھی مال بردار کر دیا گیا ہے۔ ہم تو بس یہی کہہ سکتے ہیں۔

یارو سب دعا کرو......

کبھی نہ کبھی تو یہ مہنگائی کا جن قابو آ ہی جائے گا۔



شوبز نس

ہر دل کی پسند، ہر دل عزیز

حنا دلپذیر

ذیشان فراز

ہر روپ میں ڈھل جانے والی اُس اداکارہ کی باتیں
جسے اگر آج کی سب سے بڑی اداکارہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا

دو تہذیبوں کے سنگم سے حنا دلپذیر خان نے اتنا کچھ لیا کہ وہ نفاست، تعلیم اور حسنِ ظن کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ دریاؤں کی شانتی میں چھپی دبیز خاموشی کو سمیٹتی ہوئی پاکستان کی ورسٹائل فنکارہ حنا دلپذیر خان سے ایک خوب صورت ملاقات......

میری پہلی ملاقات حنا سے فصیح کے گھر ہوئی تھی۔ نہایت باوقار اور مناسب گفتگو کرنے والی یہ خاتون جتنی اچھی اداکارہ ہیں اتنی ہی اچھی انسان بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے جو انہیں درجنوں اداکاروں سے منفرد کردیتی ہے کہ وہ بے حد پڑھی لکھی اور جی توڑ کے کلچرڈ خاتون ہیں۔ دو تہذیبوں کے سنگم سے انہوں نے اتنا کچھ لیا کہ وہ سچ مچ نفاست اور حسنِ ظن کی خوبیوں سے مالا مال ہوئیں۔ ملائم اور شستہ لہجہ، شگفتگی سے بات کہہ دینے کا ہنر...... بڑی جانکاری چاہیے ہوتی ہے، ان کی علمیت اور سمجھداری کی ان تک پہنچنے کے لیے کیونکہ علمیت اور لڑکپن کی اکڑ فوں سرے سے ناپید ہے۔ خوامخواہ اپنی معلومات اور حسیات کا رعب نہیں گانٹھتیں، بڑے میٹھے سروں میں، سلیقے سے کچھ اس طرح جملہ ادا کرتی ہیں کہ اضافیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اپنے موقف میں اتنی یقین کی حد تک مضبوط کہ سوال کرو تو اس کا بھرپور اور پوری طرح موزوں جواب دیتی ہیں۔ نہ ایک لفظ زیادہ نہ ایک لفظ کم۔ بے تکان نہیں بولتیں، تب ہی ان کا جواب ہماری توقع سے پہلے ختم ہو جاتا ہے اور مخاطب کو یہ اندازہ بھی ہو رہتا ہے کہ وہ کسی کھوکھلی شخصیت سے محوِ کلام نہیں۔ سب کچھ آئینے جیسا، جو پوچھو وہی بتاتی ہیں جو نہ پوچھو وہ نہیں بتاتیں، انٹرویو کی طوالت کی وجہ سے میں نے ان کے کہے ہوئے الفاظ بعض جگہوں پر ایک سوال میں کئی کئی جواب سمو دیے ہیں ورنہ انہوں نے ہر بات پوچھنے پر ہی بتائی۔ بھلا اس بے دھڑک شور مچاتے شہر میں کوئی ایسی نپی تلی گفتگو بھی کرسکتا ہے۔ وہ بھی ایک خاتون! یہاں تو لوگ نپا تلا قدم تک نہیں رکھتے۔

سو لیجیے ملاحظہ کیجیے دریاؤں کی شانتی میں چھپی ایک دبیز اور خاموشی کے دامن کو دھیرے دھیرے سمیٹتی ہوئی گفتگو!

☆ آپ نے بڑی تاخیر سے ایکٹنگ کی دنیا میں قدم رکھا، کیا شوق بچپن سے نہیں تھا؟

☆ ڈرامے دیکھنے کا شوق تو یقیناً بچپن ہی سے تھا

اور بڑی رغبت سے ڈرامے دیکھا کرتی تھی مگر یہ 1970ء کی دہائی تک ممکن ہوا پھر اسی عرصے میں والد کے متحدہ عرب امارات کی ایئر لائن میں جاب ہو جانے سے ہم دبئی شفٹ ہو گئے تھے۔ بس آنا جانا لگا رہتا تھا مگر کبھی یہ نہیں سوا تھا کہ میں اس فیلڈ میں باقاعدہ ایک اداکارہ کی حیثیت سے قدم رکھوں گی۔“

✪ آپ کے ایکٹنگ میں آنے سے پہلے کی کچھ باتیں ہو جائیں، کیا گھر سے اجازت وغیرہ ملنے کا مسئلہ ہو سکتا تھا؟

☆ ایسا کوئی خاص نہیں کیونکہ ہمارا گھرانہ بے پناہ پڑھا لکھا تھا جس کا اندازہ اس چیز سے لگا لیجیے کہ ہمارے گھر میں امی کی الگ، ابو کی الگ اور ہم بہنوں کی الگ الگ لائبریاں تھیں۔ سب بڑی سرگرمی سے پڑھنے میں جٹے رہتے تھے۔ ہمیں اس طرح کی بھی ساری آزادی تھی کہ ہم پڑھ لکھ کر جو بھی بننا چاہیں والدین کی طرف سے کوئی رکاوٹ یا دباؤ نہیں تھا، تب ہی میں نے نفسیات میں ایم اے کیا۔



✪ تو کیا آپ نے ساری پڑھائی دبئی سے مکمل کی؟

☆ نہیں مختلف جگہوں سے تعلیم مکمل ہوئی۔ اباجان کی مختلف ملکوں میں پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ پہلے وہ پی آئی اے میں تھے، تب میں کراچی میں کلثوم بائی ولیکا اسکول میں تھی یعنی اسکولنگ کراچی میں ہوئی پھر گریجویشن دبئی اسکائی لائن کالج سے کیا اور ایم اے کراچی یونیورسٹی سے کیا۔

✪ اور آپ کی پیدائش آپ کے اجداد؟

☆ میری والدہ یوپی مراد آباد کی ہیں۔ والد کا تعلق ہزارہ کے علاقے سے ہے۔ کراچی میں میری پیدائش ہوئی۔

✪ دلپذیر خان سے لگتا ہے آپ پشتون فیملی سے تعلق رکھتی ہیں؟

☆ پہلے مجھے اس نام میں کوئی انوکھا پن نہیں محسوس ہوتا تھا یہ میرے ملنے والے اور دوستوں نے توجہ دلائی تو مجھے لگا کہ یہ منفرد نام ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ نام میرے والد کی شخصیت کے عین مطابق ہے۔ دلوں میں گھر کرنے والی بڑی سچی، کھری اور حلیم الطبع شخصیت تھی ان کی۔ میں چھ بہنوں میں دوسرے نمبر پر ہوں۔ والد سے بہت زیادہ اٹیچ رہی ہوں۔ تین سال قبل وہ ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ بڑی باغ و بہار اور روشن خیال سوچ کے مالک تھے۔ ویسے تو ہم پٹھان ہی کہلاتے ہیں مگر میرے والد کی زبان ہندکو تھی۔ تاہم صرف مجھے اور میرے والد کو یہ زبان آتی تھی گھر میں سب اردو ہی بولتے ہیں اور مجھے اردو ادب سے خاص دلچسپی بھی ہے۔

✪ آپ ہیروئن نہیں آئیں مگر شہرت ہیروئنوں جیسی ہے تو کیا ہیروئن کے مقابلے میں کم اہمیت دیے جانے کا کوئی شکوہ کرتی ہیں کبھی؟

☆ ہرگز نہیں کیونکہ ہیروئن سمیت ڈرامے کی پوری ٹیم مجھے اتنی عزت، اپنائیت اور اہمیت دیتے ہیں کہ اس قسم کی شکایت کا خیال تک کبھی نہیں آیا۔

✪ کبھی خیال آتا ہے کہ کاش پہلے آگئی ہوتی اداکاری کے رنگ و بو جہان میں؟

☆ میں تو اب بھی کسی باقاعدہ پلاننگ سے نہیں آئی بلکہ کسی حد تک یہ ایک خوشگوار حادثہ ہی ہے۔ میں کراچی آئی تھی دبئی سے، محض ملنے ملانے، کہانیاں اور شعر لکھنا میرا شغل ہے بچپن ہی سے تو یونہی اپنے لوگوں کے کہنے پر میں اپنی کچھ کہانیاں لے کر ایک چینل پر گئی تھی کہ وہ ان کا ڈراما بنا دیں۔ وہاں مجھے کہا گیا کہ میں ایکٹنگ کیوں نہیں کرتی۔ بس پھر برنس روڈ کی نیلوفر کا اسکرپٹ دیا گیا اور اصرار کیا کہ میں ایکٹنگ کروں۔ میں نے سوچا کہ چلو ایکٹنگ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ تھیٹر کے حوالے سے میں دبئی میں بہت عرصے تک ایکٹنگ کرتی رہی ہوں تو

ایکٹنگ میرے لیے قطعی کوئی اجنبی چیز نہ تھی مگر ٹی وی ڈرامے میں، میں نے پہلے کبھی کام نہ کیا تھا۔ پہلے ہی ڈرامے کی مقبولیت اور پسندیدگی نے سمجھئے مجھے پاکستان میں رک جانے کا موقع فراہم کردیا اور میں یہیں کی ہو گئی۔ ویسے بھی اپنے وطن میں رہنے کا کس کا دل نہیں چاہتا بس میں بھی اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر سرِتسلیم خم کرگئی پھر بہت سی آفرز ملیں اور اب تک مصروفیت ہے۔

دبئی اور رائٹنگ کا کیا بنا؟

☆ میں دبئی میں باقاعدہ دبئی ریڈیو کی اردو سروس میں پروگرام ڈائریکٹر کی حیثیت میں کام کررہی تھی۔ ڈراما لکھتی اور بولتی بھی تھی اتنی مصروفیات کے بعد ظاہر ہے میں اس جاب کو جاری نہیں رکھ سکتی تھی تو میں نے استعفیٰ بھیج دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ جب بھی آپ واپس آنا چاہیں ہم آپ کے منتظر رہیں گے۔ لکھنے لکھانے کا شغل جاری ہے مگر فی الحال میں صرف اپنی ایکٹنگ پر توجہ دیتی رہی ہوں تاہم کچھ عرصے سے کافی سلیکٹو ہوگئی ہوں اور اب لکھنے کو کافی وقت دینے لگی ہوں۔

کیا لکھ رہی ہوں؟

☆ ایک انگریزی ناول کی ڈرامائی تشکیل کررہی ہوں۔ جب کہ ڈراموں کے بہت سے Concepts بھی لکھے ہیں۔ موقع ملا تو ڈراما رائٹنگ میں آؤں گی۔

اگر میں آپ سے ڈراما ایکٹنگ اور رائٹنگ میں سے یہ کہوں کہ آپ کسی ایک کو چن لیں تو آپ کس کا انتخاب کریں گی؟

☆ یقیناً رائٹنگ کا کہ یہ بچپن سے میری رگوں میں شامل ہوکر دوڑ رہی ہے۔ میں خود کو شاعری اور رائٹنگ سے قریب محسوس کرتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ایکٹنگ کی حیثیت کو کم کررہی ہوں۔ میری پہچان ایکٹنگ سے ہوئی ہے مگر میری رگوں میں دوڑتے لہو میں ابتدائی سرسراہٹ لفظوں کے لکھے ہوئے احساس نے پیدا کی۔

آپ کے خیال میں ایکٹنگ کو وہ مقام حاصل ہے جس کی وہ مستحق ہے؟

☆ ہمارے ہاں اب بھی یہ ایک سیریس کام نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ بطور پروفیشن تو جیسے اب بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایکٹنگ کے علاوہ اور آپ کیا کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک بے حد سیریس اور بے پناہ مشکل کام ہے اور اس وقت تھوڑا سا افسوس بھی ہوتا ہے جب پڑھے لکھے لوگ بھی ایکٹنگ کو سنجیدہ امور کا حصہ نہ سمجھتے ہوں۔

اس کی ایک وجہ موجودہ منظرنامہ بھی ہوسکتا ہے جس میں بہت سے مختلف چینلز سے ایک ہی جیسی شکلیں بار بار دکھائی دیتی ہیں۔ لگتا ہے مختلف کرداروں کو بے حد مصروف اداکار نے ایک ہی دن میں مختلف ڈراموں کے سیٹس پر ادا کردیا ہے۔ اس میں ان کی جفاکشی اور سنجیدگی کم ہی محسوس ہوتی ہے؟

☆ ممکن ہے لیکن ایسا ہمیشہ سے ہے۔ جب سال بھر میں اداکار ایک کردار کرتے تھے۔ تب بھی سماجی رویہ اداکار کے لیے اتنا ہی غیر سنجیدہ تھا اور جہاں تک میری بات ہے تو آپ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ میں کام کرتی ہوں اور اپنے ہر کردار میں حتی المقدور محنت کرتی ہوں۔

سچ کہا آپ نے، یہ غالباً آپ کی محبت اور سنجیدگی کی وجہ سے ہی ہے کہ مختلف طبقوں میں آپ کی پہچان اور عزت ایک معیاری اداکارہ کی سی ہے؟

☆ شکریہ۔

آپ اپنے کردار کا انتخاب کیسے کرتی ہیں۔ کردار سن کر یا اسکرپٹ پڑھ کر؟

☆ سننے والے تجربات کافی تلخ ہیں۔ لوگ جب سناتے ہیں تو وہ کچھ اور ہوتا ہے اور اسکرپٹ میں کچھ اور نکلتا ہے اور میں کمٹمنٹ کی بڑی پکی ہوں۔ کہہ دیا تو کرتی بھی ہوں مگر بعدازاں میں نے سننے والے کردار پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب میں اسکرپٹ پڑھ کر ہی کمٹمنٹ کرتی ہوں۔ کم سے کم دو دن پہلے اسکرپٹ چاہیے ہوتا ہے مجھے۔ جو میری اس عادت کو جان چکے ہیں وہ بغیر کہے ہی پہلے اسکرپٹ بھجوادیتے ہیں۔

اسکرپٹ کے بارے میں عمومی رائے یہ ہے کہ ان دنوں اپنا تاثر کھو چکے ہیں۔ زیادہ تر ایک جیسے ہی ہوتے ہیں؟

☆ پوری طرح ایسا نہیں ہے۔ نئے رائٹرز تو ضرور

ٹی کام کرجاتے ہیں مگر پرانے اور جان دار لوگ بڑی عرق ریزی اور محنت سے کام کرتے ہیں۔ پھر بھی بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسے اسکرپٹ کی میں تلاش میں ہوں۔ ان کے اسکرپٹ میں پورا تھیسس ہوتا تھا۔ اشفاق احمد کے لکھے ہوئے اسکرپٹ میں کام کرنے کی خواہش تو اب پوری نہ ہو کہ وہ دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں مگر بانو آپا سے میں نے درخواست کی ہے کہ وہ ایک ڈراما میرے لیے لکھیں۔ میں جلد ہی ان سے ملنے جاؤں گی۔ ان کے اسکرپٹ واقعی ناقابل فراموش ہوتے ہیں۔ اسی تناظر میں، میں یہ کہوں گی کہ پہلے اسکرپٹ میں کوالٹی زیادہ تھی اب کوانٹٹی زیادہ ہے اور کوالٹی کم ہو گئی ہے۔

☆ کیا ڈرامے کے غیر موثر ہونے میں صرف اسکرپٹ ہی ذمے دار ہے کسی اور شعبے کو اس میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے؟

☆ ہرگز نہیں۔ ڈائریکشن اور ایکٹنگ کی اور دیگر سب ہی شعبوں کی بھی ذمہ



داری ہے۔ ایک اچھا ڈائریکٹر ہی ایک اچھے اسکرپٹ کا مزاج سمجھ کے اسے غیر معمولی بنا تا ور وہی ہے جو دیگر شعبوں کا بہترین انتخاب اور ان سے بہترین کام لیتا ہے مگر اسکرپٹ کا معیاری ہونا پہلی شرط ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ پہلے کے اسکرپٹ رائٹر ہوں یا آج کے جو بھی اپنا خونِ جگر دے گا، اسی کا نام روشن بن کے چمکے گا۔ بانو آپا اور اشفاق احمد کے اسکرپٹ میں روحی بانو، عظمیٰ گیلانی اور خالدہ ریاست وغیرہ نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ جن بھی لوگوں نے کام کیا ہے وہ بڑے خوش قسمت لوگ تھے۔

◆ جب آپ ایکٹنگ میں آئیں تو کیا گھر والوں نے اس فیصلے کو بھرپور پذیرائی دی؟

☆ ابا جان نے تو یقیناً بہت حوصلہ افزائی کی۔ باقی خاندان والوں نے رائے دی۔ کچھ ہماری تربیت بھی ایسی مضبوط ہوئی ہے کہ ہمیں اپنی ساری ویلیوز اور حدود و قیود کا پتا ہے۔ خصوصاً ایک عورت ہونے کے ناتے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا دائرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہو جاتا ہے۔ عزت سے جینا ہی انسان کی اصل دولت ہے۔ ورنہ میں یونیورسٹی، کالج میں کسی اسکول میں پڑھا سکتی تھی مگر میں پوری ذمہ داری سے ایکٹنگ کر رہی ہوں اور جب کوئی یہ کہتا ہے تو میرے خیال سے ہر انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری نظر میں ایکٹنگ کو کیا مقام اور حیثیت حاصل ہے۔

◆ آپ کی ایکٹنگ سے محبت کرنے والے لوگ کیسا رسپانس دیتے ہیں؟

☆ سچ پوچھئے تو بڑی عزت ہے لوگوں کی نظروں میں۔ جس کے لیے میں سب ہی لوگوں کی شکر گزار ہوں۔

◆ اب بلبلے اور مومو پر آتے ہیں۔ اس پروگرام نے آپ کو ایک نئے طرز کی شہرت دی ہے۔ کیا اس سے آپ کی سیریس نس کو کوئی نقصان پہنچا ہے؟

☆ میں سمجھتی ہوں کسی بھی فنکار کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اپنے لوگوں کو کس حد تک حیران کیا ہے۔ اس کردار نے لوگوں کو بے حد حیرت انگیز خوشگواریت دی ہے۔ وہ خوش ہیں اور بہت محظوظ ہوتے ہیں اور یہ میرے لیے بہت اطمینان کی بات ہے کہ انہوں نے میری اس مختلف اداکاری اور کردار کو یوں سراہا ہے۔

◆ کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ آپ نے مومو کے کردار میں ماضی کی اداکارہ رومانہ کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ یہ ایکٹنگ اسٹائل انہی کا تھا؟

☆ شکر ہے کہ آپ نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ میں اسے کسی بھی طرح غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہی بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ وہ مجھ سے بہت بہتر اداکارہ تھیں۔ ایسے کرداروں میں تو کمال تھیں مگر جب میں نے یہ کردار ادا کیا تو میرے ذہن میں دور دور تک ان کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ میں جو بھی کردار ادا کرتی ہوں اس سے میں اپنی زندگی میں لازمی ملی ہوتی ہوں۔ اب تک جتنے بھی کردار میں نے ادا کیے ہیں، ان سے میں کہیں نہ کہیں ملی ہوں۔ کردار آتے جا رہے ہیں اور میں انہیں پورٹرے کرتی جا رہی ہوں اور ابھی بہت سے کردار باقی ہیں جو میں ادا کروں گی۔ مومو والا کردار بھی مجھے جیتا جاگتا ابوظہبی میں ملا تھا۔ ان بے حد معصوم اور کسی قدر احمق خاتون کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ میں اس کردار کو کبھی نہ کبھی ضرور ادا کروں گی۔ جب بلبلے میں مجھے مومو کا کردار ملا تو میں نے اس ارادے سے اس سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اب یہ حسن اتفاق ہے کسی حد تک رومانہ سے مشابہت رکھتا ہے تو میں اسے ایک خوب صورت اتفاق ہی کہہ سکتی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ لوگوں نے اس حوالے سے میری صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔

◆ کیا مزاحیہ کردار زیادہ مقبولیت کا باعث بنتے ہیں؟

☆ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ ڈیپنڈ کرتا ہے کہ کردار کی ادائیگی کیسی ہوئی ہے۔ لے چونکہ ریپٹ بھی بہت ہوتا ہے تو لوگوں کو زیادہ یاد رہتا ہے، ورنہ میں نے مشکور صاحب نامی کھیل میں چھ مختلف کیریکٹرز کیے تھے وہ بھی بہت پسند کیے گئے تھے مگر وہ ڈراما ریپیٹ نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم ایک اداکارہ کی حیثیت سے میں ہر چیلنج کو قبول کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے اب تک بڑی اچھی رائے اور بھرپور پسندیدگی ملتی رہتی ہے۔

◆ برنس روڈ کی نیلوفر، ایک ادھوری ماں لیکن ایک بات

ہے، بچھو پھوپھی (عصمت چغتائی)، چنچل پریاں، شگوا صاحب، چل جھوٹی، ایک قیامت اور رونق جہاں کا نفسیاتی گھرانہ، بے لوز ندگی، مجھے ہے حکم اذاں، قدوسی صاحب کی بیوہ اور بلبلے ان سب اور ایسے بہت سے ڈراموں میں کام کرنے کے بعد اپنے کس کیریکٹر کو آپ خود سے بہت قریب سمجھتی ہیں؟

☆ میرا خیال ہے یہ سب بہت اچھے تھے مگر ایسا کیریکٹر اب تک نہیں آیا جسے میں خود سے قریب کہہ سکوں۔ سچ پوچھئے تو میں اس کی وضاحت بھی نہیں کرسکوں گی، بس جب بھی میرے سامنے آئے گا اور جو مجھے میرے اندر تک پوری گیرائی اور گہرائی سے چھو لے گا تو میں اس کا اظہار کردوں گی۔ فی الحال میں اس کا انتظار بھی نہیں کر رہی۔ بس مل



ڈرامہ سیریل 'قدوسی صاحب کی بیوہ' میں حنا دلپذیر اپنے یادگار کرداروں کے ساتھ

جائے گا تو میں کہہ ضرور دوں گی۔

حنا دلپذیر کی 1992ء میں شادی ہوئی جو 1998ء میں ختم ہوگئی۔ ان کا ایک بیٹا ہے مصطفیٰ دلپذیر خان، حال ہی میں بیٹے نے میٹرک کیا ہے۔ وہ پائلٹ بننے کے شوقین ہیں جب کہ حنا کے والد فلائٹ انجینئر تھے۔ تاہم بیٹے کو فزکس سے بڑی زبردست دلچسپی ہے اور کیمسٹری ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میوزک سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ پڑھنے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ بہت سارے تقاضوں کے باوجود حنا نے اپنے بیٹے کی ضرورتوں اور محبت میں دوسری شادی نہیں کی۔ پھر بھی وہ سمجھتی ہیں کہ اللہ نے ان کی دوسری شادی لکھی ہوئی ہے تو ہو بھی سکتی ہے۔ 16 جنوری (Capricorn) کو پیدا ہونے والی حنا کو ستاروں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کیونکہ انہیں اپنے خدا پر پورا بھروسا ہے جو انسان اچھے شعر کی داد نہ دے وہ ایسے انسان کو جمالیات سے عاری سمجھتی ہیں۔ شاعروں کو پڑھنے کی حد تک انہوں نے مومن، ذوق، میر، درد، افتخار عارف اور احمد فراز کو بھی پڑھا ہے مگر ان کے پسندیدہ شاعر غالب اور فیض احمد فیض ہیں۔

''میری ادھوری محبت'' نورالہدیٰ شاہ کے ڈراما سیریل میں بھی وہ کام کرچکی ہیں جب کہ انور مقصود اور بانو قدسیہ کے لکھے ہوئے کرداروں میں کام کرنے کی انہیں تمنا ہے۔

فصیح باری خان ان کی عادت ہیں، اس رائٹر سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ فصیح بڑی گہرائی سے یاد رہ جانے والی چیزیں لکھتے ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں اچھے رائٹر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ مظہر معین، احسن طالش، ہاشم اور رانا رضوان، ان کے پسندیدہ ڈائریکٹرز ہیں۔ منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ڈپٹی نذیر احمد اور قرۃ العین حیدر ان کے مطالعے کی اولین فہرست میں شامل ہیں۔

حنا کو گھومنے کا بہت شوق ہے۔ وہ اداکارہ نہ ہوتیں تو سیاح ہوتیں۔ انہوں نے انگلینڈ، متحدہ عرب امارات، یمن، ترکی دیکھے ہیں۔ انقرہ میں آبی محل ان کی پسندیدہ جگہ ہے جو پانی کے اندر بنا ہوا ایک خوب صورت محل ہے۔ پاکستان میں مری سے آگے ایک جگہ ایسی ہے جو انہیں بہت پسند ہے۔ یہاں بادل پیروں کے نیچے سے گزرتے ہیں۔

حنا دلپذیر ایک ایسی شخصیت ہیں کہ لوگ جن کے ساتھ کبھی شکایت کرتے ہوئے نہیں ملتے کیونکہ وہ ہر ایک کو اس کی مرضی سے جینے کا حق دیتی ہیں۔ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی انہیں کبھی عادت نہیں رہی اور یہی بہترین معاشرے کی تعمیر کا راز بھی ہے۔

☆☆☆

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

رنگین کہانیاں

جھوٹا گواہ

فوزیہ فرید احمد

اُس مرد کا قصہ عبرت، جس نے زمین پر زن اور زر کے حصول کے لیے ہر حربہ اپنایا مگر.....

نعیم صاحب ہمارے گھر سے ایک گلی آگے رہا کرتے تھے ان کی عمر تقریباً 75 سال سے بھی اوپر تھی۔ مگر اچھی صحت کے باعث وہ اپنی عمر سے کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ سرخ وسپید اور خاصے چاک وچوبند انسان تھے۔

ان کی فیملی میں ان کی بیوی حاجرہ بیگم، بیٹیاں انیسہ، رئیسہ، شائستہ اور شگفتہ تھیں ان چار بیٹیوں کے بعد ان کا بیٹا کلیم تھا۔ جو ابھی پڑھ رہا تھا۔ نعیم صاحب نے اپنی بیٹیوں کو بھی اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ تین بیٹیاں شادی شدہ تھیں جبکہ ابھی ایک بیٹی تعلیم سے فارغ ہوئی تھی۔

ان کی بیوی حاجرہ بیگم محلے کے بچوں کو دینی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی شگفتہ بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔

غرض کہ انھوں نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی تھی مگر شاید ان کی اپنی تربیت اچھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ محلے کی عورتوں کو بری نظر سے دیکھا کرتے تھے اور ان کو نازیبا قسم کے کلمات کہا کرتے تھے۔ وہ عورتوں ہی کو نہیں بچیوں کو بھی نہیں بخشا کرتے تھے۔ کم عمر بچیوں سے بھی گھٹیا قسم کی گفتگو کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ ان کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنے بچوں کو ان کے گھر بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ان کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ وہ گھر سے باہر بیٹھ کر ہر گزرتی عورت اور لڑکی کو بری نظر سے دیکھنے کا شغل فرمایا کرتے تھے۔ انھیں نہ تو اپنی عمر کا لحاظ تھا اور نہ ہی اس کا خیال کہ وہ خود بھی چار بیٹیوں کے باپ تھے۔

ان کے گھر کے سامنے ایک بیوہ عورت رہتی تھی جس کا نام تبسم تھا۔ لوگ انھیں تبسم آپا کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹے اور دو ہی بیٹیاں۔ وہ نہایت شریف عورت تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ خود جاب کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ آدھا گھر کرائے پر اٹھا کر وہ اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھی لوگ اس عورت کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ نعیم صاحب کی اس بیوہ عورت پر بھی نظر تھی۔ انھیں جب موقع مل جاتا ان کے گھر پہنچ جایا کرتے ہمدردی کی آڑ میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ تبسم آپا کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے گھر بڑی ڈھٹائی سے پہنچ جاتے۔ کئی بار

تبسم آپا نے ان کی شکایت ان کی بیوی سے بھی کی کے مطابق وہ ان کی بیٹیوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کیا
تھی مگر ان پر تو کوئی جوں تک نہ رینگی تھی۔ عادت کرتے تھے۔ تبسم آپا نے شوہر کے انتقال کے بعد



بڑی مشکلیں اٹھائی تھیں مگر وہ ثابت قدم رہیں۔ اب نعیم صاحب ان کی ساری شرافت پر پانی پھیرنے پر تلے ہوئے تھے۔

تبسم آپا کی شکایت پر حاجرہ بیگم نعیم صاحب کو سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ محلے کی عورتیں ان کی ان حرکتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ ایسا نہ کیا کریں۔"

وہ معصوم ہنستے ہوئے کہتے کہ میں تو ان کی بھلائی چاہتا ہوں۔ لو بھلا نیکی کا تو، زمانہ ہی نہیں ہے۔"

حاجرہ بیگم بے چاری چپ ہو جایا کرتیں۔ ان کا بیٹا ابھی چھوٹا تھا۔ وہ باپ کے مد مقابل نہیں آ سکتا تھا اسی لیے نعیم صاحب زندگی انجوائے کر رہے تھے۔

کہتے ہیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب یہ چلتی ہے تو بڑے زور کی پڑتی ہے، تب انسان کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جانے انجانے میں کیا کچھ کر بیٹھا ہے لیکن تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

نعیم صاحب کی خامیوں میں نمایاں خامی ان کا جھوٹ بولنا بھی تھا۔ وہ عدالت میں جھوٹی گواہی دینے کے سلسلے میں بھی مشہور تھے۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہی دینے کے عوض وہ تگڑے پیسے وصول کیا کرتے تھے۔ جس کسی کی بھی عدالت میں کوئی مسئلہ در پیش ہوتا اور گواہی کا معاملہ آتا تو وہ نعیم صاحب سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔

مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے وقت ان کے ہاتھ نہیں کانپتے تھے۔ نعیم صاحب جانتے تھے کہ جھوٹی قسم کھانا' وہ بھی اس عظیم کتاب پر ہاتھ رکھ کر، اللہ تعالیٰ انھیں اس برے عمل کے بدلے عذاب میں بھی مبتلا کر سکتا ہے انھیں شاید ان باتوں کا علم نہ تھا یا انھوں نے یہ بات جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ انھیں تو اُن پیسوں سے مطلب تھا جو انھیں قسم کھانے کے عوض ملا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نعیم صاحب کی رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی اور جب کھینچی تو انھیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔

ایک رات اچانک نعیم صاحب کے پیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھا۔ درد کی شدت سے نعیم صاحب بے آب مچھلی کی طرح مچل رہے تھے۔ ان کی بیگم شوہر کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں، بچے بھی سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ حاجرہ بیگم نے اپنے بیٹے کلیم کو برابر والے گھر سے انیس بھائی کو بلوایا۔ کیونکہ ان کے گھر میں سوائے نعیم صاحب کے اور کوئی مرد نہ تھا اور نعیم صاحب کی حالت ایسی تھی کہ انھیں ہاسپٹل لے جانا ضروری تھا۔ ایسے میں پڑوس کے انیس بھائی کی مدد بے حد ضروری تھی۔

انیس بھائی کچھ ہی دیر بعد آ گئے انھوں نے فوری طور پر ٹیکسی کا انتظام کیا اور نعیم صاحب کو لے کر اسپتال روانہ ہو گئے۔

اسپتال میں نعیم صاحب کا چیک اپ ہونے پر پتا چلا کہ ان کے معدے میں انفیکشن ہو گیا ہے۔ کچھ دوائیں وغیرہ دے کر ڈاکٹر نے انھیں فارغ کر دیا اور نعیم صاحب گھر آ گئے۔ کچھ پرہیزی کھانوں اور دواؤں کی وجہ سے نعیم صاحب ٹھیک ہو گئے۔

ایک ڈیڑھ مہینے بعد اسی قسم کا درد نعیم صاحب کو دوبارہ اٹھا۔ اب اکثر ایسا ہونے لگا اس درد کی وجہ سے نعیم صاحب کمزور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ بستر سے لگ گئے۔ ایک رات نعیم صاحب ایسا سوئے کہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔

فجر میں ان کی بیگم ان کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے آئیں کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ نعیم صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بستر پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ حاجرہ بیگم نے پہلے تو انھیں آوازیں دیں مگر جب ان میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو انھیں ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ رات کے نا جانے کون سے پہر خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ حاجرہ بیگم اس بات کا احساس ہوتے ہی فوراً پڑوس کے گھر کی طرف بھاگیں اور انیس بھائی کو آوازیں دیں۔ محلے کے اور بھی مرد نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جا رہے تھے'

حاجرہ بیگم کو بدحواس دیکھ کر اور پڑوس کا دروازہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کھٹکھٹاتا دیکھ کر کچھ لوگ ان کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ کیا ہوا سب خیریت تو ہے نا۔ حاجرہ بیگم نے روتے ہوئے انھیں نعیم صاحب کی حالت کے بارے میں بتایا۔لوگ فوری طور پر ان کے گھر کے اندر گئے اور جب انھوں نے نعیم صاحب کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ نعیم صاحب دنیا کے جھمیلوں سے آزاد ہو گئے ہیں۔

قصہ مختصر ان کی بیٹیوں کو اطلاع دی گئی۔ایک بیٹی لاہور میں رہتی تھی اسے آنے میں ٹائم لگتا اس لیے ان کی تدفین ظہر کے وقت ممکن نہ تھی وہ جس وقت کراچی پہنچتی تب ہی ان کی تدفین ہوتی۔عصر کے بعد ان کی بیٹی شائستہ کی آمد ہوئی۔اس کی آمد پر ماحول پر ایک بار پھر سوگواریت چھا گئی تھی۔نعیم صاحب نے اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا تھا اسی لیے بچوں کے دل میں بھی ان کے لیے بہت محبت تھی۔اس کا تڑپ تڑپ کر رونا کسی سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔عشا کی نماز کے بعد ان کی نماز جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔نماز جنازہ ادا کر کے لوگ قبرستان روانہ ہو گئے، جو ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا اس لیے لوگ پیدل ہی روانہ ہو گئے تھے۔

یہ لوگ عشا کے بعد روانہ ہوئے تھے اور اب تک قبرستان آ جانا چاہیے تھا مگر انھیں چلتے چلتے کافی ٹائم ہو گیا تھا مگر اب تک قبرستان نہ آیا تھا اتنی دیر تک چلتے رہنے سے اب کا برا حال ہو چکا تھا۔

اللہ اللہ کر کے قبرستان کا دروازہ نظر آیا تو لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور قبرستان میں داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی یہ لوگ حیران رہ گئے قبرستان میں چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا اور ساری قبریں پانی میں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔یہ عجیب بات تھی۔ بارش تو ہوئی نہیں تھی پھر یہ پانی کہاں سے آ گیا تھا۔ان سب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے پہلے قبرستان نہیں مل رہا تھا، اب ملا تو ہر طرف پانی موجود تھا۔ یہ سب قبرستان میں ایک جگہ تلاش کرنے لگے جہاں پانی نہ ہو۔ کافی دیر تلاش کے بعد بالآخر ایک جگہ مل گئی جو تھوڑی اونچائی پر تھی۔لوگوں نے گورکن کو بلوایا اور اسے قبر کھودنے کو کہا۔ بڑی مشکلوں سے اسے راضی کر کے قبر کھدوائی گئی۔کافی ٹائم گزر گیا تھا تب کہیں جا کر قبر تیار ہوئی تھی۔لیکن اب مسئلہ پیدا ہو گیا تھا قبر کے اندر کوئی بھی اترنے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ لوگوں کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب تک یہ لوگ جن مشکلات سے دوچار ہوئے ہیں وہ سب نعیم صاحب کے اعمال کے نتیجے میں پیش آئی ہیں۔کہیں وہ بھی اس کی زد میں نہ آ جائیں۔اس کے لیے بھی گورکن کو راضی کیا گیا اور نعیم صاحب کے جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا گیا۔

ابھی یہ لوگ سلیں برابر ہی کر رہے تھے کہ نا جانے کہاں سے ایک بہت ہی وزنی پتھر نعیم صاحب کے سینے پر جا گرا۔

یہ منظر دیکھ کر لوگ خوف سے کانپ اٹھے اور سب کی زبان پر توبہ استغفار جاری ہو گیا مردے کے لیے مغفرت کی دعائیں کر کے اور تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جب یہ لوگ قبرستان سے باہر نکل رہے تھے تو اس وقت صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو چکا تھا یہ پہلا موقع تھا کسی مردے کی تدفین میں اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

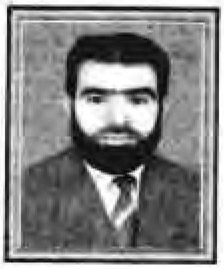
لوگ نعیم صاحب کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے ادھر اہلِ محلہ کے باقی لوگ انھیں ڈھونڈنے کی غرض سے قبرستان کی طرف آ رہے تھے ان سب کو دیکھ کر وہ سب تیزی سے ان کی طرف بڑھے اور اتنی دیر ہونے کی وجہ پوچھی۔ جب انھیں ان تمام معاملات کا علم ہوا تو وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگے، سب لوگ استغفار پڑھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

نعیم صاحب پیسوں کی خاطر جھوٹی گواہی دیا کرتے تھے۔وہ پیسہ ان کے کسی کام نہ آیا۔وہ اپنے گناہوں کو اور ملنے والے عذاب کو ان پیسوں سے دور نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

دوسری مرد کہانی

انگور کی بیٹی



مجید احمد جائی

اُس شخص کی بربادی کی داستان، جس نے انگور کی بیٹی سے رشتہ جوڑ لیا تھا

میں کرائے پر مکان حاصل کرنے کے لئے مارا مارا پھر رہا تھا۔ ہوٹلنگ کرتے کرتے جیب میں بیلنس کی کمی ہوتی جا رہی تھی اور آگے مجھے گہری تاریکی واضح نظر آ رہی تھی۔ کراچی جیسے بے ہنگم شہر میں اکیلے بندے کو کرائے پر مکان ملنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ روشنیوں کے اِس شہر میں جہاں اب روشنی کم اور خوف و ہراس ہر چہرے پر زیادہ نظر آتا ہے، میں کئی دنوں سے بہت سی جگہوں پر اپنے تئیں پتا کر چکا تھا لیکن مکان ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ لوگ اکیلے آدمی کو خون خوار نظروں سے دیکھتے ہیں۔

میں اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی میں ذریعہ معاش کے لئے آیا تھا۔ اپنے شہر کے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ کراچی میں بہت کام ہے، اسی لئے تو اِس کو منی پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کراچی، کرچی کرچی نہیں تھا۔ امن، سکون تھا، اور لوگ اِسے روشنیوں کا شہر کہتے تھے۔ خوف و ہراس نہیں تھا۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے اِس شہر میں کرائے پر مکان نہیں مل رہا تھا۔ میں تن تنہا اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی جیسے بے درد شہر میں آ گیا تھا۔

میرے پیچھے گھر میں بوڑھے ماں باپ اور ایک بہن تھی، جو اسکول جاتی تھی۔ میرا ابا گھر کے باہر سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا لیکن اب اُس کی ہڈیاں کمزور اور بوڑھی ہو چکی تھیں۔ اِس مفلسی، غربت اور افلاس بھرے آنگن میں خوشیاں صرف اُسی ذات کی وجہ سے تھیں۔ اب مجھے اِس گھر میں فاقوں کے طوفان کو روکنے اور خوشیوں کے شامیانے سدا برقرار رکھنے تھے۔ ماں کی نظریں مجھ پر تھیں اور چھوٹی بہن کی ننھی ننھی فرمائشیں مجھے پوری کرنی تھیں۔ بیچاری بیمار ”ابا“ کو دیکھ کر سہم سی جاتی تھی۔ اکثر لاڈ و کھیلتے ہوئے مجھ سے کہتی۔

”بھیا! ابا دن بھر ریڑھی لگاتے ہیں اور جو کماتے ہیں، اُس سے بڑی مشکل سے گھر کا گزر بسر ہوتا ہے۔ مجھے ابا سے خرچی مانگتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ بھیا! آپ میری خواہشیں، میری فرمائشیں پوری کریں گے ناں؟“ تو میں کہہ دیتا۔

”میری سوئٹ نازو...... بس تھورا انتظار اور...... مجھے نوکری مل جائے گی تو اِس گھر میں غربت، بھوک، موسم کی طرح خوشیوں میں بدل



جائے گی۔ جیسے خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ بالکل اسی طرح۔“

میں بی۔اے کر کے نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اپنے شہر کا چپہ چپہ، قریہ قریہ چھان مارا تھا لیکن نوکری نہیں ملی تھی۔ سرکاری اداروں میں درخواستیں دیں۔ انٹرویوز بھی ہوئے لیکن صرف دھکے ہی ملے۔ نوکری امیرزادوں کو کسی ڈش کی طرح پیش کر دی جاتی۔ اس زمانے میں غریب گھر کے لڑکوں کو دھکے نصیب ہو جائیں، بڑی بات ہوتی ہے۔ اکثر تو چپڑاسی سرکاری اداروں میں داخل ہی نہیں ہونے دیتے۔

میں نے سینکڑوں جگہ اپلائی کیا۔ درجنوں انٹرویوز بھی ہوئے۔ ایک دو جگہ کام بنتے بنتے رہ گیا۔ وجہ ریفرنس نہیں تھا۔ میں کسی امیر، کبیر کا بیٹا تو نہیں تھا ناں میرے پاس رشوت بھی تو نہیں تھی۔ کون سپورٹ کرتا۔

☆......☆

ایک شام نازو کے ساتھ لڈو کھیل رہا تھا۔ نازو نے کہا۔

”بھیا! ایک مشورہ ہے کہو تو عرض کروں؟“

”نازو! عرض نہیں حکم کرو بندہ حاضر ہے۔“

”بھیا! میری سہیلی کا بھائی کراچی میں کام کرتا ہے۔ جب بھی گھر آتا ہے اپنی بہن کے لئے ڈھیروں گفٹ لے کر آتا ہے۔ کپڑے، پرفیوم اور بہت کچھ انعم کہتی ہے، کراچی میں میرے بھائی بہت کماتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں۔ آپ بھی کراچی چلے جاؤ۔ ابا کو ریڑھی نہیں لگانی پڑے گی اور اس گھر کے حالات بدل جائیں گے۔“

نازو کا مشورہ ٹھیک ہی تو تھا۔ مجھے اپنے شہر سے باہر نکلنا چاہیے۔

☆......☆

ٹرین کا سفر تھکا دینے والا تھا، زندگی کے مہ و سال کی طرح کئی جنکشن گزرے اور آخر کراچی آ گیا۔ اب کراچی کی سڑکیں تھیں، میں تھا اور میری بے بسی تھی، نوکری کی تلاش جاری تھی۔ انڈسٹریز ایریا

کے ایک پارک میں میری ملاقات نوید سے ہوگئی۔ وہ بھی اپنے شہر سے یہاں نوکری کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ میری طرح اُسے بھی کمرے کی تلاش تھی۔ کئی جگہوں پر کوشش کر چکا تھا، لیکن مایوسی ہوئی تھی۔ اب ہم دو ہو گئے تھے۔ لازمی امر تھا کہ مکان مل جانا تھا۔ گھنٹہ بھر کی ملاقات میں نوید نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہم دونوں دوست بن

گئے۔ مصیبت میں بنے والا دوست ہمیشہ کام آتا ہے۔ ہم دونوں پارک سے نکلے اور مکان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔

میں اُسے وہاں لے گیا۔ جہاں پہلے میں اکیلا جا چکا تھا۔ خیر تھوڑی تگ ودو کے بعد مکان کرائے پر مل گیا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اور ہمیں دوسری منزل پر فلائٹ ملا تھا۔ تھوڑی تگ ودو کے بعد نوکری بھی مل گئی اور ہم برسر روزگار ہو گئے۔ دن بھر کام کرتے اور شام کو اپنے مکان پہ آجاتے۔ نوکری ملنے کی خوش خبری میں نے گھر بتا دی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ اسی دوران دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ میں ایک بار گھر ہو آیا تھا۔ گھر کا نظام بہتر ہو گیا تھا۔ ابا نے ریڑھی لگانی چھوڑ دی تھی۔ میں ہر ماہ باقاعدگی سے پیسے بھجواتا رہتا تھا اور نازو کے لئے کپڑے، جوتے بہت سے گفٹ بھی۔ اب مجھے نازو کی شادی کی فکر ستاتی تھی اور جہیز کے لئے رقم جمع کرنی تھی۔ اس سلسلے میں خاصی رقم اکٹھی کر بھی لی تھی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا۔

یہ اتوار کی شام تھی۔ کام سے چھٹی تھی۔ دن بھر شہر کی سیر کرنے کے بعد واپس لوٹے تھے اور اب اپنے مکان پہ گپیں ہانک رہے تھے۔ نوید۔ تین دوست بنا چکا تھا، وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ میرا دو سالوں میں نوید کے علاوہ کوئی دوست نہیں بنا تھا۔ اُس شام پارٹی تھی۔ کھانے کا اہتمام گھر پر کیا گیا۔ میں بریانی بڑی لذیز بنا لیتا ہوں۔ نوید کے دوست ڈرنک لائے تھے۔ خوب انجوائے کرنے کا پروگرام بنا تھا۔ میں بریانی بناتا رہا اور نوید اپنے دوستوں کے ساتھ صحن میں گپیں ہانکتا رہا۔ میں نے نوید کو آواز دی۔

''نوید! دستر خوان لگا لو۔ بریانی تیار ہے۔'' میں تھوڑی دیر ستانے لگا۔

جب نوید نے مجھے بلایا تو دستر خوان سجایا جا چکا تھا۔ ڈرنک کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے بھی بھوک لگی تھی۔ ہم بریانی کے ساتھ انصاف کرنے لگے۔ درمیان میں نوید نے ایک بوتل کا ڈھکن کھولا اور گلاس میں انڈیلنے لگا۔ بوتل سے عجیب سی خوشبو اٹھی اور فضا میں پھیل گئی۔ نوید نے گلاس سب سے پہلے میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

''لو۔ یار! مزے اڑاؤ۔ آج کی پارٹی یادگار رہے گی۔ انجوائے کرو۔ شراب کا نشہ ہی کمال کا ہوتا ہے۔''

''شراب؟ شراب۔''

''نہیں۔ میں نہیں پیوں گا۔ شراب۔''

''یار کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے۔ یہ ایسی چیز ہے۔ جو غم بھلا دیتی ہے اور پھر ایسی پارٹی روز روز تھوڑی ہوتی ہے۔''

''نہیں۔ میں شراب نہیں پی سکتا۔ مجھے شراب سے شدید نفرت ہے۔''

میرے ذہن پہ ہتھوڑے پڑنے لگے۔ میں ابھی تک وہ منظر، وہ الفاظ نہیں بھولا تھا۔ شراب نے پل بھر میں ہنستی مسکراتی زندگیاں ختم کر دی تھیں۔ بہاریں روٹھ گئیں تھیں۔ قہقہے سسکیوں میں بدل گئے تھے۔ شوخیاں، اُداسیوں میں بدل گئی تھیں۔ وہ منظر کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں دوڑ کر وہ ڈائری اُٹھا لایا، جو مجھے ہر وقت شراب پینے سے روکتی تھی۔ پھر میں گویا ہوا۔

کالج میں نئے اسٹوڈنٹ کی آمد کا پہلا دن تھا اور ہمارا گروپ مکمل تیاری کر چکا تھا۔ نئے آنے والوں کا استقبال کرنا بھی تو ضروری تھا۔ ہر لڑکے نے مختلف رنگوں کے ڈبے اٹھائے ہوئے تھے۔ سبھی لڑکے شرارتی تھے، جن میں، میں بھی شامل تھا۔ ہمارا لیڈر کامران تھا، جسے سبھی کامی کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمارے گروپ کا پورے کالج پر راج تھا، ہم ہر انویٹ میں بھر پور حصہ لیتے تھے۔ شرارتیں ہوتیں۔ لڑائی جھگڑے ہوتے۔

وہ بھی سہانی صبح تھی۔ کامران گیٹ کے ساتھ پارک میں گھاس پر لیٹا تھا اور ہم نئے آنے والوں کی واٹ لگانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اتنے میں ایک مہ جبیں گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ جیسے ہی اُس کے قدم گیٹ سے اندر پڑے، ہمارے گروپ نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ پھر کیا ہماری کارروائی شروع

ہوگئی۔ ویلکم... ویلکم... بہت بسم اللہ۔

یاروں! دیکھو تو یہ دہشت گرد ہی لگتی ہے۔ کہیں اُس نے بارودی جیکٹ تو نہیں پہنی ہوئی۔ تلاشی تو کرو۔ آج کل دہشت گرد بھی کتنے حسین ہوگئے ہیں۔ ہم مذاق کر رہے تھے اور مہ جبیں گھبرا رہی تھی۔ عادل آگے بڑھا تو دوشیزہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اُس کی مخملی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ابھی پھوٹ کر رو دے گی۔ میں بہت انجوائے کر رہا تھا۔ جلتی پہ تیل والا کام کرنے کے لئے میں آگے بڑھا ہی تھا کہ کامران کی گرجتی ہوئی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

رُک جاؤ۔ جانے دو اِسے۔

لیڈر کا حکم تھا جسے ہر حال میں ماننا تو تھا۔ تمام لڑکے پرے ہٹ گئے اور حسینہ آنکھیں ملتے ہوئے کلاس کی طرف چل دی۔ میں غصے سے بڑبڑاتا ہوا کامران کی طرف چل دیا۔

یار! تمہیں کیا پرابلم ہے۔ کتنی پیاری آئٹم ملی تھی۔ ہمیں تو مزا آرہا تھا اور تم ہو کہ کیا تمہاری بہن لگتی تھی؟ ہم اپنے لیڈر سے اِس طرح کی باتیں کر لیتے تھے۔ کامران اک دم کہیں کھو سا گیا اور پھر جوش سے بولا۔ ہاں ہاں۔ میری بہن لگتی ہے۔ اُس کو دیکھتے ہی اپنی بہن کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے چھا سا جاتا ہے۔ تم تو جانتے ہو۔ میں برسوں سے بہن کے پیار میں تڑپ رہا ہوں۔ کاش کہ میری بہن میرا ساتھ نہ چھوڑ جاتی۔ وہ شرارتیں، وہ اٹکھیلیاں۔ وہ ہنسی مذاق میں ابھی تک نہیں بھولا۔

☆......☆

کامران کی بہن ایف۔ اے کی طالبہ تھی۔ کالج سے واپس گھر جاتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آکر موقع پر دم توڑ گئی تھی۔ کامران کے آنگن میں غموں کا راج ہوگیا۔ ماں کو چپ لگ گئی۔ اپنے باپ کی لاڈلی تھی۔ بیچارہ باپ اجڑ سا گیا، ہر وقت گم صم سا رہتا تھا اور کامران۔ غم بھلانے کے لئے کالج آگیا تھا۔ اُداسی کے دورے اُسے بیٹھے بیٹھے پڑ جاتے تھے۔ جس طرح آج پڑا تھا اور میں کامران سے مختلف تھا۔ میں اِن باتوں پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ زندگی انجوائے کرنے کا نام ہے۔ زندگی کو خوشی خوشی جینا چاہیے۔ غم و درد الم تو زندگی میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ انسان کو اتنا بزدل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ذرا سی چوٹ لگی اور سگریٹ پکڑ لیا۔ نشہ کرنے لگے۔ میخانے جانے لگے۔ ایک غم بھلانے کے لئے ہزاروں غموں کو پلے باندھ لے۔

مجھے ایسے افراد پسند نہیں ہیں۔ انسان کو خوش مزاج رہنا چاہیے۔ ہر لمحہ مسکراہٹ، قہقہے ہوں، موج مستی ہو بس لیکن میں غلط تھا۔ بعض غم ایسے ہوتے ہیں جو دیمک کی طرح انسان کو اندر ہی اندر چاٹتے رہتے ہیں، جو بھلائے نہیں بھولتے۔ آخر انسان کو ختم کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔ یہی حال کامران کا بھی تھا۔

بہن کی جدائی برداشت نہیں کر پایا تھا اور اُس نے سگریٹ پینا شروع کر دی تھی۔ مہ خانے جانے لگا تھا اور پھر شراب کی محفلیں جمنے لگی تھیں۔ اب تو شراب وہ ہوسٹل بھی لے آتا تھا اور اپنے روم میں جام کے جام پیتا تھا۔

ہاں ہم ہوسٹل رہتے تھے۔ کامران نجانے کس طریقے سے شراب اپنے روم لے آتا تھا۔

☆......☆

مہ جبیں شریف گھرانے سے تھی۔ اُس کا باپ فوت ہو چکا تھا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ صرف ماں کا واحد سہارا تھا۔ ماں کوٹھیوں میں برتن، کپڑے دھو دھو کر بیٹی کو پڑھا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی شہزادی اسکول سے کالج تک آگئی تھی۔ اُسی دن چھٹی کے وقت کلاس روم سے نکلتے ہی ہماری طرف چلی آئی۔ ہم کامران کے ساتھ پارک میں بیٹھے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ شہزادی نے پاس آتے ہی سلام کیا۔ ذرا سی جھجکی، پھر گویا ہوئی۔ معاف کیجئے گا۔ میں کامران بھیا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں۔

وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے، میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کامران کو اکیلا چھوڑ دیا۔ بعد میں، کامران سے میں نے پوچھا۔ کامران! کیا باتیں ہوئی، بہن بھائی کے درمیان؟

دوست۔ اُس کا نام شہزادی ہے۔ صرف گھر میں ماں ہے۔ اُس کا بھائی نہیں ہے۔ جب بھی شہزادی مجھے ،بھیاء، کہتی ہے ،میرا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہی لفظ سننے کو میری سماعتیں ترس گئی تھیں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے شہزادی کے روپ میں بہن مل گئی ہے۔ شہزادی نے میرا شکریہ ادا کیا۔ بھیاء آپ کی وجہ سے میری عزت رہ گئی ہے۔ ورنہ......؟

ابھی شہزادی کچھ کہنا چاہتی تھی، میں نے اُس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔ بہن مجھے شرمندہ مت کرو۔ آج کے بعد ہم کسی لڑکی کو تنگ نہیں کریں گے۔

کامران بغیر سانس لئے بولے جا رہا تھا۔ یار ہمیں کیوں خراب کرتے ہو۔ لڑکیوں کے بغیر تو ہمارا جینا محال ہے۔ ایسی پابندیاں اچھی نہیں ہیں۔ میں نے حکمانہ جواب دیا۔

مجھے لیڈر مانتے ہو تو میرا حکم بھی ماننا پڑے گا۔ آج کے بعد ہمارے گروپ کا کوئی لڑکا، کسی بھی لڑکی کو نہیں چھیڑے گا۔ جس کا دل کرے گروپ میں رہے اور جو چھوڑنا چاہے، اُس کی اپنی مرضی۔ کامران نے حکم جاری کر دیا۔

اُس دن کے بعد ہمارے گروپ کے کسی لڑکے نے کسی لڑکی کو تنگ نہیں کیا۔ چاہے کوئی تقریب ہو یا کلاس روم۔ لڑکیاں ہمارے لئے کسی مقدس مقام کی طرح ہو گئیں۔ لڑکیاں دیکھتے ہی ہم راستہ چھوڑ دیتے۔

☆......☆

شہزادی سے میری بھی کبھار علیک سلیک ہو جاتی تھی، کیونکہ میں کامران کے ساتھ زیادہ کلوز تھا۔ ہم دونوں میں گہرے تعلقات تھے۔ کامران ہر راز و نیاز کی باتیں مجھ سے شیئر کرتا رہتا۔ کامران۔ شہزادی کا بہت خیال رکھتا۔ شہزادی بھی بھائی، بھائی کی گردان کرتی تھی۔ کلاس کے بعد ہوسٹل میں آ کر کامران کے کپڑے استری کر دیتی، اُس کے جوتے پالش کر دیتی۔ جب سے شہزادی آئی تھی کامران کی زندگی سنور گئی تھی۔ اُس نے اپنے کپڑے دھوبی کو نہیں دیئے تھے۔ کامران کا کمرہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوتی۔ کتابیں اپنی جگہ، جوتے اپنی جگہ، فرش چمکدار، صاف ستھرا۔

آج سورج پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ سورج کی کرنیں درختوں کو چیرتی ہوئی سرسبز گھاس پر پڑ رہی تھیں اور ہمارا گروپ کل ہونے والی تقریب کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ کالج کو سجایا گیا تھا اور ہر لڑکا اپنی اپنی تیاری میں جتا ہوا تھا۔ تقریب کی میزبانی کامران نے کرنی تھی اور شہزادی دو دن سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ کامران سے پتا لگا تھا کہ اُس کی طبیعت خراب ہے۔ کامران شہزادی کے گھر کئی بار جا چکا تھا۔ شہزادی، اُسے اپنے گھر لے گئی تھی اور اپنی ماں سے ملوایا تھا۔ شہزادی کی ماں نے کامران کو بیٹے کا پیار دیا، خدمت کی، صدقے واری ہوئی، جب تک کامران اُن کے ہاں رہا، دعائیں ملتی رہیں۔ اسی طرح کامران کے پاس جب بھی فراغت کے لمحات ہوتے شہزادی کے ساتھ اُن کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ یوں شہزادی کو بھائی اور اُس کی ماں کو بیٹا مل گیا تھا۔ تینوں بہت خوش تھے۔

☆......☆

آج پورا کالج جگمگا رہا تھا۔ سبھی لڑکے بن ٹھن کر آئے تھے۔ تقریب کا آغاز گیارہ بجے ہونا تھا لیکن ابھی تک کامران نہیں آیا تھا۔ رات دیر تک ہم کام میں جتے رہے تھے۔ پھر بھی ہمیں تشویش ہوئی کیونکہ وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ شاید کامران ابھی تک سو رہا تھا۔ میں اُسے جگانے کی غرض سے ہوسٹل کی طرف جانے لگا تو عین اُسی لمحے ایک لڑکی کی خوفناک چیخ میری سماعتوں سے ٹکرائی اور پھر پورے کالج میں کہرام مچ گیا۔ شہزادی نے کالج کی بلڈنگ سے چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔ میرے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ یہ کیسے ہو گیا۔ میں کامران کی طرف ننگے پاؤں بھاگا۔ وہ اپنے کمرے میں مزے سے سو رہا تھا۔ جاتے ہی میں نے اُسے جھنجھوڑا۔ کامران......وہ......وہ......وہ شہزادی......الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے

لرزتے شریر کے ساتھ میں نے کامران کو بتایا کہ شہزادی نے خودکشی کرلی ہے۔

''کیا؟'' کامران چیختے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا؟'' ننگے پاؤں کمرے سے کالج کی طرف دوڑا، چیختا، بلکتا، ڈھاڑیں مارتا ہوا۔ شہزادی بے سدھ زمین کے فرش پر پڑی مسکرا رہی تھی۔ کامران نے شہزادی کے مُردہ جسم کو بانہوں میں بھر کر پھوٹ پھوٹ کر رویا اور پھر شہزادی کو آخری رسومات کے بعد منوں مٹی تلے دفن کر دیا گیا۔

ہر کسی کے لبوں پہ ایک ہی بات گردش کر رہی تھی کہ شہزادی نے خودکشی کیوں کی؟ ہر کوئی اپنے اپنے خیالات پیش کر رہا تھا، چہ مگوئیاں جاری تھیں اور کامران بت بنا ہوا تھا۔ اُس کے لبوں پہ قفل لگے تھے۔

تین دن بعد ایک اور حادثہ ہوا، جس نے کالج کی فضا کو سوگوار کر دیا۔ قیامت کا منظر تھا جب کامران نے بھی کالج کی بلڈنگ سے کود کر جان دے دی تھی۔ کامران کی موت پہ ہر آنکھ اشک بار تھی۔ میں خود حیرت کدہ تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں کسی کو کیا بتاتا۔ میرے گروپ کو دشمن کی نظر کھا گئی تھی۔ میرے ذہن میں سوالات اُبھر رہے تھے۔ پہلے شہزادی اور پھر تین دن بعد کامران نے بھی اُسی جگہ خودکشی کیوں کی؟ معاملہ کیا ہے؟

پھر ایک دن اِس راز سے بھی پردہ اُٹھ گیا۔ ہاں یہی وہ ڈائری تھی۔ جس نے مجھے حقیقت سے آشکار کر دیا تھا۔ جس کے پہلے ورق پہ مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔ جس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

پیارے ہم راز!

جب یہ راز عیاں ہوگا میں آپ کے درمیان نہیں ہوں گا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے اور میں چاہتا ہوں جس طرح میں برباد ہوا ہوں، کوئی اور نہ ہو۔ ایسا گناہ کوئی بھی نہ کرے۔ تقریب والے دن، میں صبح سویرے اُٹھ گیا تھا لیکن جسم تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے شراب کی بوتل پر نظر پڑی، جو میں رات آتے ہوئے لے کر آیا تھا اور یہاں رکھ دی تھی۔ میں نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور ساری بوتل حلق سے نیچے اُتار لی۔ ہائے ری قسمت۔ اسی دن صبح سویرے شہزادی گھر سے سیدھی میری طرف چلی آئی۔ اُس کی خواہش تھی کہ بھیا کو ساتھ لے کر کالج جاؤں گی مگر میں شراب کے نشے میں دھت تھا اور جب انسان نشے میں ہوتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔ رشتوں کا تقدس کیا ہے۔ انسان، انسان نہیں حیوان بن جاتا ہے۔ میں بھی انسان سے وحشی درندہ بن گیا اور شہزادی کو شاید معلوم بھی نہیں ہوگا کہ اُس کا بھیا، بھائی نہیں درندہ بن چکا ہے۔ میری آنکھوں میں ہوس کا نشہ سوار تھا۔ میں نے شہزادی کو کمرے میں داخل ہوتے ہی بانہوں میں دبوچ لیا۔

بھیا! آج خیر تو ہے۔ آج خوشی سے لوٹ پوٹ

قربانی کے جانور

قربانی کے بارہ جانور شرعاً مقرر ہیں۔ ان میں سے چھ جانور بڑے اور چھ چھوٹے ہیں۔ بڑے جانور گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ اور اونٹنی ہیں اور چھوٹے جانور بکرا، بکری، بھیڑ، مینڈھا، دنبہ اور دنبی ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی جانور کی قربانی نہیں ہوسکتی خواہ وہ کتنا ہی قیمتی اور کھانے میں کتنا ہی مرغوب کیوں نہ ہو مثلاً ہرن کی قربانی نہیں ہوسکتی۔

قربانی کے لیے مقرر بڑے جانوروں میں سات حصے ہوسکتے ہیں یعنی ان میں سے ایک جانور سے سات قربانیاں ہوسکتی ہیں اور اس میں سات حصہ دار شریک ہوسکتے ہیں مگر شریک ہونے والوں میں سے ہر ایک کی نیت قربانی کی ہونی چاہیے البتہ عقیقہ کا حصہ قربانی کے جانور میں سے کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ عقیقہ میں بھی اللہ کے لیے ہی خون بہایا جاتا ہے۔

حسن انتخاب: رازِ عدن، بحرین

ہو رہے ہیں لیکن میں اُس کے نازک حصوں کو چھیڑنے لگا۔ بھیا! یہ کیسا مذاق ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ اُس وقت شاید ہوسٹل سے سبھی لڑکے جا چکے تھے۔ ورنہ شہزادی کا شور کوئی نہ کوئی تو سن ہی لیتا۔ شہزادی کیا کچھ کہتی رہی تھی، لیکن میں اپنے نشے میں دھت تھا۔ شیطان جاگ گیا تھا اور انسانیت سو گئی تھی۔ میں نے شہزادی کو بیڈ پر دے مارا اور پھر۔ پھر اس کے جسم کے ساتھ کھیلنے لگا۔ میں نے اُس کی زندگی سے زیادہ قیمتی عزت اپنے ناپاک ہاتھوں سے تار تار کر دی۔ ایک بھائی نے بہن کو لوٹ لیا تھا۔ ڈس لیا تھا۔ نجانے یہ کھیل کتنی دیر جاری رہا اور کب شہزادی کمرے سے چلی گئی۔ مجھے معلوم نہیں۔ مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

جب تم نے آکر مجھے جگایا تو میرے ذہن پہ ہتھوڑے برسنے لگے۔ میں حیران تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شہزادی کی تدفین کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ بستر میں سلوٹیں نہیں تھیں۔ آخر یہ سب کس نے کیا ہے؟ میری حالت غیر ہونے لگی اور پھر میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اچانک میں نے تکیہ اٹھایا تو نیچے سے تہہ شدہ کاغذ ملا۔ جس کی تحریر یوں تھی۔

پیارے بھیا!

آپ ہرگز ایسے نہیں تھے، سارا قصور میرا ہے۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ آپ شراب پیتے ہیں۔ اور شراب کا نشہ انسان کو بیگانہ کر دیتا ہے۔ آنکھوں میں اس کا خمار ہوتا ہے۔ سامنے کون ہے کچھ سجھائی نہیں دیتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ شراب پیتے ہیں تو میں آپ کی یہ عادت ترک کروا دیتی لیکن افسوس شراب نے مجھے برباد کر دیا۔ بھیا یہ لیٹر جب آپ کو ملے گا۔ آپ کی بہن، آپ سے بہت دُور جا چکی ہوگی۔ جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں لوٹا۔ میں نے کمرے کی حالت درست کر دی ہے تاکہ آپ کی طرف اُنگلیاں نہ اُٹھیں۔ میں نہیں چاہتی کہ جب میرا بھائی، میرے سامنے آئے تو اُس کی نظریں جھکی ہوئی ہوں۔ آپ سدا مسکراتے رہنا، میں آپ کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے دُور جا رہی ہوں۔

آپ کی بدنصیب بہن

شہزادی

خط نے مجھے جیتے جی زمین میں گاڑھ دیا تھا۔ میری بہن میرے لئے کیا کرتی رہی اور میں شراب کے نشے میں، اپنی ہی بہن کو نوچتا رہا۔ میں کتنا کمینہ بن گیا تھا۔ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے مر جانا چاہیے۔ میں یہ ڈائری آپ کی غیر موجودگی میں، آپ کے بیگ میں رکھ رہا ہوں۔ آپ نے شراب سے لوگوں کو بچانا ہے۔ میں نہیں چاہتا جس طرح، میں برباد ہوا ہوں، کوئی اور اِس دلدل میں دھنس جائے۔

آپ کا دوست!

کامران!

میں نوید اور اُس کے دوستوں کو شراب کے بارے بتا رہا تھا۔ ہر وہ چیز جس سے نشہ طاری ہو، دین اسلام میں حرام قرار دی گئی اور ہم اُسے انجوائے کرنے کا نام دیتے ہیں۔ حرام کھا کر، حرام پی کر کیوں اپنی زندگیاں برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں شراب سے خود کو محفوظ رکھنا چاہیے اور اِس کی تباہ کاریوں سے اپنے معاشرے کو بچانا چاہیے۔ میں نے اِسی لئے اُس دن ہی قسم کھائی تھی کہ نہ شراب پیوں گا اور نہ کسی کو پینے دوں گا۔ سبھی نے مل کر کہا۔ انشاءاللہ!

نوید نے تینوں بوتلیں اُٹھائی اور واش روم کے فلش میں بہا دی۔ اِس طرح چار دوستوں نے شراب پینے اور پلانے سے توبہ کر لی تھی۔

میں آج بھی کراچی میں کام کرتا ہوں۔ نازو کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ میرے اماں، ابا اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے ہیں اور میں اپنا گھر بنانے کے لئے کما رہا ہوں۔ لیکن زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے لیکن شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ مجھے معلوم ہے شراب حرام ہے اور شرابی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ میں دُنیاوی شراب نہیں، جنت کی شراب پیوں گا، جس کے لئے اعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

☆☆☆

تیسری مرد کہانی

دو دن کی ہیر

محمد ندیم عباس میواتی

پتوکی کی ایک مرد کی داستانِ عشق، کچی عمر کے عشق کی فتنہ سامانی

میں اپنی فیکٹری میں بھائی جان کے پاس بیٹھی فائل کی ورق گردانی میں مصروف عمل تھی کہ اچانک سیل کی ٹون نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اسکرین پر نظریں دوڑائیں تو میری دوست سونیا کا نام چمک رہا تھا۔ مصروفیت کے پیش نظر میں نے کال ڈراپ کردی کہ اس کام سے فراغت کے بعد بات کروں گی کہ پھر وہی نمبر



اسکرین پر بیٹ ہونے لگا۔ میں نے کال ریسیو کی۔
''یار ابھی میں کچھ بزی ہوں بعد میں خود کال کرلوں گی۔''

''بیٹی میں سونیا کی والدہ بات کررہی ہوں۔'' ایک گھبرائی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے انہیں سلام کیا مگر آگے سے خاموشی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہیں اس لیے فوراً کال بیک کی۔

''ہیلو آنٹی جی! کیا بات ہے خیریت ہے ناں؟'' تو روہانسی آواز نے میری سوچ کی ترجمانی کی کہ صورت حال واقعی گھمبیر ہے۔

''بیٹا سونیا صبح سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے ہوئے ہے۔ پتا نہیں کیوں دروازہ نہیں کھول رہی۔ ہزاروں برے خیالات میرے دل میں گھر کیے ہوئے ہیں۔''

گھڑی کی ٹک ٹک نے ساڑھے گیارہ کی اطلاع دی۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں ابھی آتی ہوں۔''

میں نے بھائی جان سے کام کی رخصت چاہی اور اجازت لے کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ بھائی جان نے پیچھے سے کئی آوازیں دیں کہ خیریت ہے مگر ان کی آواز مجھ تک نہ پہنچ پائی۔ میں تیزی سے گاڑی نکال کر باہر آگئی۔ میری ساری توجہ سونیا کی طرف تھی کہ اسے کیا ہوا ہوگا۔ وہ تو ہر وقت کسی کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ وہ خوب صورت شرارتی چنچل نٹ کھٹ سی سرخ و سفید لڑکی تھی۔ 10th کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر تھی کہ ایسی کیا وجہ ہوگئی کہ وہ صبح سے دروازہ بند کیے ہوئے ہے کیونکہ اس کی ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے میں باخبر نہ ہوں۔ وہ اپنے سارے راز جو دوسروں کو بتانے سے کتراتی مجھ سے شیئر کرتی تھی۔ گھنٹے کا طویل سفر پندرہ منٹ کے مختصر وقت میں اسی پریشانی میں گزرا۔ میں ان کے گھر پہنچ گئی۔

آنٹی جان جیسے میری ہی آمد کی منتظر تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور کوئی بھی تفصیل اور سوال و جواب کیے بغیر سونیا کے کمرے کی طرف دوڑی۔ دستک پر دستک دی مگر جواب نہ ملا۔ کمرے میں بالکل خاموشی کا راج تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خیالات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ میں نے گھبرائی ہوئی کیفیت میں آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ ابھی بھی رو رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ آنٹی حوصلہ رکھیں پھر موبائل نکال کر اپنی دوست آمنہ کو کال کی لیکن وہ بھی شاید مصروفیت کی وجہ سے اٹینڈ نہ کر پائی۔ میسج کے ذریعے میں نے اس کے نام ایک پیغام چھوڑا کہ جلدی بھائی جان کی رفاقت میں سونیا کے گھر چلی آؤ۔

آنٹی جان کی حالت دیکھ کر میرا دل بھی پسیج گیا اور میری آنکھوں میں بھی پانی بھر آیا مگر آنٹی کو تسلی کی خاطر خود کو مضبوط رکھا۔ کچھ دیر بعد آمنہ اور اس کا بھائی مدثر بھی آگئے۔

''سوسوری یار میرے پاس پیکیج اور بیلنس دونوں ختم ہوگئے تھے مگر کیا بات ہے خیریت تو ہے ناں؟''

میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ساری تفصیل اسے بتادی اور بھائی مدثر کو بولا کہ وہ دروازہ توڑ دے۔ انہوں نے اسٹور کا پوچھا تو دائیں طرف کا اشارہ پا کر وہ وہاں سے لوہے کی راڈ اٹھا لایا اور لاک کی جگہ کو توڑ کر اندر سے ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ میں دوڑتی ہوئی اس کی جانب بڑھی تو وہ میٹرس پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے سیدھا کیا۔ اتنی دیر میں آنٹی اور آمنہ بھی میرے سر پر پہنچ گئیں۔ سونیا کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنٹی نے اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی آمنہ کی بانہوں میں جھول گئیں۔ میں نے آمنہ سے کہا کہ تم آنٹی کو سنبھالو۔ پھر میں نے مدثر بھائی کی مدد سے سونیا کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور اسپتال کی طرف گاڑی دوڑا دی۔

ڈاکٹرز فوراً اسے ایمرجنسی روم میں لے گئے اور دروازہ بند کرلیا۔ مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اتنی دیر میں وہاں آمنہ اور آنٹی بھی آگئیں۔ آنٹی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بار بار ان پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں بہت تسلی اور دلاسا دیا مگر میری کوشش رائیگاں گئی۔

طویل انتظار کے بعد ایمرجنسی روم سے ڈاکٹر کی آمد ہوئی تو میں فوراً ان کی طرف لپکی۔

''ڈاکٹر صاحب اب میری دوست کیسی ہے؟''

ڈاکٹر میری پریشانی دیکھتے ہوئے بولے۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں اب وہ خطرے سے باہر ہے لیکن اگر آپ تھوڑی اور تاخیر سے اسے لاتے تو ان کا بچنا محال تھا۔"

"انہیں ہوا کیا تھا؟" میں نے دوسرا سوال داغا۔

انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "گندم کی زہریلی گولیاں کھالی تھیں اس نے۔" یہ سن کر مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ بمشکل میں نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت آنٹی دور کھڑی تھیں انہیں معلوم نہیں تھا کہ سونیا کس روم میں ہے۔ میں پھر آنٹی کی طرف بڑھی اور کہا۔

"سونیا اب بالکل ٹھیک ہے کچھ ہی دیر بعد ہوش آجائے گا۔ گرمی کی وجہ سے سر چکرا کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

کچھ ہی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر نے آکر بتایا۔ "مریضہ کو ہوش آگیا ہے۔ آپ ان سے مل سکتے ہیں۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور آنٹی جان کو لے کر روم کے اندر چلی گئی۔ آنٹی نے سونیا کا ماتھا دیوانہ وار چومتے ہوئے کہا۔

"میرے جگر کے ٹکڑے تمہیں کیا ہوگیا تھا؟"

سونیا حیرت میں ڈوبی ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر آنٹی کو تسلی دیتے ہوئے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو بے اختیار ان کی آنکھوں میں پانی امڈ آیا۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا اور غصے سے ان کے پاس سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ سونیا میرے غصے کا مطلب سمجھ چکی تھی اس لیے اس نے نظریں جھکالیں۔ میں نے وہاں اس سے ایسا کچھ نہ پوچھا جس سے سب پر اس کی حقیقت اور اصلیت ظاہر ہو۔

تین دن سونیا اسپتال میں رہی۔ میں بھی اس کے پاس چکر لگاتی رہی مگر اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ مگر جب تین دن بعد مکمل صحت یاب ہوکر وہ گھر لوٹی تو میں نے اس سے زہریلی گولیاں کھانے کی وجہ پوچھی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے پھر کوشش کی مگر وہ نہ بولی۔ میں نے کہا۔ "سونیا ہم دوست ہیں اور دکھ سکھ دوستوں سے ہی شیئر کیے جاتے ہیں۔ میں بھی ان دوستوں میں سے ہوں۔ اگر مجھے دوست سمجھتی ہو تو بتاؤ کیا بات ہے۔ کیوں تم اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا چاہتی تھیں؟"

مگر اب بھی اس نے اپنے لبوں کو سیے رکھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آج مجھے اپنی اہمیت کا پتا چل گیا ہے۔ میں تو تمہیں چھوٹی بہن کے درجے رکھتی تھی اور تم......"

"وہ مصباح...... مصباح......" یہ کہتے ہوئے وہ میرے گلے لگ گئی اور اس کے بہتے آنسو میرے دامن کو تر کرتے رہے۔ میں نے بھی اسے نہ روکا تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے جب اس کے آنسو تھم گئے اور کچھ لمحے خاموشی کی نظر گزرے تو وہ اپنی داستان الم سنانے میں مگن ہوئی۔

☆......☆

فاروق وجیہہ، دراز قد، دبلا پتلا، تیز تیکھے عقابی نقوش کا حامل تھا۔ ویسے بھی وہ کھاتے پیتے گھر کا چشم و چراغ تھا۔ سب لڑکیاں اسے اپنا آئیڈیل سمجھنے پر فخر محسوس کرتیں گویا کہ وہ ہماری کلاس کا ہیرو بنا ہوا تھا لیکن میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ بس اپنی پڑھائی سے ہی تعلق رکھتی۔ اس لیے ہر وقت اسی میدان میں ہی مصروف رہتی۔ آس پاس کی کچھ خبر نہ رکھتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسکول پرائیویٹ تھا جس کی وجہ سے مخلوط نظام تعلیم تھا۔ ہمارا اسکول میں آخری سال تھا اسی وجہ سے سبھی اسٹوڈنٹس کی آپس میں خوب گپ شپ تھی۔ میں ان سب سے الگ تھلگ بیٹھی رہتی۔ ویسے بھی میری کسی سے خاص دوستی نہ تھی اور نہ ہی کبھی خواہش محسوس ہوئی۔ میں اسکول کی خوب صورت ترین لڑکی نہ تھی مگر خوب صورت ضرور تھی جس کو چاہے اپنا دوست بنا سکتی تھی مگر میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ میری اسکول میں صرف لڑکیوں سے ہی علیک سلیک تھی مجھ میں کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی، بس اک عادت قابل اعتراض تھی کہ مجھے غصہ بہت آتا تھا اسی وجہ سے کسی کی میری طرف میلی نگاہوں سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک دن ہمارا آخری پریڈ خالی تھا۔ سب بہت شور کررہے تھے میں شور سے تنگ آکر اٹھی تاکہ اسکول پارک میں جاکر سکون سے پڑھائی کرسکوں۔ جونہی میں دروازے کے پاس پہنچی تو فاروق نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"سونیا جی کدھر جارہی ہو۔" مجھے بہت غصہ آیا مگر

میں اس کے سامنے نہیں جھکنا چاہتی تھی خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"فاروق میرا راستہ چھوڑو۔"

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ ڈھٹائی سے بولا "سونیا جی کیوں اتنا مغرور ہو۔ میرے سوال کا جواب تو دے دو۔ میں تمہارا راستہ چھوڑ دوں گا۔" اس کی گفتگو میں تکلف اُمڈ آیا۔ ساتھ ہی آوازیں آنے لگیں کہ فاروق لگتا ہے تم جواب لیے بنا راستہ چھوڑنے والے نہیں۔ اس پر وہ اور اترا کر بولا کہ اب تو بتا دو کدھر جا رہی ہو محفل کو ویران کر کے۔" میں نے پلٹ کر دیکھا تو ساری کلاس کی نظریں ہماری طرف ہی تھیں۔ میں نے واپسی میں ہی عافیت سمجھی جوں ہی واپسی پلٹی اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ چٹاخ کی آواز کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔ پوری کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ فاروق میرا ہاتھ چھوڑ کر گال پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میرا پورا وجود غصے کی وجہ سے لرز رہا تھا۔

"شٹ اپ مسٹر فاروق۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کے ساتھ تم اپنی من مانی کرتے رہو۔ دوبارہ میرے ساتھ ایسی حرکت کی تو تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

غصے سے بھری میں اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ فاروق کچھ دیر گم صم کھڑا رہا پھر شرمندہ ہو کر باہر چلا گیا۔

چھٹی تک کلاس میں خاموشی چھائی رہی۔ چھٹی بجتے ہی میں جلدی سے گھر آ گئی۔ میرا دل کسی انہونی کے ڈر سے بہت گھبرا رہا تھا۔ میں خود حیران تھی کہ مجھ میں اچانک اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی خیر میں اپنے کیے پر پشیمان نہ تھی مگر میرا ضمیر مجھے بار بار مخاطب کر رہا تھا کہ سونیا یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ انہی سوچوں میں گہری نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔

شام چھ بجے اٹھی تو بالکل فریش تھی بس کبھی کبھی کسی انہونی کے خطرات دل میں ابھر آتے تھے۔

دوسرے دن اسکول گئی تو کلاس میں قدرے خاموشی کا راج تھا۔ کبھی ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ فاروق آج اسکول نہ آیا۔ یوں چھٹی ٹائم تک وقت خاموشی میں گزر گیا۔ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نے پوری کلاس کی خوشیاں چھین لی ہوں۔ میں نے گھر آ کر اس پر بہت غور کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ کل فاروق سے اپنے کیے پر معذرت کر لوں گی مگر دوسرے دن بھی وہ اسکول نہ آیا اس طرح پندرہ دن گزر گئے وہ غیر حاضر رہا۔ اس کی غیر حاضری کی قصوروار میں خود کو ٹھہراتی رہی میرا دل گھر میں بہت اداس رہتا۔

ایک دن پارک میں چلی گئی۔ وہاں میری ملاقات میری کلاس فیلو نورین سے ہوئی جو کہ فاروق کی دوست تھی۔ میں اس کی طرف گئی اور فاروق کے اسکول نہ آنے کی وجہ پوچھی۔

"ابھی کیا اسے اور ذلیل کرنے کا ارادہ ہے۔" وہ غصے سے پھنکارتے ہوئے بولی۔ غصہ تو اس وقت مجھے بھی آیا مگر کنٹرول کر گئی۔

"یار اگر وہ میری وجہ سے نہیں آ رہا تو میں بھری کلاس میں اس سے سوری کرنے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں اسے لانے کی کوشش کروں گی وعدہ نہیں کرتی۔" پھر چند ادھر ادھر باتیں کر کے میں گھر آ گئی۔

☆......☆

صبح سے موسم بہت خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور پرندوں کی چہکار نے ماحول کی خوشگواریت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو آٹھ بجنے کا الارم دے رہی تھی۔ میں جلدی سے بیڈ سے اٹھی اور دس منٹ اسکول لگنے میں باقی تھے۔ اس لیے بغیر ناشتا کیے ہی روانہ ہو گئی۔ اسکول کے گیٹ میں داخل ہوئی تو نورین کو اپنا منتظر پایا وہ جلدی سے میری طرف آئی اور بولی۔ "اس میں فاروق کا لیٹر ہے۔"

"میرے لیے......!" میں نے زیر لب کہا اور فاروق کا پوچھا تو وہ گویا ہوئی۔

"ان سب سوالوں کا جواب اسی میں ہے۔" اس نے لیٹر کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے عجیب سا فیل ہو رہا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ آ گئی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کیونکہ یہ میرے لیے انوکھی بات تھی۔ میں بیٹھی تو کلاس میں تھی مگر خیال لیٹر ہی کی طرف تھا۔ ہاف ٹائم ہوتے ہی لیٹر چاک کیا تو لکھا تھا۔

مائی ڈیئر!

میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ کا سامنا کرسکوں۔ میں سب کی نظروں میں گر چکا ہوں۔ اگر آپ اس بندہ ناچیز پر احسان کرتے ہوئے صدق دل سے معاف کردیں تو تاحیات ممنون رہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت اچھی لڑکی ہیں۔ مجھے ضرور معاف کردیں گی۔ آپ پہلی لڑکی ہیں جس سے متاثر ہوکر معذرت کا خواہاں ہوں۔

معافی کا طلبگار

فاروق کمانڈو

میں خط پڑھ کر اتنا متاثر ہوئی کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فاروق نے اتنی عاجزی سے اپنی غلطی تسلیم کی تھی میں بار ہا لیٹر پڑھتی رہی۔ میں نے اسی وقت کاغذ لے کر اسے جواب لکھا۔

فاروق صاحب!

آپ کا معذرت نامہ دل سے قبول کرتی ہوں۔ آپ نے میرے دل میں اپنا بہت بلند مقام کرلیا ہے۔ میری آپ سے ریکویسٹ ہے کہ آپ اسکول آئیں میں بالکل بھی آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ آپ آ گئے تو میں سمجھوں گی کہ آپ نے میری ریکویسٹ کی دل سے قدر کی۔

فقط سونیا

چھٹی کے بعد شکریہ کہتے ہوئے نورین کو جوابی لیٹر تھما دیا اور گھر آ گئی۔ مجھے دلی خوشی ہو رہی تھی اس کا مقام واقعی بہت بڑھ چکا تھا۔ میں خود اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی مگر اس معاملے میں وہ مجھ سے سبقت لے گیا تھا۔

دوسرے دن وہ آ گیا۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، ماتھے پر آئے بال اس کے سراپے کو وجیہہ بنا رہے تھے۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا پھر نظر جھکا لی۔ اس کا نظریں جھکانا مجھے بالکل اچھا نہ لگا۔ وہ بار بار میری توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا رہا۔ وہ سنجیدہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ہاف ٹائم کے بعد میں اس کی طرف بڑھی مگر وہ نورین کے ساتھ کینٹین کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ نورین کا اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا مجھے زہر لگ رہا تھا۔ میری یہ کیفیت کیوں تھی خود میں بھی لاعلم تھی۔

گھر آ کر بھی میرا یہی حال رہا۔ شام کو گھر میں بوریت محسوس ہوئی تو پھر پارک کی طرف نکل گئی۔

نورین آج بھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو اور بھی دوست تھیں۔ میں نے ان کو سلام کیا پھر باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کرنے لگے مگر میری سوچوں پر فاروق چھایا رہا۔ بار بار اس کا سنجیدہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ میں چہل قدمی کرتے ہوئے انہی سوچوں میں گم تھی کہ نورین کی آواز نے چونکا دیا۔

”یار کہاں گم ہو! کس کی یادوں میں کھوئی ہو؟“ ہلکی سی مسکراہٹ سے وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”کہیں کسی کو دل میں تو نہیں بٹھا بیٹھی مطلب فار.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں۔“ میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔ جیسے میری چوری پکڑی جا چکی ہو۔

”میں بہت دیر سے نوٹ کر رہی ہوں۔“

”نہیں یار! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہلکا سا سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”سر میں یا دل میں؟“ اس نے شرارتی لہجے میں کہا تو سب مسکرا دیئے۔ پھر میں گھر آ گئی۔ کھانا بھی برائے نام کھایا۔ سونے کے لیے بیڈ پر جا لیٹی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میرا دل مجھے مخاطب کر رہا تھا کہ تمہیں فاروق سے محبت ہو گئی ہے۔ تم اس کے بنا ادھوری ہو مگر ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ یہ محبت تمہیں برباد کردے گی۔ بارہ بج گئے مگر نیند نہ آ رہی تھی۔ میں کروٹیں بدلتی رہی۔ میری نظروں کے سامنے فاروق کا سراپا تھا۔ اچانک سیل نون نے خیالاتی بھنور سے باہر نکالا چونک کر اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی تو اجنبی نمبر دیکھ کر حیرت ہوئی اس وقت کس کی کال ہو سکتی ہے۔ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے یس کا بٹن دبایا تو ہیلو کی ایک مانوس آواز نے کانوں میں رس گھول دیا۔

”آپ سونیا ہی بات کر رہی ہیں؟“

”جی ہاں میں سونیا ہی ہوں۔“ خود پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔

میں حیران ہوئی کہ میرا نمبر اس کے پاس کہاں سے آیا۔

”کہاں گم ہو جی؟“

”کہیں نہیں۔ جی فرمائیں کیا بات ہے؟“

”آپ سوئی کیوں نہیں ابھی تک؟“

'' کہا۔ بس سوال میں آپ سے کروں تو فاروق جی آپ کا کیا جواب ہوگا؟'' پھر خاموشی کا دور شروع ہوگیا۔

'' سونیا جی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر ہمت نہیں ہو پا رہی ہے۔''

'' بولیے میں سن رہی ہوں۔'' میں نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے ہمت دلائی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

'' آئی لو یو سونیا۔'' یہی وہ لمحہ تھا جس نے میری سماعتوں میں گھنٹیاں بجادی تھیں۔ یہی وہ الفاظ تھے جس کو سننے کے لیے کب سے بے تاب تھی میں بھی اس پر دل لٹا چکی تھی۔

'' آئی لو یو ٹو فاروق جی۔ میں بھی آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں۔''

وہ بولا۔ '' سچ۔''

تو میں نے '' سچ'' کے لفظ سے اس کی تصدیق کی۔ پھر ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان ہوئے۔

'' فاروق میں نے فرسٹ ٹائم کسی سے پیار کیا ہے۔ مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔''

'' میری جان! میں کبھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔''

اس طرح صبح تک باتیں جاری رہیں۔ اذان کی صدا نے ہمیں خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچا کیونکہ اتوار تھا اس لیے خدا حافظ کہتے ہوئے میں سو گئی۔

سوموار کو اسکول پہنچی تو نورین اور فاروق گیٹ پر کھڑے میرا انتظار کررہے تھے۔ ان کو اپنا منتظر دیکھ کر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بڑھ کر انہیں سلام کیا فاروق نے میرا ہاتھ پکڑا اور اسی طرح کلاس روم میں داخل ہوگیا۔ ہمیں یوں ایک ساتھ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ ان کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم یوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ان کے سامنے آجائیں گے۔ فاروق بلند آواز میں بولا۔

'' دوستو! غور سے دیکھو یہی ہاتھ کچھ دن پہلے میرے گال پر پڑا تھا دیکھو آج اپنا آپ مجھے سپرد کر چکا ہے۔''

ہر طرف سے تحسین آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ میں شرما کر اپنی جگہ آ بیٹھی۔ آج سورج مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

یوں دن گزرتے گئے اور ہماری محبت پروان چڑھتی گئی۔ فاروق ہر طرح سے میرا خیال رکھتا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی۔ زندگی بہت حسین لگتی۔ فاروق کی تھوڑی سی دوری بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ کلاس میں بھی میری نظریں اس کے چہرے کی متلاشی رہتیں۔ اس کی ہر ایک ادا دل کو بھانے لگی اس کی دوری کا تصور میری جان نکال دیتا۔ میں بھی اس کے پیار میں اندھی ہو چکی تھی۔ وہ جو کہتا آنکھیں بند کیے سر تسلیم خم کرلیتی۔

☆......☆

ہمارے فائنل ایگزام قریب آرہے تھے۔ مجھ سے بالکل بھی تیاری نہ ہو پا رہی تھی۔ ہر وقت فاروق میرے اعصاب پر چھایا رہتا۔ رات کو اسی کے سپنے دیکھتی رہتی۔ یوں آٹھ ماہ کب اور کیسے گزرے پتا بھی نہ چلا۔

جب ہمارے امتحان بالکل سر پر آگئے تو فاروق کھڑا ہوکر سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

'' دوستو! ہمارے جدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ پھر پتا نہیں کون ملتا ہے کون نہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ہم اسکول سے الوداع ہوجائیں گے۔ میں آپ کو الوداعی پارٹی دینا چاہتا ہوں۔'' پھر اس پارٹی کے لیے صبح دس بجے دن کا وقت مقرر ہوگیا۔

پارٹی سب کلاس فیلوز کی تھی جس کا انتظام فاروق کے بنگلے نما گھر میں تھا۔ پھر وہ میرے قریب آیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

'' میری جان تم میری خاص مہمان ہوگی۔ تمہیں تمہاری زندگی کا سب سے خوب صورت تحفہ دوں گا جسے تم زندگی بھر فراموش نہیں کرسکو گی۔ کل میں سب کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کروں گا۔''

میں خوشی سے پاگل ہوتے اس کے گلے جا لگی۔

'' جان! میں خوش نصیب ہوں جو آپ کا پیار میرے مقدر میں آیا......''

'' اصل پیار تو اتوار کو ملے گا۔'' میں اس کا ذو معنی جملہ سمجھ نہ سکی اور گھر آگئی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

☆☆☆

صبح جلدی بیدار ہو گئی۔ خوشی سے تمام گھریلو امور سمیٹے اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کون سا ڈریس پہنوں۔ ساری الماری کو کھنگالا۔ پنک فراک پسند آئی۔ زیب تن کی اور خود کو آئینے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ ڈریس مجھ پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ ہلکا پھلکا سا میک اپ کیا اور فاروق کے گھر کی راہ لی۔ کافی اسٹوڈنٹ آ چکے تھے مگر نورین اور فاروق کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے۔

ابھی فنکشن شروع ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ دھیمی آواز میں میوزک کانوں میں رس گھول رہا تھا مگر فاروق کے بنا مجھے سب کچھ پھیکا پھیکا سا لگا۔ دل کسی انہونی کے ڈر سے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نورین کا ہاتھ پکڑے فاروق اسٹیج پر نظر آیا۔ میرے دل میں انہیں اکٹھا دیکھ کر آہ نکلی۔ فاروق کن اکھیوں سے دوسری طرف دیکھتا ہوا اسٹیج پر پہنچا۔ مائیک سنبھالا۔

”ہائے دوستو! آج میں نے سب کو الوداعی پارٹی اور اپنے جیون ساتھی چننے کی خوشی میں مدعو کیا ہے۔ میں اپنا ہم سفر چن چکا ہوں اور وہ ہے۔ نورین!“

تالیوں کی بھرپور گونج میری سماعت پر بم برسا تی گئی۔ میں آگے بڑھ کر بولی۔

”فاروق یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہاری وہ قسمیں وہ وعدے۔ ساتھ جینے مرنے کے وہ قول قرار وہ سب کہاں گئے؟“ اس نے میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

”میں اور تم سے شادی! ناممکن ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔“ وہ میرے تھوڑا اور قریب ہوا۔ ”سونیا کیا تم وہ دن بھول گئیں جب تم نے میرے گال پر تھپڑ مارا تھا۔ بھری کلاس میں میری انسلٹ کی تھی۔ مجھے تم سے کوئی پیار نہیں تمہاری اتنی اوقات کہاں کہ فاروق کمانڈو سے بیاہ رچا سکو۔

سنو دوستو! یہ پاگل لڑکی سونیا مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

سب اسٹوڈنٹس میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ میرا دل جیسے کرچی کرچی ہو گیا۔ فاروق نے مجھے بلندیوں پر پہنچا کر سر کے بل نیچے گرایا تھا۔

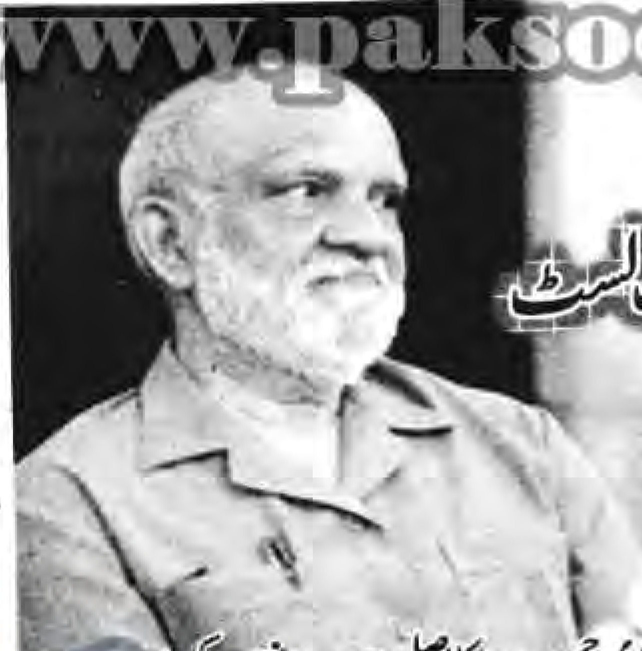
”ٹوٹ گیا ناں آج سارا غرور! خود کو بڑی مغرور سمجھتی تھی۔“ نورین نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔ میری آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگیں۔ میں کب اور کیسے گھر پہنچی مجھے ہوش نہ رہا۔ آتے ہی بستر پر ڈھے گئی۔ رات نو یا دس بجے آنکھ کھلی باہر نکلی۔ مما کھانا بنانے میں مگن تھیں۔ مجھے پھر سے اس بے وفا کی یاد ستانے لگی۔ زندگی ویران ہو گئی۔ ہر رونق زہر لگنے لگی۔ گزرتی رات بے قراری میں اضافہ کر رہی تھی۔ رات کانٹوں کی سیج پر تھی۔ مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی۔ میں نے گھر میں پڑی گندم کی گولیاں اٹھائیں جو مما کچھ دن پہلے بازار سے لائی تھیں۔ میں نے وہ ساری گولیاں کھا لیں تا کہ بے قرار روح کو اس تکلیف سے آزادی دلا سکوں مگر شاید موت نے بھی مجھ سے بے وفائی کر گئی جو گولیوں نے اپنا اثر نہ کیا اور تم نے مجھے بچا لیا۔“

سونیا کی داستان غم سن کر میری آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ وہ اب مکمل خاموش تھی جیسے دل کا بوجھ ہلکا کر چکی ہو۔ میں نے اسے سمجھایا۔

”دیکھو سونیا دنیا صرف ایک انسان تک محدود نہیں۔ ایک بے وفا کی خاطر اپنی آخرت برباد نہ کرو۔ سوچو اگر اس حالت میں خدا سے روبرو ہونا پڑتا تو اس کے سامنے کس منہ سے جاتیں۔ پلیز دوبارہ ایسی حرکت مت کرنا۔ اپنا نہیں تو کم از کم خود سے جڑی زندگیوں کے بارے میں ہی سوچ لیتیں۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ زخم اتنی جلدی نہیں بھرتے مگر کوشش میں حرج نہیں۔ حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو ایگزام پر توجہ دو۔ میں اس معاملے میں بھرپور مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔“ سونیا نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں اب سنبھل جاؤں گی۔ میں جیوں گی اپنی ماں کی خاطر۔“

پھر وہ جذباتی ہو کر میرے گلے لگ گئی۔ اس کے ندامت کے آنسو بہہ گئے کہ وہ اپنی زندگی کو کتنا حقیر سمجھ رہی تھی۔ میں نے اسے کافی تسلی دی لیکن میرا دل خود اس کی داستان سے مضطرب ہو چکا تھا۔ کس طرح ایک رانجھے نے اسے دو دن کی ہیر بنا کر در بدر کر دیا تھا۔ آہ! ہم لڑکیاں بھی کتنی نادان ہوتی ہیں۔

☆☆☆



بھارت میں بلیک لسٹ

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفرنامۂ بھارت

دسواں حصہ

ترقی پسند ادیبوں کے درمیان

اگلے روز میں ہوٹل بدلنے کا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ بھارت سرکار کی مہمان داری ختم ہو رہی تھی اور کوئی سرکاری ملاقات بھی نہیں تھی۔ اب تک مجھے سرکاری گاڑی بھی میسر تھی۔ کوئی نہ کوئی میزبان اپنے طور پر رہنا چاہتا تھا۔ تاکہ ٹیکسیوں رکشوں میں گھوم سکوں۔ غیر سرکاری لوگوں سے ملوں اور دیکھوں کہ سرکاری مہمانداری کے بغیر بھارت کیسا لگتا ہے۔ شفٹ کرنا ہے اس لیے میں اخبارات کا بوجھ گھٹانے کے لیے ان میں سے اہم خبریں، مضامین تراش رہا ہوں۔ آج شبستان ڈائجسٹ کو انٹرویو بھی دینا تھا۔ میں شمع کا دفتر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ ماشاء اللہ کافی بڑا دفتر تھا۔ شمع، بانو، شبستان ڈائجسٹ، ششما، یوسف دہلوی صاحب، یونس دہلوی صاحب، ادریس دہلوی صاحب کے الگ الگ کیبن تھے۔ باقی ہال مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ ہندوستان میں ایک اردو ادارے کا اتنا بڑا دفتر کافی حوصلہ بڑھاتا ہے شمع روشن ہے۔ انٹرویو کے ادریس صاحب کے گھر پر چلتے ہیں۔ پورے خاندان نے اپنا ایک بلاک بنا رکھا ہے۔ انٹرویو طویل ہوتا جا رہا تھا مجھے ایک اور جگہ بھی جانا تھا۔ میں وہاں فون کرتا ہوں۔ عتیق صدیقی صاحب نے چند ترقی پسند ادیبوں کو ایک جگہ جمع کر رکھا تھا۔ باقی انٹرویو کل تک کے لیے ملتوی کر کے ادریس صاحب مجھے وہاں چھوڑنے کے لیے لے چلے۔ کارینتی تھیٹر۔ یہاں ڈراموں کی ریہرسل بھی ہوتی ہے۔ پینٹنگز کی نمائش بھی، ادیبوں کی محفلیں بھی، انور عظیم ہیں، دیوندر اسر ہیں، قمر رئیس ہیں، بلراج منیرا ہیں اور بہت سے نئے پرانے لکھنے والے۔ یہ لوگ جو بھارت میں اردو ادب کے افق کے ستارے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن۔ رسائل، اخبارات میں ان کے دم سے اردو کا چراغ جل رہا ہے۔ اردو کا مستقبل ان سے وابستہ ہے۔ یہ سب لوگ اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ وہ پاکستان میں ادب کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ایک عرصے سے پاکستان سے رسالے اور کتابیں نہیں آ رہی ہیں۔ اس لیے کچھ علم نہیں ہوتا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ پوچھ رہے ہیں۔ کن نئے افسانہ نگاروں کی کتابیں آئی ہیں۔ کس کس کا مجموعہ کلام چھپا ہے۔ بنگلہ دیش قائم ہوا، اس سے پہلے بنگالیوں کے ساتھ زیادتیاں ہوئیں، اس پر کس نے کیا کچھ لکھا۔ اب کیا لکھا جا رہا ہے؟

اتنے سوالات کی بوچھاڑ اور میں اکیلا۔ میرا بھی ایک عرصے سے ادب سے واجبی سا تعلق رہ گیا ہے۔ اب تک پاکستان سے جتنے صحافی آئے ان کا ادب سے اتنا بھی تعلق نہیں تھا۔ اردو اخبار سے تو صرف ایک صاحب ہی آئے ہیں۔ وہ بھی مینجنگ ڈائریکٹر۔ اس لیے بھارتی ادیبوں کی تشنگی دور ہونے کا کوئی سامان نہیں ہوا ہے۔ سو اب میں ان کے سامنے ہوں۔ میں انہیں جو کچھ معلوم ہے بتاتا ہوں۔

نئے افسانہ نگار

نئے شاعر

بنگلہ دیش کے بارے میں ہم کیا سوچتے ہیں

وہ بھارتی ادیبوں کی سوچ سے یقیناً مختلف ہے

ہمارے لیے یہ ایک المیہ ہے

جنگِ آزادی نہیں ہے

ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے

ہندوستان اور روس کی جارحیت کا نتیجہ

میں بالکل صاف صاف اپنی غلطیاں، خامیاں بھی تسلیم کر رہا ہوں لیکن اس کے قیام میں اصل ہاتھ ہندوستان کا ہے۔

ایسے ملکوں کو آزادیاں ملنے لگ گئیں تو ہر بڑا ملک اپنے قریبی ہمسایوں کے بعض صوبوں کو آزادی دلوانے لگے گا۔ یہ لوگ خلوص سے جاننا چاہتے ہیں کہ ہوا کیا۔ انور عظیم ڈاکٹر انور سجاد کو پہنچانے کے لیے اپنی کتابیں دیتے ہیں۔ عتیق صدیقی پھر مجھے بزرگ افسانہ نگار، ناول نگار، حیات اللہ انصاری کی طرف لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کھانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ ویسٹرن کورٹ، لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ارکان کے لیے ہوسٹل ہے۔ حیات اللہ انصاری پہلے راجیہ سبھا کے رکن تھے۔ اب کانگریس کے ہفت روزہ ''سب ساتھ'' کے مدیر ہیں۔ حیات اللہ انصاری ہیں۔ ان کی بیگم ہیں۔ بیگم محترمہ سلطانہ۔ اپنے علاقے لکھنو میں بالغوں کی تعلیم کے لیے تحریک چلا رہی ہیں۔ حیات اللہ انصاری بتا رہے ہیں کہ انہیں آزادی سے پہلے سے ہی تعلیم بالغاں سے بہت دلچسپی ہے۔ شوکت صدیقی صاحب نے اپنے ناول خدا کی بستی میں جس سلسلے کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل ہم سے ہی متعلق ہے۔ حیات اللہ انصاری، اردو کے مشہور افسانہ نگار، اہل زبان اور میں انتہائی جونیئر۔ بچپن سے ان لوگوں کو پڑھ رہا ہوں۔ پھر ٹھہرا بھی پنجابی۔ میں گھبرا بھی رہا تھا۔ کہیں شین قاف غلط نہ ہو جائے۔ بیگم حیات اللہ انصاری مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ صحافیوں میں سے خاص طور پر ضمیر صدیقی صاحب کے بارے میں دریافت کر رہی تھیں۔ حیات اللہ انصاری بیگم سے پوچھ رہے تھے۔ کون ضمیر۔ وہ کس حوالے سے بتا رہی تھیں تو انہیں یاد آتا۔ کھانا گھر کا پکا ہوا تو مل نہیں سکتا، نیچے سے منگوایا گیا۔ بیگم حیات اللہ انصاری تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اپنی کارکردگی بڑے فخر سے مجھے دکھا رہی تھیں جس میں زیر تعلیم بالغ خواتین وحضرات کی ایک ایک دن آگے بڑھنے کی رفتار نظر آتی ہے۔ پہلے دن کیسے لکھا اور سترہ روز کے بعد کیسے لکھنے لگیں۔ یہ براہ راست تعلیم کا سلسلہ ہے۔ لگن کی بات ہے۔ ورنہ اس عمر میں یہ لوگ آرام سے بھی زندگی بسر کر سکتے ہیں کیا ضرورت پڑی کہ دیہات اور قصبوں میں مارے ماریں۔ حیات اللہ انصاری اپنے پرچے ''سب ساتھ'' میں پاکستان کے اخبارات سے تراشے شائع کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہندوستان کے لوگ جان سکیں کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ وہ بھی پاکستان جا سکیں۔ اگر صرف صحافیوں کو ہی جانے کی اجازت ہے تو وہ اپنے اخبار ''سب ساتھ'' کی طرف سے چلے جائیں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ اپنی وزارت خارجہ کے ذریعے اس کے لیے کوشش کریں۔ حکومت پاکستان کو آپ کو ویزا دینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ انہوں نے مجھے اپنا عہد آفریں ناول ''لہو کے پھول'' پیش کیا۔ ناول پانچ جلدوں میں ہے۔ رنگ برنگی جلدیں، نیلی، پیلی، سرخ، سبز، کل صفحات دو ہزار چھ سو ہیں۔ مجھے تو ایک تحفے کے طور پر ملا ہے۔ قیمت 70 روپے ہے۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق 100 روپے سے اوپر بنجھ

لیجیے۔ اس لیے پاکستان جا کر پڑھوں گا۔ ایک بروشر بھی ساتھ ملا جس میں بتایا گیا کہ یہ ناول دہلی دربار 1911ء کے بعد سے شروع ہو کر جدوجہد آزادی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا 1947ء کے یوم آزادی اور پھر فسادوں اور ہنگاموں، گاندھی جی کے آخری برت اور موت سے ہو کر پہلے پنج سالہ منصوبے پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں سب کچھ ہے نوابوں، جاگیروں کی تہذیب، مزدور کسان، تحریک آزادی، کانگریس، مسلم لیگ۔ اس بروشر میں اس ناول کے بارے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، معین احسن جذبی، گوپی ناتھ امن، خواجہ احمد فاروقی، مسعود حسین خان، محمد حسن نورالحسن ہاشمی، اسلوب احمد انصاری، اختر اورینوی اور شمس الرحمن فاروقی نے ناول پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ ناول مصنف نے وزیراعظم اندرا گاندھی کو بھی پیش کیا اس ناول کے اجراء کی تقریب میں وزیر مملکت برائے اطلاعات ونشریات اندر کمار گجرال نے بھی شرکت کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار ادب سے کتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ناول ہندوستان کی آزادی کی مبسوط تاریخ ہے۔ میرے لیے یہ ناول بہرحال ایک بہت بڑا ادبی تحفہ ہے جو پاکستان میں ادب کے نہ جانے کتنے پیاسوں کی پیاس بجھائے گا۔

اپنے خرچ پر قیام، پہلی بھارتی فلم

آج مجھے اشوکا ہوٹل چھوڑنا ہے۔ سرکاری مہمانداری ختم ہو رہی ہے۔ بھارت سرکار کو کافی مالی گزند پہنچا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ لودھی بھی بھارت کی سیاحتی کارپوریشن کا ہے مگر یہ تین ستاروں والا ہوٹل ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے مزار اقدس کے بالکل سامنے۔ یہ پورا علاقہ لودھی اسٹیٹ کہلاتا ہے۔ یہاں کہیں آس پاس لودھی خاندان کی یادگاریں بھی ہیں۔ اسے ہوٹل مجبیس جیسا سمجھ لیجیے مگر سلیقہ زیادہ ہے یہاں بھی غیر ملکی کافی تعداد میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ اور غیر ایئر کنڈیشنڈ دونوں طرح کے کمرے ہیں۔ اپنے خرچ پر تو یہاں ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ہی ٹھہرا جا سکتا ہے۔

مجھے ہندوستان میں دو ہفتوں سے زیادہ ہو چکے تھے۔ کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ آج شام خالی تھی اس لیے سوچا کہ کوئی فلم دیکھ لی جائے۔ فلم اکیلے دیکھنا مشکل ہے میں نے عتیق صدیقی صاحب کو پکڑ لیا۔ وہ پاکستان بھارت تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے کافی سنجیدہ ہیں اسی لیے ان سے زیادہ ملاقات بھی ہو رہی تھی۔ میں ان پر جب اپنا ارادہ ظاہر کرتا تو وہ کچھ پریشان سے ہو جاتے۔ بات یہ کھلی کہ انہوں نے گزشتہ پندرہ برس سے کوئی فلم نہیں دیکھی۔ کچھ خاص جانتے بھی نہیں، پھر بھی ہمراہی کے لیے تیار ہو گئے۔ اس ارادے کے بعد ریگل سنیما سامنے پڑتا ہے۔ اس میں ''سیتا اور گیتا'' چل رہی ہے۔ یونہی رونق میلے والی فلم ہے لیکن جو مل جائے غنیمت ہے۔ سنجیو کمار، ہیما مالنی، کوئی صاحب بتا رہے تھے کہ دونوں آج کل کے مقبول اداکار ہیں۔ فلم میں رنگ بھی اچھے ہیں۔ ملبوسات بھی مگر اس فلم کو دیکھ کر مجھے اپنی پاکستانی فلموں کے بارے میں کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا۔ وہی فارمولا لڑکی ڈوبے گی تو ہیرو کے کسی رشتے دار کے ہاں جا کر ہی اسے ہوش آئے گا۔ اس میں ہیما مالنی کا دہرا کردار ہے۔ ایک میں غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ دوسرے میں امیر گھرانے کی۔ دونوں اپنے اپنے گھر سے بھاگتی ہیں۔ تو گھر بدل جاتے ہیں۔ اس طرح ڈراما میلو ڈراما، ولن، لڑائی مار کٹائی، ناچ گانے۔ ''ساتھی، چل ساتھی چل، ہوا کے سنگ سنگ'' ''میں نے شراب پی لی ہے بے حساب پی لی ہے۔'' اور آخر میں سب کچھ۔ ظلم کرنے والے کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ لڑکی اپنے اپنے چاہنے والے کے پاس اور تماشائی کھیل ختم پیسہ ہضم کا ورد کرتے ہوئے سنیما کے باہر۔ آخر میں گروپ فوٹو بھی پوری پاکستانی فلموں جیسی۔ میرا تو جو حال ہو رہا ہے۔ سو ہو رہا ہے۔ عتیق صدیقی بہت پریشان ہیں۔ وہ پندرہ برس سے کسی سنیما گھر میں نہیں گھسے۔ خیر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آخر پاک بھارت تعلقات

اسی طرح تو بہتر ہوں گے۔

اب میں پاکستان لوٹنے کے لیے بے تاب ہوں۔ کتنے روز ہو گئے ہیں۔ وطن سے دور آئے۔ کوئی رابطہ بھی نہیں ہے۔ ریڈیو سے خبریں سن کر کہاں تک تسلی ہو سکتی ہے۔ بنگلہ دیش میں انتخابات نزدیک ہیں۔ اس لیے اور بے یقینی کی کیفیت ہے۔ ہندوستان والے ''بلیک دسمبر'' سے خوفزدہ ہیں۔ کسی نہ کسی روز کوئی خبر شائع ہو جاتی ہے۔ کبھی کہیں ''بلیک دسمبر'' نے دھمکی دے دی۔ معاملات ان کے اپنے ہیں مگر دھمکیاں ''بلیک دسمبر'' والے دے رہے ہیں۔ یہ بھی خوب ہے۔ کسی صوبائی وزیر سے بلیک دسمبر کو کیا واسطہ۔ مگر لوگوں کو تفریح کا سامان مل گیا ہے۔ ادھر وزیراعظم اندرا گاندھی کے بنگلے کے سامنے بھی ایک بندوق بردار پکڑا گیا ہے۔ وہاں بھی پہرہ سخت ہو گیا ہے۔ کئی سفارت خانوں نے اپنے لیے پولیس گارڈ مانگی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہیں مجھے بھی کسی روز ''بلیک دسمبر'' کا رکن سمجھ کر اندر نہ کر دیں۔ اس لیے اب یہاں سے کوچ ہی بہتر ہے۔ صرف ایک انٹرویو کے لیے رکا ہوا ہوں اور وہ انٹرویو کافی اہم ہے۔

وزیراعظم اندرا گاندھی کے بنگلے کے سامنے سے جو آدمی بھری ہوئی بندوق کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ اس سے دہلی میں ایک عجیب خوف پھیلا ہوا ہے۔ اخبارات میں اس کے ڈانڈے مختلف تحریکوں سے ملا رہے ہیں۔ بہار کے ایک گاؤں خیرا کا رہنے والا کنچن سنگھ رکشے سے اتر کر استقبالیہ کی طرف چلا تو سیکورٹی والے نے گھیر لیا۔ وہ اس کے پاس کا غذات ڈھونڈنے لگے کہ شاید اسے کسی مشن پر بھیجا گیا ہو۔ اخبار نویس بھی سرگرم ہو گئے شاید کوئی بڑی اسٹوری مل جائے۔

بہت سے پاکستانی جو دسمبر 1971ء کی جنگ سے پہلے کے رکے ہوئے ہوں گے اور پاسپورٹ میں مزید توسیع نہ ہونے کے باعث نہیں جا سکے ان میں سے کسی کو پکڑ لیا جاتا ہے اور پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی خبر مل جاتی ہے۔

یہ پرانی دلی ہے۔ پہاڑ گنج... جمنا داس اختر کے روزنامہ ''سویرا'' کا دفتر۔ ایک محلے میں ایک پرانی سی عمارت، دو تین کمرے۔ تین خوش نویس حضرات۔ پیلے مسطر لیے، لیتھو کی سیاہی سے کتابت کر رہے تھے۔ اور یہ لکھنا باقی تھا۔ کاتبوں کو ادار یہ چاہیے۔ جمنا داس اختر نے قلم برداشتہ شروع کر دیا۔ ابھی چلتے ہیں۔ یہ اصلی اخبار نویس ہیں۔ آج میں کچھ کتابوں کی دکانوں کے چکر لگانا چاہتا ہوں۔ ''سویرا'' کے دفتر میں ''چالو چائے'' پیتے ہیں پھر یونیورسل پبلشرز کی طرف چلتے ہیں۔ یہ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ تالاب کے پاس رہا کرتے تھے۔ خالص جھنگوچی بولی سنائی دے رہی ہے۔ ان کا جھنگ میں اپنا پریس ہوتا تھا۔ پورے جھنگ میں ایک ہی پریس تھا۔ جھنگ سے میرا تعلق سن کر وہ اور خوش ہوئے۔ پھر جھنگ کے بارے میں تفصیلات پوچھنے لگے۔ ریل بازار جھنگ بازار، مائی ہیر کا مقبرہ اور کیا کچھ۔ جمنا داس اختر کی کتابیں اسی ادارے سے شائع ہوتی ہیں۔ بلراج ساہنی نے اپنی کتاب پنجابی ایڈیشن کے لیے مجھے ''آرسی'' (پنجابی رسالے) کے ایڈیٹر پریم سنگھ کے نام خط دیا ہے۔ نریوگ پریس کا پتا مشکل سے ملتا ہے۔ مارکیٹ کے کہیں اندر جا کر ایک کونے میں پریس ملا۔ سردار جی بڑی محبت سے ملے۔ پاکستان سے سفارتی تعلقات کے نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا کیونکہ پنجابی میں لکھنے والوں کی نظمیں، غزلیں، افسانے انہیں نہیں مل رہے ہیں۔ صرف ایک دو شاعروں کی چیزیں لندن کے ذریعے ان تک کبھی کبھار پہنچ جاتی ہیں۔ ورنہ کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔ سردار جی آصف خاں، احمد راہی، احمد سلیم، شفقت تنویر مرزا، افضل کاں کو سلام پہنچانے کے لیے کہا۔ بلراج ساہنی کا پاکستان کا سفرنامہ پنجابی ایڈیشن لے کر رخصت ہوا۔ ایک ہندی کتابوں کے پبلشر کی طرف بھی جانا ہوتا ہے۔ بہت بڑا کاروبار ہے۔ یہ لالہ جی ملتان کے رہنے والے ہیں۔ ہندی کتابوں کی اچھی مارکیٹ ہے۔ سستی کتابوں کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ جن کی اچھی مارکیٹ ہے

جس کتاب کی ہمیں تلاش ہے، وہ دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ مجھے ان کا کاروبار دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہندوستان والے اپنی قومی زبان میں شائع ہونے والی کتابیں بڑے پیمانے پر خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ ناول، کہانیاں ہی نہیں، تاریخی سیاسی اور معاشی موضوعات پر بھی کتابیں کافی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔

دہلی چھوڑنے کے دن قریب آ رہے تھے۔ ہم نہ جانے کتنی بار دہلی چھوڑ چکے ہیں دہلی جہاں ہماری تاریخ سانس لیتی ہے۔ دہلی جس کے سینے میں ہم اب بھی دھڑکتے ہیں۔ رام لیلا گراؤنڈ، لال قلعہ، جامع مسجد، ہم سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔ صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔ میں اب جو ایک نئی مملکت کا باشندہ ہوں۔ اپنی نئی مملکت سے وابستگی کو مزید گہرا کرنے کے لیے اپنی تاریخ اور ماضی میں جھانکتا پھر رہا ہوں شاید اسی سے میرا احساس زندہ ہو کہ ہم سے بھی کبھی عظمت اور عزت منسوب رہی ہے۔ آج جو ہماری حالت ہے ہمیشہ سے نہیں تھی۔ میرے اس احساس کے ساتھ جانے کتنے اور پاکستانیوں کا احساس زندہ ہو۔

لودھی ہوٹل۔ بھی تو ہماری تاریخ سے وابستہ ہے۔ لودھی خاندان، ہمارا ماضی ہی تو ہے۔ سامنے بستی نظام الدین اولیا۔ لودھی ہوٹل میں سیاحتی کارپوریشن نے ہندوستانی مصنوعات کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ بینک بھی ہیں، اخبار رسائل کتابیں یہ پنجابی خاتون کتابیں رسالے بیچتی ہیں۔ والدین لاہور کے رہنے والے ہیں۔ ساڈا جنم تے ایدھر دا ای اے، ساڈے وڈے وسدے نیں لہور بہوت چنگا شہر سی۔ (ہماری پیدائش تو ادھر کی ہی ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں لاہور بہت اچھا شہر تھا۔ رستے کھل جان۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی اسی وی لہور تکیے (راستے کھل جائیں۔ حالات ٹھیک ہوں تو ہم بھی لاہور دیکھیں)

ایک سی شکلیں، ایک زبان، ایک لہجہ مگر یہ تو اور بہت سے ملکوں میں بھی ہے اور ان کے ہاں دشمنیوں اور عداوتوں کی اتنی لمبی داستانیں نہیں ہیں۔ اگر بھارت کے حکمراں بھی وہی سوچتے جو ان کے عوام سوچتے ہیں تو یہ خاتون اپنے آباء و اجداد کا شہر لاہور نہ جانے کتنی بار دیکھ چکی ہوتی۔ میں جو اتنے دن سے ہندوستان میں گھوم پھر رہا تھا میری طرح اور کتنے صحافی کتنے لوگ مخلصانہ طور پر کوششیں کر رہے ہیں کہ پاکستان اور بھارت پرامن ہمسایوں کی طرح رہ سکیں۔ ہماری سیاسی بے یقینیوں اور بھارت کی توسیع پسندیوں نے ہم سب کی کوششوں کو زیر کر رکھا ہے۔

سیکولر بھارت میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ اتنے ان ملکوں میں بھی نہیں ہوتے۔ جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ بھارت کتنا بھی سیکولر ہو لیکن ہندو اکثریت اپنا غلبہ تو رکھتی ہے۔ جن سنگھ، راشٹریہ سیوک سنگھ اور کئی دوسری تنظیمیں ہندو غلبے کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہتے ہیں۔ ایسے میں کانگریس کی ایک لیڈر اور لوک سبھا کی رکن شریمتی سبھدرا جی، سیکولر ڈیموکریسی کی تحریک چلا رہی ہیں۔ انہوں نے فرقہ واریت کے خلاف ایک باقاعدہ تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ جس کے اپنے رضا کار ہیں۔ اپنے عہدیدار ہیں۔ ہندوستان بھر میں شاخیں ہیں سیکولر ڈیموکریسی کے نام سے ایک ماہنامہ بھی شائع ہوتا ہے۔ جو انگریزی، ہندی اور اردو میں شائع ہوتا ہے۔ اس تنظیم میں مسلمان، ہندو، سکھ عیسائی سب شامل ہیں۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ اس تنظیم سے بہت نالاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ایل آر گوئیل صاحب سیکولر ڈیموکریسی کے ایڈیٹر ہیں۔ ان سے میری پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ آج ذرا تفصیل سے مل رہے ہیں۔ کل سبھدرا جی سے ملیں گے۔ کناٹ سرکس کے پاس لاٹری کی دکانوں کے پیچھے ان کا دفتر ہے۔ جہاں دن بھر سیاسی کارکن بھی آتے رہتے ہیں۔ کانگریسی مسلمان بھی کافی تعداد میں آتے ہیں جن سنگھ کے تعصب اور تشدد کے مقابلے میں ان کی کوئی

حیثیت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی فرقہ واریت کے خلاف ان کا وجود غنیمت ہے۔

پریس کلب آف انڈیا

یہ پریس کلب آف انڈیا ہے۔ دلیپ مکرجی۔ پاکستان دو مرتبہ آچکے ہیں۔ دلیپ مکرجی اور کلدیپ نائر پہلے دو صحافی ہیں۔ جو معاہدۂ شملہ سے پہلے پاکستان آئے اور صدر بھٹو کا انٹرویو کیا جس سے پاکستانی اور بھارت صحافیوں کی ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے کی روایت پڑی ہے۔ دلیپ مکرجی ٹائمز آف انڈیا میں ہیں۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ مختصری جسامت کے آدمی ہیں سیدھے سادے لباس بھی انتہائی سادہ انگریزی اخبار میں کام کرتے ہیں لیکن انگریزی کے صحافیوں والی مخصوص کج دھج نہیں ہے۔ رہنے والے تو کلکتے کے ہیں مگر خاندان بہت پہلے لکھنو میں آباد ہو گیا تھا۔ اس لیے لکھنو کا تکلف، رکھ رکھاؤ فطرت میں شامل ہو گیا ہے۔ وہ پھر پاکستان جا رہے ہیں مجھے ساتھ ہی چلنے کو کہہ رہے ہیں۔ اب کے ممتاز بھٹو، گورنر بگٹی اور اسلم خٹک کا انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ تار بھیج چکے تھے۔ پاکستان سے سیکریٹری وزارت اطلاعات نسیم احمد کا جوابی تار آچکا تھا۔ انٹرویو کی تاریخیں مقرر ہو گئی تھیں۔ یہ پاکستان جائیں گے اور دو تین دن میں تمام کام نمٹا کر واپس چلے آئیں گے۔ پاکستان کی بیورو کریسی، ہندوستان کی بیورو کریسی سے اس معاملے میں تو اچھی رہی ہے مجھے ہندوستانی بیورو کریسی کی وجہ سے جتنا وقت ضائع کرنا پڑا ہے ان کا تو نہیں ہو گا وہ مجھ سے بلوچستان اور سرحد میں حالیہ سرکاری تبدیلیوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ آپ وہاں جا ہی رہے ہیں آپ کو خود ہی حالات کا علم ہو جائے گا۔ میں بھی کافی عرصے سے یہیں ہندوستان میں ہوں، مجھے کچھ خاص علم نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ مگر وہ پھر بھی مجھے بتانا چاہ رہے ہیں کہ مسٹر بھٹو بھی وہی غلطی کر رہے ہیں جو یحییٰ خان نے کی تھی۔ یحییٰ خان کے ان اقدامات سے بنگلہ دیش میں جو کچھ ہوا۔ اس سے انہیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سبق تو واقعی حاصل کرنا چاہیے لیکن بھارت کے لیے بلوچستان یا سرحد میں اس طرح مدد کرنا مشکل ہو گا۔ جس طرح اس نے مشرقی پاکستان میں کی ہے۔ دوسرا بنگلہ دیش بنانا اب مشکل ہی ہے۔

ادھر گوپال متل بھی بیٹھے ہیں۔ لاہور کی یادوں میں الجھے ہوئے کچھ اور لوگ بھی۔ ستیش، راج نرائن کچھ لوگ جن کے نام نہ پوچھے ہیں نہ یاد رہیں گے۔ لاہور یاد آرہا ہے۔ نوائے وقت، انقلاب، ویر بھارت، گوپال متل، اردو غزل میں ایک بلند نام رکھتے ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کی کافی چیزیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہیں لاہور کی یاد ستاتی ہے تو ایک مصرع گنگناتے ہیں۔

وہ قاتل یاد آتے ہیں وہ رہزن یاد آتے ہیں

میری بھی تو راجپورہ، پٹیالہ سے وابستہ یادیں کچھ اسی قسم کی ہیں۔

آج مجھے شیخ عبداللہ کی طرف جانا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے اس سفر کا حاصل یہی انٹرویو ہونا چاہیے۔ کوٹلہ روڈ پر شیخ عبداللہ خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے ایلچی اور مسز اندرا گاندھی کے ایلچیوں میں گفتگو ہو رہی ہے۔ شیخ صاحب اب بھی نہ جانے کیا امید باندھے بیٹھے ہیں۔ پرانی طرز کی کوٹھی ہے۔ چاروں طرف وسیع لان ہیں۔ بیچ میں چند کمروں پر مشتمل بنگلہ۔ شیخ صاحب گاؤن میں ملبوس ہیں۔ چہرے پر جھریاں ہیں، کشمیر کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کھل کر۔ وہ 1947ء سے لے کر اب تک کی باتیں بیان کر رہے ہیں کہ میں تو ادھر سے بھی معتوب ہوں۔ ادھر سے بھی۔ کیا کروں، کیا نہ کروں...... مجھے پاکستانیوں نے سمجھا نہ ہندوستانیوں نے اور میں کہ اپنے آپ کو نہ بھارتی سمجھتا ہوں نہ پاکستانی۔ میں نے تو ذہنی طور پر تقسیم کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ اب خیر جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب تو لڑائی جھگڑا چھوڑیں۔

(انٹرویو اسی کتاب میں الگ حصے میں شامل ہے) شیخ صاحب نے یہ شعر مجھے لکھ کر دیا۔

یقین محکم، پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

شیر کشمیر پر بڑھاپے نے حملہ کیا ہوا ہے۔ دہلی کی فضا میں کشمیر کی تاریخ بند پڑی ہے۔ یہ تاریخ کون مکمل کرے گا؟

ڈاکٹر ستیش کمار...... ایک حقیقت پسندانہ آواز

ڈاکٹر ستیش کمار۔ کئی روز سے مجھے فون کر رہے ہیں۔ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف ڈپلومیسی میں لیکچرر ہیں۔ پاکستان ان کا مضمون خاص ہے۔ ہندوستان ٹائمز میں ہر ہفتے پاکستان کے معاملات پر مضمون بھی لکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں انہیں کچھ پاکستان کے بارے میں بتاؤں آج ملاقات ہو رہی ہے۔ نوجوان لیکچرر۔ جنہیں ہندوستان کی نئی نسل کا نمائندہ سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ پاکستان کے بارے میں اپنے بعض مضامین کے تراشے بھی لائے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں ان کا نقطہ نظر دلیپ مکرجی اور کلدیپ نائر وغیرہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان کی عینک سے نہیں دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے مسائل، پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات، سیاسی پس منظر اور اس کے مخصوص تاریخی و جغرافیائی سیاق و سباق میں رکھ کر مطالعہ کرتے ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ ایک حقیقت پسندانہ اور صحت مندانہ زاویہ نگاہ ہے۔ مجھ سے وہ پاکستان کے تمام علاقوں کی سیاسی صورت حال کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہے ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان کو حقائق سے آگاہ کر سکوں تاکہ وہ آئندہ پاکستان کے بارے میں لکھیں، تو ان کے پاس کچھ حقائق پر مبنی معلومات ہوں۔ اب تک پاکستان کے بارے میں انہوں نے ہندوستان ٹائمز میں جو مضامین لکھے ہیں وہ اگرچہ زیادہ تر ہندوستانی اخبارات، پاکستان ریڈیو اور کسی ذریعے سے پہنچ جانے والے بعض پاکستانی اخبارات سے اخذ کردہ معلومات پر مشتمل ہیں لیکن ان کا بنیادی زاویہ پھر بھی کافی متوازن ہے۔ ان کا ایک تفصیلی مضمون بمبئی کے ایک پرچے ''کوئسٹ'' کے شمارہ نمبر 79 نومبر دسمبر۔ دسمبر 1972ء میں شائع ہوا۔ عنوان اس کا ''پاکستان اور برصغیر'' ہے۔ اس میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد کے پاکستان کا جائزہ لیا ہے۔

ان کے خیال میں موجودہ پاکستان برصغیر جنوبی ایشیا میں بین العلاقائی تعلقات میں ایک نئے انداز کا آغاز کرسکتا ہے۔

بقول ڈاکٹر کمار کے ''اس سلسلے میں اب کوئی شبہ نہیں بلکہ پاکستان میں بھی یہی احساس ہے کہ مشرقی بازو کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان ماضی کی نسبت جغرافیائی طور پر زیادہ مضبوط اور ثقافتی طور پر زیادہ ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اس لیے اس کے قومی اتحاد کا مسئلہ اب بہت کم شدت رکھتا ہے۔ اگرچہ بالکل ختم نہیں ہوا ہے۔ 1971ء کے حالات نے برصغیر کے ڈھانچے میں ایک تبدیلی یہ پیدا کی ہے کہ اس کے سیاسی حسے اب زیادہ معقول اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوئے ہیں جس سے بین العلاقائی کشیدگی میں کمی کے امکانات بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ علاوہ اس بات کے کہ اب برصغیر کا سیاسی توازن دو کی بجائے تین ملکوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب یہ بھی حقیقت ہے کہ تینوں میں سے کوئی ایک باقی دونوں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مستقبل میں تینوں ملکوں کے درمیان باہمی مفاہمت اور تعاون تصادم اور کشمکش کی جگہ لے لے گا۔

پھر وہ پاکستان کے مختلف سیاسی نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لیتے ہیں۔ منتخب جمہوری حکومت کے قیام سے برصغیر میں امن کے قیام کا جائزہ لیتے ہیں۔ پاکستانی اخبارات موجودہ مسائل پر کیا پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مختلف سیاسی جماعتیں، بنگلہ دیش اور بھارت سے متعلق کیا رائے رکھتی ہیں۔ ان سب امور کا جائزہ لیتے ہوئے وہ برصغیر کے ملکوں کے درمیان باہمی تعاون کے شعبوں کی تخصیص بھی کرتے ہیں جس میں ثقافت، تعلیم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تعاون تجارت میں باہمی منصوبہ بندی

مشترکہ صنعتی منصوبے۔ ہائیڈرو الیکٹریکل منصوبوں میں تعاون۔ یہ ان کے نزدیک بالآخر حاصل کیے جانے والے مقاصد ہیں لیکن اس سے پہلے بھارت پر کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر ستیش کمار کے منصوبے کا حاصل بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ ذرا غور سے دیکھئے لکھتے ہیں۔

''اگر برصغیر کو اب نیا ماحول اختیار کرنا ہے تو بھارت پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں بھارت کی رقبے اور آبادی میں بڑائی اس پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ اس کو اب اشتعال انگیز سیاست میں نہیں الجھنا چاہیے۔ اسے اپنے اصولوں کی روشنی میں چلنا ہوگا اپنے ہمسایوں کے سلسلے میں اس کا رویہ، مفاہمت، برداشت اور اگر ضروری ہو تو فراخدلی پر مبنی ہونا چاہیے۔ کسی ہمسائے کے دل میں بھی یہ شائبہ نہ آنے پائے کہ بھارت اپنی بڑائی کو ان کے مفاد کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ بھارت کے خلاف پاکستان کی دشمنی بھی دراصل اسی خوف کے باعث رہی ہے اور اس خوف کو دور کرنے میں بھارت کی ناکامی بھی اس کا سبب ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر پیش بینی سے کام لیا جائے تو پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے قومی مفادات ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں۔''

بھارت نے اپنی بڑائی سے اب تک جو استحصال کیا ہے۔ اس کے بارے میں پہلی بار کسی بھارتی دانشور نے لکھا ہے۔ نئی نسل کے نمائندے کی حیثیت سے ان میں اس احساس کی موجودگی بھی بڑی بات ہے اگر بھارت کی نئی نسل بھارت کے ارباب اقتدار کو یہ سمجھا سکے کہ وہ اپنی بڑائی تھوپنے اور چھوٹے ہمسایوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے سحر سے نکل سکے تو اس میں نہ صرف برصغیر کا بلکہ اس کا بھی فائدہ ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر ہی برصغیر کے مسائل کو حل کرسکتا ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ فوری نوعیت کے جو مسائل درپیش ہیں پہلے انہیں حل کر دیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔ جنگی قیدیوں کی واپسی ہمارے نزدیک سب سے سنگین مسئلہ ہے۔ جب تک ہمارے یہ ہم وطن بھارت کی قید میں ہیں، ہم اپنے ہم وطنوں سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بھارت سے پرامن تعلقات ہونے چاہئیں اور باہمی تعاون سے منصوبے بننے چاہئیں۔ ڈاکٹر ستیش کمار بتاتے ہیں کہ وہ اس مسئلے پر پہلے لکھ چکے ہیں اور ان کا موقف بھی یہی تھا کہ جن لوگوں پر بنگلہ دیش کوئی مقدمہ نہیں چلانا چاہتا۔ انہیں قید میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ڈاکٹر ستیش کمار کہہ رہے ہیں کہ آپ اب پاکستان جانے والے ہیں۔ پہلے سے رابطہ ہوجاتا تو آپ کو ہم یونیورسٹی میں بلاتے اور آپ پاکستان پر کوئی لیکچر دیتے۔ اب آپ آئندہ کبھی آئے تو یونیورسٹی کے لیے وقت ضرور نکالیے گا۔

اب میں رخت سفر باندھ رہا ہوں۔ ضروری کتابیں، کاغذات سنبھال رہا ہوں۔ کسی روز بھی پان امریکن سے سیٹ لے کر چل دوں گا۔

ترقی پسند ادیبوں کا سیمینار

کل ترقی پسند ادیبوں کا سیمینار ہے۔ اس میں شرکت کرنا ہے۔ آج بھی ہے لیکن آج فرصت نہیں مل سکی ہے۔ سیمینار غالب اکیڈمی میں ہورہا ہے موضوع ہے ''اردو ادب میں عصری آگہی... آزادی کے بعد...''

ترقی پسند ادیبوں کے زیر اہتمام اس دو روزہ سیمینار کے کنوینر قمر رئیس ہیں ان سے پہلے ملاقات ہوچکی ہے۔ ان کی طرف سے دعوت نامے میں لکھا گیا ہے۔

''ہر عہد کا ادب اپنے زمانے کی حقیقتوں کا فنی اظہار ہوتا ہے۔ زندگی کا عرفان ہی اسے قوت، انفرادیت اور حسن عطا کرتا ہے۔ گزشتہ 25 برسوں کے اردو ادب میں عصری زندگی کی جو نئی آگہی ہے حقائق کے احساس و ادراک کی جولہریں ہیں۔ جن نئی سمتوں کی تلاش، نئی کروٹوں کا شعور، نئی انسانی الجھنوں کا کرب اور نئے خوابوں کی روشنی ہے۔ وہ کیا ہے؟

اس سیمینار میں ہم ان مسائل پر غور کریں گے۔ ہم آپ کو شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔''

آج پہلے اجلاس میں جو 9 بجے سے ایک بجے تک ہوا ہوگا۔ اس میں زیر بحث ''افسانوی ادب'' ہے۔ متوقع شرکاء میں اقبال مجید، آمنہ ابوالحسن، انور عظیم، بلراج مین را، رتن سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر، شریف احمد، شمیم نکہت، عابد سہیل، عظیم الشان، قاضی عبدالستار، کوثر چاند پوری، مجتبیٰ حسین، وحید اختر کے نام لکھے ہیں۔ معلوم نہیں کون کون آیا ہو۔

دوسرا اجلاس جو 3 بجے سے 4 بجے تک ہے۔ اس کا موضوع تنقید ہے۔ اس کے متوقع شرکاء افصح ظفر، تقی حیدر، دیوندر اسر، سجاد ظہیر، سید محمد طفیل، شارب ردولوی، صدیق الرحمن قدوائی، عبدالحق، قمر رئیس، کمال احمد صدیقی اور نعیم احمد ہیں۔

آج صبح سویرے ہی شاہد صاحب ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بلراج کومل وغیرہ بھی ادھر آ رہے ہیں کچھ دیر انتظار کرتے ہیں۔ پھر ہم سوچتے ہیں کہ سیمینار میں ہی چلتے ہیں۔ شاید وہ وہیں چلے گئے ہوں لودھی ہوٹل کے بالکل سامنے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے عقب میں غالب اکیڈمی ہے۔ آڈیٹوریم بھرا ہوا ہے۔ بزرگ، نوجوان، خواتین کچھ لوگ جنہیں میں پہچانتا ہوں۔ کچھ اجنبی، مذاکراہ جاری ہے۔ آج کے متوقع شرکاء میں نام تو ابوالفیض سحر، اجمل اجملی، اسلم پرویز، امیر عارفی، انور صدیقی، حسن نعیم، ذکیہ انجم، رفعت سروش، شہاب جعفری، عمیق حنفی، عنوان چشتی، غلام ربانی تاباں، فصیح اکمل قادری اور فضل الحق کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کون کون موجود ہے یہ تو تعارف ہونے پر ہی معلوم ہوگا۔ میں خاموشی سے داخل ہوتا ہوں۔ سجاد ظہیر صاحب کے پاس ایک نشست خالی ہے۔ وہیں بیٹھنے کا اشارہ پا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سیکریٹری کے فرائض قمر رئیس ادا کر رہے ہیں۔ کمال احمد صدیقی اور احمد عقیل بھی اسٹیج پر موجود ہیں۔ کمال احمد صدیقی صدارت کر رہے ہیں۔

آج کا موضوع شاعری ہے۔ عصری آگہی کے حوالے سے شاعری کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ ایک صاحب تقریر ختم کر کے جاتے ہیں۔ پیچھے سے کوئی صاحب اٹھ کر کہتے ہیں: صاحب صدر! پاکستان سے ایک مہمان ادیب صحافی اور شاعر محمود شام بیٹھے ہیں۔ ان کا تعارف کروایا جائے۔ قمر رئیس صاحب میرا تعارف کروانے کے لیے آتے ہیں۔ ایک خاتون کہتی ہیں: محمود شام صاحب سے کہیں کہ وہ خود ہی اسٹیج پر آ کر اپنا تعارف کروائیں۔

میں اسٹیج پر موجود ہوں۔ غالب اکیڈمی۔ چند قدم پر غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بستی نظام الدین اولیاء میرے سامنے سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، رضیہ سجاد ظہیر اور جانے کیسے کیسے بزرگ بیٹھے ہیں۔ میں ان کے مقابلے میں ایک جونیئر ادیب شاعر، میں اسٹیج پر صرف اس لیے آ گیا ہوں کہ میری انفرادیت یہ ہے کہ میں اس وقت یہاں موجود واحد پاکستانی ہوں۔ میں اپنا تعارف کروا رہا ہوں۔ ہندوستان آنے کا مقصد بتا رہا ہوں اور ساتھ یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ صحافت میں زیادہ الجھ جانے اور پاکستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے ادب کی بجائے سیاست میں براہ راست دلچسپی کے سبب ادب سے رشتہ بہت دور کا ہو گیا ہے اس لیے میرے خیال میں یونہی سطحی باتیں کرنے سے پاکستانی ادب کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں گا یہ ضرور کہوں گا کہ گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے حالات نے ہمارے لکھنے والوں میں عصری آگہی کو شدید کر دیا ہے۔ ابھی یہ معاملات ذہنی تجربات بننے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ آئندہ جو ادب تخلیق ہوگا وہ یقیناً جذبات کی شدت سے بھرپور اور حقائق کا کرب بھی لیے ہوئے ہوگا۔''

میں یہ چند جملے بول کر اسٹیج سے نیچے اتر آیا ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔ اتنے بڑے ادیبوں، شاعروں کے سامنے اپنی بنی بنائی عزت کیوں خراب کروں۔ سجاد ظہیر کہہ رہے ہیں آپ کچھ ادب کے بارے میں بتا دیتے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے بغیر

تیاری کے بہت اچھا نہیں لگتا۔ میں تو آپ حضرات کو سننے آیا ہوں۔ آج کی بحث کافی گرم ہے۔ گزشتہ روز بھی کچھ تلخی ہو چکی ہے۔ بات اگرچہ وہیں پہنچی ہے ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب۔ کچھ انسان کی تنہائی کا مسئلہ بھی ہے۔ ثقہ قسم کے ترقی پسند بزرگ ان احساسات کو فرار کہہ رہے ہیں۔ مسئلہ وہی ہے جس طرح ہمارے ہاں بھی بعض پرانے ترقی پسند پبلک ریلیشنز آفیسر بن گئے ہیں یا اور اچھی نوکریوں پر ہیں۔ جن کے لیے روزگار مسئلہ نہیں رہا ہے۔ وہ آفاقی ترقی پسندی کی بات کر سکتے ہیں۔ قنوطیت سے گریز کر سکتے ہیں۔ سجاد ظہیر اپنی تقریر میں شاید حیات اللہ انصاری کے بارے میں کہہ گئے ہیں کہ حکومت کے دباؤ کی وجہ سے یہ ترقی پسند تحریک سے الگ ہو گئے تھے۔ سجاد ظہیر صاحب اور بھی بڑی باتیں کہہ گئے ہیں۔ حیات اللہ انصاری جواب کا حق مانگ رہے ہیں۔ وہ اسٹیج پر آ کر ماضی کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کچھ اور واقعات سنانے لگتے ہیں تو احمد عقیل صاحب قطع کلامی کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ ذاتیات سے گریز کیا جائے موضوع تک ہی محدود رہا جائے۔ حیات اللہ انصاری برا مان جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے آپ لوگ بولنے نہیں دینا چاہتے اور اسٹیج سے نیچے اتر آتے ہیں۔ نئی نسل کے زبیر رضوی، سجاد ظہیر پر تنقید کرتے ہیں۔ نوجوانوں کے مسائل بتاتے ہیں کہ انہیں اقتصادی طور پر کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ ڈگریاں اٹھائے نوکری کے لیے دربدر پھرتا ہے۔ نوکری نہیں ملتی، گھر کے اقتصادی حالات دیکھ کر وہ پریشان ہوتا ہے۔ مایوس بھی ہوتا ہے، یہی مایوسی اور تلخی ادب میں اظہار پاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کو ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا، اس لیے وہ قنوطیت کو زندگی سے فرار کہتے ہیں۔ مسئلہ کچھ پارٹی لائن کا بھی ہے۔

بحث دلچسپ ہے، بیچ میں چائے کا وقفہ ہوتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کہتی ہیں۔ میں آپ کو کچھ خط دوں گی۔ آپ کے پاکستان نے میرے دو بھائی چھین رکھے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ دو بھائی تو یہ کہتے ہوں گے کہ بھارت نے ہماری بہن چھین رکھی ہے۔ وہ پاکستان کے بارے میں پوچھ رہی ہیں اپنے جاننے والوں کے بارے میں۔ ایک بزرگ سوہن سنگھ جوشی ملتے ہیں۔ پرانے کامریڈ ہیں۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ ''آپ لاہور جائیں گے۔ میاں افتخار الدین ہمارے دوست تھے۔ ان کی بیگم تک ہمارا آداب پہنچا دیں۔'' کمال احمد صدیقی، شوکت صدیقی صاحب کو سلام پہنچا رہے ہیں۔ سب لوگ کتنے خلوص سے مل رہے ہیں۔ کتنے پیار سے مل رہے ہیں۔ یہ لوگوں کے جذبات کے عکاس ہیں لیکن جہاں سیاسی مصلحتیں درپیش ہوں وہاں ادب کی سچی آواز بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ 90 ہزار انسان۔ ہمسایہ ملک کے گوشت پوست کے انسان۔ ان کے کیمپوں میں بند ہیں۔ وطن سے دور، ماں، بہن، بیٹی، بیوی سے دور، بچوں سے دور۔ کیا یہ انسانی مسئلہ نہیں ہے کیا یہ شعری، افسانوی اور ادبی تجربہ نہیں بن سکتا۔ کیا یہ ایک المیہ نہیں ہے ادیب بھی اپنی آنکھوں پر سیاست کی عینک کیوں چڑھا لیتا ہے۔ ادیب اور شاعر کا دل تو بہت نرم ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سے قلم کاروں سے میں پوچھ بھی چکا ہوں، سوال بھی کر چکا ہوں لیکن جواب نفی میں ہی ملا ہے۔ یہ امر دونوں طرف مشترک ہے۔ کسی دوسرے ملک اور خاص طور پر دشمن ملک کے جائز موقف کے لیے بھی اپنی حکومت سے ٹکر لینا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس ان کا نام پڑھ رکھا ہے۔ آج انہیں بولتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہوں۔ ان کی تلوار بھی سجاد ظہیر کے خلاف اٹھ رہی ہے۔ خالص پروفیسروں والا لہجہ ہے۔ تمام اصطلاحات تاویلات استعمال کر کے سجاد ظہیر کو زیر کرنے کی فکر میں ہیں۔ یہیں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر سی آئی اے کے ایجنٹ کا لیبل لگا ہوا ہے۔ اس معاملے میں بھی ہماری ہندوستانیوں سے مماثلت ہے۔ ہم بھی سی آئی اے کی ایجنسی کا الزام کافی

جلدی اور کافی فراخدلی سے اکتاتے ہیں۔ ایک بزرگ شاعر نیاز حیدر صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس گرما گرمی میں وہ اپنی پوری نظم سنا جاتے ہیں۔

سہ پہر میں یہ مذاکرہ ختم ہوتا ہے۔ میں کچھ لوگوں کے ساتھ باہر چلا آتا ہوں۔ عمیق حنفی کے کے نیر، بلراج کومل، بلراج مینرا، زبیر رضوی، شاہد صدیق اور میں۔ بستی نظام الدین میں ایک سرراہ ہوٹل میں بیٹھ جاتے ہیں لنچ کے لیے۔ تازہ تازہ چپاتیاں آ رہی تھیں۔ جھونپڑی نما ہوٹل تھا۔ باہر کھلے میں بھی سڑک کے کنارے میزیں لگی ہیں۔ اندر بھی ہم باہر ہی بیٹھ گئے ہیں۔ یہ سب ہوٹل مسلمانوں کے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے معتقدین ادھر آتے ہیں تو وہ یہیں کھانا کھاتے ہیں۔ سامنے ایک مدرسہ ہے۔ درگاہ پر دن بھر عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

سُھد راجی کی فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف جدوجہد

ادب سے اب ہم سیدھے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف جدوجہد میں مصروف شریمتی سُھد راجی کے ایک جلسے میں جا رہے ہیں۔ یہ دلبھ بھائی پٹیل سے منسوب کوئی ہال ہے جس میں یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ ادھر جن سنگھ، راشٹریہ سیوک سنگھ کے خلاف سرگرم عمل تنظیم کا جلسہ ہے اور ادھر چند قدم پر کھلے میں جن سنگھ کے سابق سربراہ بلراج مدھوک کی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ میں ادھر فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف سرگرم تنظیم کے جلسے میں ہوں۔ گوئیل صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ مقررین کی تقریریں جاری ہیں کانگریس پر بھی تنقید ہو رہی ہے۔ حالانکہ سُھد راجی خود کانگریس کی رکن ہیں، پارلیمنٹ کی رکن بھی مسلمانوں پر مختلف علاقوں میں جو ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ ان کی جو رپورٹیں ملی ہیں اور بعض جگہ خود سُھد راجی نے جا کر حالات دیکھے ہیں۔ وہ اس کی ذمے داری جن سنگھ پر ڈال رہی ہیں اور ہندوؤں سے اپیل کر رہی ہیں کہ وہ تعصب کا شکار نہ ہوں۔ تعصب پھیلانے والے لوگ دراصل ہندوستان کے اتحاد کے مخالف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں سب مذہبوں کے لوگ مل جل کر امن اور آشتی سے رہ سکیں۔

سُھد راجی، بزرگ خاتون ہیں۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ انہیں ایک لگن ہے ایک فکر ہے، ایک مشن کے تحت اس میں مصروف ہیں۔ کانگریس کے بعض انتہا پسند بھی ان سے ناراض ہوتے ہیں جن سنگھ والے تو انہیں اپنا پکا مخالف سمجھتے ہی ہیں۔ وہ بتا رہی ہیں کہ ہم اکیلے ہی چلے تھے مگر اب تمام بڑے شہروں میں ہماری شاخیں ہیں، رضا کار ہیں۔ اب ہمیں امید ہو گئی ہے کہ ہم تعصب اور فرقہ اریت سے پاک معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حاضرین میں کافی مسلمان بھی بیٹھے ہیں۔ بیگم قدوائی بھی ہیں۔ بعض بیگمات کو شکایت ہے کہ وہ جب بعض شکایتیں لے کر وزراء کے پاس جاتی ہیں تو وہ اچھی طرح سے نہیں ملتے ہیں۔ بات نہیں سنتے ہیں۔

بعد میں سُھد راجی جوشی سے ملتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ آپ پاکستان جا کر لکھیے کہ ہم اپنے طور پر فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف کتنی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ ہمارے پرچے سیکولر ڈیموکریسی کے مشاورت بورڈ میں ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سروپ سنگھ، کرنل بی ایچ زیدی، ڈاکٹر ستیش چندر، بلراج ساہنی، عالم خوندیری، راجندر سنگھ بیدی، اے این وویالنکار، امرناتھ سہگل کے رامو ورن بھی شامل ہیں۔ آپ کے ہاں بھی اس سلسلے میں کام ہو رہا ہوگا۔''

میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو ایسے فسادات ہوتے ہی نہیں ہیں۔ وہ بھی تصدیق کرتی ہیں کہ انہوں نے بھی کوئی ایسی خبر نہیں سنی ہے۔

سُھد راجی کو بھی لاہور یاد آ رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج اور بہت سے لوگ۔

آج کا دن کافی طویل ہے۔ مصروفیت کافی رہی ہے۔ مجھے کچھ لوگوں سے آل انڈیا ریڈیو میں ملنا ہے۔ وہاں جاتا ہوں۔ آخری دو روز رہ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک فلم اور دیکھ لوں۔ خواجہ احمد عباس نے کوشش دیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ آج اسی کے لیے کوشش کر رہا ہوں کہ نیر کچھ کوشش کرتے ہیں۔ ان کے گھر کے قریب ایک سنیما ہے۔ وہاں نیر صاحب کی چلتی ہے۔ پھر سنیما منیجر سے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستانی مہمان ہیں، کل شاید چلے جائیں، اس لیے انتظام ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ منیجر صاحب جگہ نکال لیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک سنجیدہ اور خشک فلم کے لیے سامعین کا انتارش کیوں ہے۔ ہر سنیما میں ہاؤس فل ہے۔ بمبئی میں بھی ہاؤس فل تھے یہاں بھی ہاؤس فل ہیں۔ ممکن ہے فلم میں کوئی اچھے رقص ہوں۔ جبھی تو انتارش پڑ رہا ہے۔ سنجیو کمار اور جیا بہادری۔ ہیرو ہیروئن ہیں۔ سنجیو کمار کی یہ دوسری فلم دیکھ رہا ہوں۔ یہ رنگین فلم ہاتھ کے اشاروں سے شروع ہوتی ہے۔ ہیروئن بھی گونگی بہری ہے، ہیرو بھی گونگا بہرا ہے۔ دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ دونوں بولنا سننا نہیں جانتے اس لیے پبلک بلاوجہ کے گانوں سے محفوظ رہتی ہے۔ دونوں کی ملاقات اگرچہ اتفاقیہ ہی ہوتی ہے۔ فارمولا فلموں کی طرح مگر بعد میں فارمولا نہیں چلتا۔ ہیرو گونگے بہروں کے اسکول میں پڑھ لکھ کر اخبار بیچتا ہے اور پیٹ پالتا ہے۔ ہیروئن کی ماں سے بھی وہ کہتا ہے کہ ہیروئن کو لکھنے پڑھنے بھیجے۔ پڑھ لکھ کر دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے ڈرتے ہیں کہ کہیں گونگا بہرا نہ ہو لیکن ڈاکٹر بتاتا ہے کہ بالکل ٹھیک ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہیروئن کا بھائی اس شادی کے خلاف ہے اور ان کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ ایک رات چوری کرنے آتا ہے زیورات چراتا ہے۔ اس کا بچہ خوف زدہ ہو کر اٹھتا ہے۔ ہیرو ہیروئن بہرے ہونے کی وجہ سے بچے کی آواز نہیں سن پاتے۔ چور جو ہیروئن کا بھائی بھی ہے بچے کو بستر سے اٹھا کر نیچے فرش پر بٹھا دیتا ہے۔ بچے کا کھلونا لڑھک کر گھر کے باہر چلا جاتا ہے۔ بچہ رینگتا ہوا اس کے پاس جاتا ہے۔ باہر بڑی تیز بارش ہو رہی ہے۔ بچہ اس میں بھیگ بھیگ کر، رو رو کر جان دے دیتا ہے۔ والدین کو علم نہیں ہو پاتا۔ صبح ان کے گھر صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ چور سائیکل بھی لے جاتا ہے۔ سائیکل نہ ہونے کی وجہ سے نیوز ایجنٹ ہیرو کو اخبار نہیں دیتا۔ وہ مجبوراً بوٹ پالش شروع کر دیتا ہے۔ ایک فوجی اس کے رویے سے خوش ہو کر اسے اپنی بیرک میں لے جاتا ہے اور اس سے پوری کمپنی کے بوٹ پالش کرواتا ہے۔ اس طرح اسے کافی آمدنی ہوتی ہے۔ اسی اثناء میں دوسرا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اب وہ یہ انتظام کرتے ہیں کہ اپنے ایک اندھے دوست کو لے آتے ہیں۔ وہ دوسرے کمرے میں سوتا ہے اور ہیرو کے پاؤں سے ایک رسی باندھ لیتا ہے۔ جب رات کو بچہ روتا ہے۔ تو وہ اپنے کمرے میں پڑے پڑے رسی کھینچتا ہے۔ ہیرو کی آنکھ جاتی ہے اور وہ ہیروئن کو جگاتا ہے۔ جو بچے کو دودھ وغیرہ پلا کر چپ کرواتی ہے۔ ہیرو کو اسی اثناء میں ایک پریس میں نوکری مل جاتی ہے۔ یہاں وہ اپنی محنت ترقی کرتے کرتے منیجر بن جاتا ہے۔ پریس کا مالک اس کے لیے مختلف انتظامات کرتا ہے۔ اس کے سامنے میز پر بلب روشن ہوتے رہتے ہیں جس سے اسے لوگوں کے آنے جانے کا پتا لگتا رہتا ہے۔ ہیروئن اسی اثناء میں فوت ہو جاتی ہے۔ بچہ جوان ہوتا ہے۔ پریس مالک کی لڑکی بھی گونگی بہری ہے۔ مالک چاہتا ہے کہ ہیرو کے لڑکے سے اس کی شادی کر دے۔ وہ بات کے لیے گھر پر بلاتا ہے۔ ہیرو اپنی پوری بپتا یاد کر کے شادی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لڑکا انکار کر دیتا ہے اور گھر چلا آتا ہے۔ ہیرو اسے سمجھاتا ہے، لتاڑتا ہے، مارتا ہے پھر اندھا

دوست کسی لڑکے کو بچاتا ہے۔ لڑکا بالآخر شادی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے احساس دلایا جاتا ہے کہ اس کے ماں باپ دونوں گونگے بہرے تھے۔ انہوں نے کتنی محنت سے ترقی کی ہے۔ اب اسے بھی اسی آزمائش سے گزرنا چاہیے۔

فلم کے آخر میں یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

''اور کوشش اب بھی جاری ہے......''

کسی گانے اور ناچ کے بغیر یہ فلم اتنی اچھی اور دلچسپ ہے کہ تماشائی بالکل نہیں اکتاتے ہیں۔ ہر کلاس میں ہر شو میں اور ہر سینما میں رش لے رہی ہے۔

سنجیو اور جیا بہادری دونوں نے زبردست اداکاری کی ہے کیونکہ اس میں اداکاری صرف چہرے کے اتار چڑھاؤ تک ہی محدود ہے۔ مکالمات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے تو اصل اداکاری بھی یہی ہوتی ہے۔

آج میرا ارادہ ہے کہ پان امریکن سے کراچی کے لیے سیٹ لے لوں کیونکہ اب سب کام ہو چکے ہیں۔ کل صبح ایک پرواز جاتی ہے اس سے اب پاکستان چلوں۔

ہندوستان میں آخری دن

یہ دہلی میں آخری صبح بھی ہو سکتی ہے دہلی جسے میں نے صرف بچپن میں دیکھا تھا جامع مسجد کی سیڑھیوں کا ایک دھندلا سا نقش یادوں میں تھا۔ اب گزشتہ 19-20 روز سے دہلی کو دیکھ رہا ہوں۔ جی بھر کے دیکھا ہے لیکن کیسے وقت میں۔ جب یہاں غیروں کی حکمرانی ہے۔ دہلی کی عظمت، شان وشوکت میں جھانکنے کے لیے میں اکثر ماضی کے اوراق میں گم ہوا ہوں۔ تاریخ کے سمندر میں موجزن ہو کر اور جب میں خود تاریخ کا حصہ بن گیا ہوں۔ تو دلی کا شکوہ ہیبت اور شوکت مجھ پر اجاگر ہوئی ہے۔ یہ کھنڈر، یہ قدیم عمارتیں، دہلی کی تاریخ کے اوراق ہی تو ہیں۔ نئی عمارتیں، کتنی سطحی سی لگتی ہیں۔ ایسا ہے جیسے جلدی میں بنالی گئی ہیں اور عارضی ہی ہیں۔ مستقل عمارتیں جیسے پھر کبھی بنائیں گے۔ لودھی ہوٹل، سڑک عبور کرنے کے کچھ دیر بعد ویرانے انٹر کانٹی نینٹل، سب عارضی سا لگتا ہے۔ جیسے کسی عظیم شہر کے پاس کسی نے خیمے تان لیے ہوں۔

انٹر کانٹی نینٹل میں بھی کافی وسعتیں ہیں۔ فراخی ہے۔ نیچے پورا شاپنگ سینٹر ہی ہے۔ بڑے بڑے لاؤنج کراچی انٹر کانٹی نینٹل اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پان امریکن کا دفتر، ایک جرمن اپنی سیٹ بک کروا رہا ہے۔ دہلی سے امرتسر، امرتسر سے لاہور، لاہور سے پشاور۔ ہاں یہ اس روٹ سے جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق پاکستان یا بھارت دونوں میں سے کسی سے نہیں ہے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن ملکوں کی سرحد ہے ان سے تعلق رکھنے والے اس راستے کو استعمال نہیں کر سکتے۔ مجھے اجازت ہوتی تو میں بھی لاہور کے راستے سے ٹکٹ لیتا۔

''کراچی کے لیے کل کوئی سیٹ ہے۔''

پان امریکن کا سیلز مین چارٹ دیکھتا ہے اور اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ میں اپنا ٹکٹ بڑھا دیتا ہوں۔ وہ میرا پاسپورٹ دیکھتا ہے سیٹ اوکے کر دیتا ہے۔

میں کل سورج نکلنے سے پہلے دہلی چھوڑ دوں گا۔

کل کا سورج میں پاکستان کی سرزمین پر طلوع ہوتا دیکھوں گا۔ پاکستان جس سے میرا رابطہ گزشتہ 21 روز سے ٹوٹا ہوا ہے۔ گھر والوں کی کوئی اطلاع ہے نہ وطن والوں کی۔ کل میں پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ پاکستان...... جو میرا وطن ہے۔ میرا وطن ہے۔ میری زمین ہے۔ میری ماں ہے۔ جس نے مجھے تحفظ دیا ہے، سکون دیا ہے، عزت دی ہے۔ وطن بہرحال وطن ہوتا ہے جہاں ایک اپنائیت اور تحفظ کا احساس رہتا ہے۔ اب یہاں دہلی میں مجھے پانچ روز مزید رہنے کے لیے ویزا لینا پڑا ہے۔ یہ ویزا ابھی آج رات بارہ بجے ختم ہو رہا ہے اور مجھے دہلی ایئر پورٹ پر پانچ بجے صبح تک رہنا ہے۔ جے این بھٹ، مسٹر مدن سپرا کو ساتھ بھیجتے ہیں۔ سی آئی ڈی کے دفتر، وہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ اس کے لیے ویزے میں توسیع ضروری ہے۔ جو دہلی ایڈمنسٹریشن کرے گی۔ سی آئی ڈی والوں کے چہرے یہاں بھی ویسے ہی ہیں جیسے

اپنے ہاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی فائلیں، پرانی میزیں، الماریاں، پراسرار چہرے۔ یہاں زیادہ تر ہریانے والے سی آئی ڈی اور خفیہ پولیس میں ہیں۔ خالص رہتکی زبان سننے میں آتی ہے۔

اب میں وی آئی پی تو نہیں ہوں۔ اس لیے رکشے، ٹیکسی سب کا سہارا لے رہا ہوں۔ دہلی ایڈمنسٹریشن کے دفتر رکشے سے پہنچتے ہیں۔ ضروری کاغذات پر کرتے ہیں۔ بیٹھنے کو کرسی مل جاتی ہے۔ پھر وہی روایتی دفتریت شروع ہو جاتی ہے۔ آفس کے اس حصے کے انچارج بار بار کہتے ہیں بس ابھی ہو جاتا ہے۔ کلرک اسی طرح دیر لگا رہے ہیں۔ بیچ میں چائے پینے چلے گئے ہیں۔ اب کاغذات اندر آفیسر صاحب کے پاس پڑے ہیں۔ وہ ابھی فون پر بات کر رہے ہیں اس لیے دستخط دیر سے کریں گے۔ اسی اثناء میں ایک بنگلہ دیشی کا خاندان بھی آ گیا ہے۔ اسے اجمیر کے لیے ویزا چاہیے۔ اتنی جلدی بنگلہ دیش والوں کو بھی ہندوستان میں ویزے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اتنی جلدی اعتبار ختم ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش والے کو تین روز بعد کی تاریخ دی گئی ہے کہ آ کر اپنا پاسپورٹ اور کاغذات لے جائیں۔ انہیں صرف ایک رسید دے دی گی ہے۔ بنگالی بابو کہہ رہے ہیں کہ ہم اجمیر چلے جاتے ہیں۔ اسی رسید پر کاغذات آپ کے پاس رہیں۔ آفیسر انچارج انکار کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ویزا اور پاسپورٹ کے بغیر نہ جائیں۔ ورنہ ہم ذمے دار نہ ہوں گے۔ وہ صاحب چلے گئے ہیں تو یہ آفیسر انچارج مسٹر سپرا کو بتاتے ہیں کہ بنگلہ دیشیوں کی سیکورٹی کا بڑا مسئلہ ہے۔ اجمیر شریف اور مسلمان زائرین کے دوسرے مقامات پر یہ جانے کی ضد کرتے ہیں اور آگے مسلمان ان سے اچھی طرح پیش نہیں آتے۔ وہ مزید رازدارانہ انداز میں بتانے لگے کہ ہندوستان کے مسلمان بنگلہ دیشیوں کو اچھا نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ غدار ہیں۔ بنگلہ دیش والوں سے اتنے گہرے تعلقات کے باوجود اس بنگلہ دیشی کو تین روز بعد آنے کو کہا گیا ہے مگر مجھے تو آج ہی ویزا چاہیے۔ میں تو جا رہا ہوں۔ یہ خالص سرکاری دفتر ہے جہاں میرے سے میز جڑا ہوا ہے۔ فائلیں ہیں، الماریاں ہیں۔ عینکوں کے پیچھے سے جھانکتے کلرک ہیں۔ جو ویزا لینے آنے والوں سے کچھ حق الخدمت وصول کر کے اپنی معاشی ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ ورنہ زندگی کی پستیاں ان کا مقدر ہیں۔ کاغذات آ گئے ہیں۔ میں ایک روز اور دہلی میں ٹھہر سکتا ہوں۔ یہ ویزا چھ مارچ کے لیے ہے۔ کل بنگلہ دیش میں انتخابات ہونے ہیں۔ میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ آج پانچ مارچ ہے۔ میں تیرہ فروری کو دہلی میں آیا تھا۔ آج اکیسواں روز ہے۔ مجھے کچھ کتابیں مزید دیکھنا ہیں۔ کچھ تھوڑی بہت خریداری کرنا ہے۔ یہیں کا جو وغیرہ۔ لال قلعے کے سامنے، چاندنی چوک بازار، یہ چھوٹی چھوٹی گلیاں، پھر نہ جانے کب آنا ہو۔ یہ اوراق مصور۔ اب میر دیکھے، تو وہ بھی راستہ بھول جائے۔ آج میں ہر چیز کو رک رک کر غور سے دیکھ رہا ہوں کہ پھر کبھی آؤں، تو پہچان سکوں۔ یہ تنگ تنگ گلیاں، بازار، جہاں ریڑھیاں ہیں، مزدور ہیں، بوریاں ہیں، تانگے ہیں، آوازیں ہیں، دہلی ریلوے اسٹیشن 1947ء یاد آ رہا ہے۔ میں اس اسٹیشن پر بھی نہیں آیا ہوں۔ اب بھی نہیں جا رہا ہوں۔ جانے کتنے قافلے جا رہے ہیں اب بھی مسافر جا رہے ہیں مگر وہ کتنے مختلف مسافر تھے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن۔ تو نہ ہندو ہے نہ مسلمان تجھے تو یاد ہوگا کہ اس اسٹیشن پر تاریخ کے کتنے باب لکھے گئے ہیں۔ تجھے تو یاد ہوں گے وہ دن جب اسی شہر کے رہنے والے یہاں سے لٹے پٹے جا رہے تھے۔ ایک نئی مملکت کی طرف۔ ایک نئے وطن کی طرف میرے ساتھ بھارتی وزارت خارجہ کے مسٹر سپرا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے دہلی آئے تھے۔ انہوں نے بھی ڈیرہ اسماعیل خان اس حالت میں چھوڑا تھا۔ اکیلے، چھپتے چھپاتے، پہاڑوں سے، نالوں سے یہ عجیب دن تھے۔ یہ بھی عجیب دن ہیں۔ اب بنگلہ دیش میں تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز رُوداد
اگلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

بادبان

نعمان اسحاق

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،
جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(آخری حصہ)

صاعقہ نے دعا کو ہر طرح سے سمجھا بجھا کر دیکھ لیا۔ زندگی کی اونچ نیچ سے متعلق سمجھایا۔ زندگی ایک ہی شخص پر ختم نہیں ہو جاتی۔ مگر دعا بس خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔

تھک ہار کر صاعقہ دعا کے پاس سے اٹھ آئی۔ جاتے جاتے بیٹی کے گال پر بوسہ دیا تھا۔

''آج تو شادی ہے، کچھ عرصہ غم منائے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔'' صاعقہ خود کو تسلی دیتی اپنے کمرے میں آ گئیں۔

صاعقہ کے جانے کے بعد دعا اٹھی، نقاہت جیسے پورے جسم پر طاری تھی۔ دروازے کے پاس آ گئی دروازہ لاکڈ کرنے کے بعد دوبارہ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

''اسفر تمہیں مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔'' دعا روتی جاتی اور اسفر کو یاد کیے جاتی۔

کمرے میں حبس سی بھری ہوئی تھی۔ پسینے کی بوندیں پیشانی پر چمکتی تھیں۔ بالوں کی آوارہ لٹیں چہرے کے اطراف سے چپکی تھیں اور دعا روتی جاتی تھی۔ رونے سے دل ہی نہ بھرتا تھا۔ ایک آنسو پونچھتی تو دو اور آنکھوں میں امڈ آتے۔

روتے روتے جھکی اور بیڈ کی دراز کھولی۔ بیڈ کی اس دراز میں ایک البم پڑا تھا۔ کہنے کو تو وہ اس کے اسکول اور کالج کے زمانے کی یادوں کا البم تھا مگر اس میں اسفر کی کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں اسفر لڑکپن کی نوخیزی چہرے پر لیے۔ ڈھیلی ٹائی گلے میں لٹکائے۔ یونیفارم کی سفید شرٹ کے کف موڑے کتاب پر سر جھکائے بیزار سا بیٹھا تھا۔

دوسری تصویر میں آڈیٹوریم کی ایک سیڑھی پر بیٹھے، اوپر والی سیڑھی پر کہنی ٹکائے انہماک سے جواد کی کوئی بات سن رہا تھا۔ جواد شاید نصاب کا کوئی ٹاپک سمجھا رہا تھا۔

تیسری تصویر میں اسفر درمیان میں تھا۔ دعا اور سدرہ اس کے دائیں بائیں کھڑی تھیں۔ چوتھی تصویر میں، پانچویں تصویر میں، چھٹی تصویر میں۔۔۔۔ دعا نے روتے ہوئے البم بند کیا اور روتے ہوئے خود سے گویا ہوئی۔

''اسفر یہ تم کیا کر رہے ہو، آخر ایک بار تو میری حالت دیکھ لیتے۔ نہ روح جسم میں رکتی ہے اور نہ ہی نکلتی ہے۔''

روتے روتے دعا کی نظر سامنے کھڑکی پر گئی۔

ہتھیلی کی پشت سے گیلے رخساروں کو پونچھتے وہ اٹھی اور قدم بھرتی کھڑکی کے پاس آئی۔ قدم آدم کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر زندگی رواں دواں تھی جیسے نہ کچھ ہوا تھا اور نہ کچھ ہونے والا تھا۔

''جی کر میں نے کیا کرنا ہے، مجھے مر جانا چاہیے۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے دعا کہہ رہی تھی۔ ایڑیوں کو اٹھا اٹھا کر اس نے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ پانچویں منزل سے گرنے سے اس نے کہاں بچنا تھا۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ایک بار پھر پونچھتی وہ کھڑکی پر چڑھنے لگی۔ دوسرے لمحے وہ کھڑکی کے فریم پر ہاتھ جمائے قد آدم کھڑکی میں ایستادہ تھی۔ ہچکیاں لیتا دل جیسے سینہ چیر کر باھر آنے کو بے تاب تھا۔ ہاتھ کپکپاتے تھے۔ کھڑکی کا فریم لرزتا تھا۔

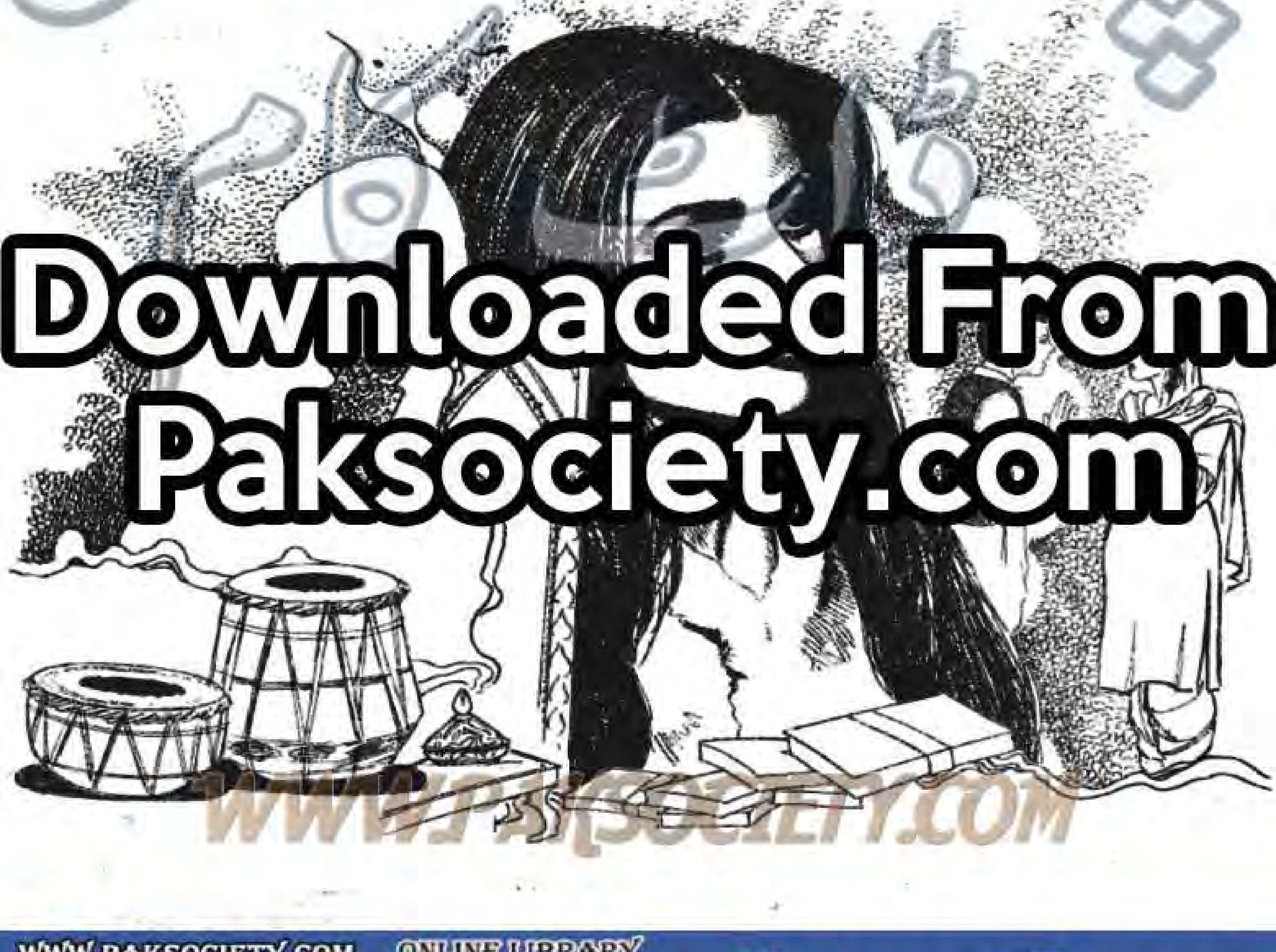
اس سے قبل وہ کودتی، بچپن سے اب تک پڑھی ہوئی تمام اسلامیات یاد آنے لگی اور رسول اکرم کی وہ حدیث بھی کہ جو خودکشی کرتا ہے۔ قیامت تک اس فعل کو دوھراتا رہتا ہے۔ جس فعل سے اس نے خودکشی کی ہوتی ہے۔ ضمیر کی ملامت کچھ ایسی شدید تھی کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی۔

''یا اللہ نہ جی سکتی ہوں، نہ مر سکتی ہوں، یہ کیسی آزمائش ہے۔'' کھڑکی سے اترنے کے لیے دعا مڑی تھی اس سے قبل کہ وہ اترتی۔ کھڑکی کا فریم اپنے چوکھٹے سے اتر گیا اور وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکی۔

پانچویں منزل سے نیچے گرتے ہوئے اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی تھی۔ جانے کتنی ہڈیاں چٹخی تھیں، سڑک پر گری دعا کے پاس ہی کھڑکی کا فریم پڑا تھا۔ بھل بھل نکلتا خون سڑک کو سرخ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سب کچھ تو ایک اسی کی منشا کے مطابق ہو رہا تھا۔



مگر جانے دل کیوں بے چین ہوا جا رہا تھا۔ بیزاری حد سے زیادہ تھی۔ کسی چیز میں دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ ذیشان جوش وخروش سے آیا اور اسٹیج پر اسفر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''دولہا بھائی آپ حد سے زیادہ ہینڈسم لگ رہے ہیں۔ اسی لیے سارے مہمان یک ٹک آپ کو دیکھے جا رہے ہیں۔'' ذیشان نے اسفر کے کان میں گھس کر کہا تھا۔ اسفر چہرے پر رسمی مسکراہٹ بھی نہ لا سکا۔

اس سے ملتی جلتی چند اور باتیں ذیشان نے کیں۔ بجائے خوشگوار تاثر پیدا ہونے کے، باتیں اسفر کو گراں گزریں۔ ذیشان اٹھا، تو بڑا فیضان آن بیٹھا۔ عمروں کے تفاوت کی وجہ سے فیضان اسفر سے شوخ باتیں تو نہ کر سکا مگر جو باتیں اس نے کیں وہ بھی اسفر کو ناگواری میں اضافہ کر گئیں۔

یہ بے چینی کس چیز کی تھی اور کیوں تھی؟ اسفر نے پہلو بدلا تھا۔

''اسفر تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اسفر کی بے چینی فیضان کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔

''ہوں'' اسفر نے بات گول مول کر دی۔

اچانک ذہن میں ایک نام کی تکرار ہونے لگی۔

''دعا، دعا، دعا، دعا'' اسفر نے نگاہیں نیچے مرکوز کیں۔ اسٹیج کے فرش کی سجاوٹ سرخ قالین تھے۔ کسی سستے ٹینٹ کی دکان کے سستے قالین۔

یہ تکرار کیوں ہو رہی تھی، کہیں اس سے فیصلہ کرنے میں غلطی تو نہیں ہو رہی تھی۔

''اسفر میں تم سے بے حساب محبت کرتی ہوں۔'' دعا نے روتے ہوئے اسفر سے کہا تھا۔ جب کہا تھا تب درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اب کیوں یاد آ رہا تھا۔ اسفر اضطراری طور پر اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ ذیشان ایک بار پھر اسٹیج پر چڑھا اور اسفر کے کاج میں اٹکے سرخ گلاب کی کلی کو درست کیا۔

''ابھی گر جاتی'' کلی کو کاج میں پھنساتے ہوئے ذیشان کہہ رہا تھا۔

نکاح خواں نے گلا کھنکارا۔ قران مجید کی تلاوت فرمائی۔

''بے شک انسان خسارے میں ہے'' سورہ عصر کی آیت پر اسفر کی سانس اٹکی تھی کہیں انا کے خول میں لپٹ کر وہ خسارے میں تو نہیں جا رہا۔

نکاح خواہ مسنون دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک اسفر کیسوا بھی نکاح خواہ کی حلاوت بھری آواز سے مسحور ہو رہے تھے۔ اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب نکاح خواہ پوچھ رہے تھے۔

''اسفر زوار سلمہ، آپ کو خولہ رمضان سلمہا سے بعوض چار تولے سونا اور پچاس ہزار روپے نقد سکہ رائج الوقت بطور حق مہر نکاح قبول ہے۔''

اسفر کا دل ایک عجب لے پر دھڑک رہا تھا۔ جب کافی دیر خاموشی چھائی رہی تو نکاح خواں نے الفاظ دہرائے تھے۔

''اسفر زوار سلمہ آپ کو خولہ رمضان سلمہا سے بعوض چار تولے سونا اور پچاس ہزار روپے نقد سکہ رائج الوقت بطور حق مہر نکاح قبول ہے۔''

شامیانے کی جھری سے راشدہ اسٹیج کو دیکھ رہی تھی اور اسفر کے منہ سے ''ہاں'' سننے کی منتظر تھی۔

اسفر نکاح خواں کا چہرہ یوں تک رہا تھا جیسے نکاح خواں کی زبان سے ادا کیے گئے لفظ اسفر کو سمجھ ہی نہیں آئے۔

اسفر ہاں کیوں نہیں کہہ رہا تھا۔ فیضان اور ذیشان دونوں کے چہروں پر بچی مسکراہٹ سمٹنے لگی تھی اور تشویش کے سائے چہرے پر پھیلنے لگے تھے۔

نکاح خواں کو بھی کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے الفاظ ایک بار پھر دہرائے تھے۔

''اسفر میں تم سے بے حساب محبت کرتی ہوں۔'' اسفر کے کانوں میں تو دعا کی سسکتی آواز گونج رہی تھی۔

''کیا آپ کو بعوض چار تولے سونا اور پچاس ہزار روپے نقد سکہ رائج الوقت۔۔۔'' نکاح خواں کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسفر کا فون بج اٹھا تھا۔ اصولاً تو اسفر کو فون بند کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن فون پر چمکتے الفاظ ''حنان بھائی کالنگ'' نے تو جیسے اس پر منتر پھونکا تھا اور سبز بٹن دباتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا تھا۔ دوسری طرف حنان روتے

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ہوئے بہہ رہا تھا۔

"اسفر دعا نے خودکشی کی کوشش کی ہے، ہم اسے ایمرجنسی لے جا رہے ہیں۔ آجاؤ اسفر یہاں تمہارا ہونا کس قدر ضروری ہے۔" حنان کی آواز لڑھک رہی تھی۔

فون اسفر کے ہاتھوں سے بے اختیار پھسل گیا تھا اور وہ بدحواس ہو کر اسٹیج سے اترنے لگا تھا۔ اس کی کیفیت اس ملاح کی جیسی تھی جس نے اپنی کشتی کا بادبان خود پھاڑا تھا اور بڑا خسارے کا کام کیا تھا۔

☆......☆......☆

ادھر رشتہ پکا ہوا تھا۔ ادھر راشدہ نے خولہ کے لیے برتن بھر بھر ابٹن منگوالیا تھا۔ باوجود اس کے خولہ بلاناغہ ابٹن کا لیپ چہرے پر کرتی مگر راشدہ پھر بھی یاددہانی اور تاکید کرنا نہ بھولتیں۔ نتیجتاً شادی کے دن تو جیسے اس کا چہرہ گل گلزار تھا۔ لہنگا شہر سے آیا تھا۔ سدرہ اور اسفر نے باہمی مشاورت سے پسند کیا تھا۔ گاؤں کی ہی ایک لڑکی جس نے شہر میں تعلیم کے سلسلے میں رہتے ہوئے بیوٹیشن کا کورس بھی کر لیا تھا، نے خولہ کا میک اپ کیا۔ سہیلیاں تو خولہ کے ہاتھوں پر مہندی کے نفیس اور دیدہ زیب ڈیزائن بنانا چاہتی تھیں۔ مگر خولہ نے انکار کر دیا۔ خولہ کی فرمائش کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پشت پر گول ٹکے بنائے گئے تھے انگلیوں کے پور بھی مہندی سے سرخ کیے گئے تھے۔ زیور بھی خوب تھا۔ ٹیکہ تو کچھ ایسا جچ رہا تھا کہ بے ساختہ چھونے کو دل کرتا۔

دلہن بن کر خولہ پر کچھ ایسا رنگ آیا تھا کہ جس نے بھی دیکھا بے ساختہ تعریف کی، بلائیں لیں۔

"میری خولہ جیسی بھی کسی کی قسمت ہوگی۔ لڑکا لاکھوں میں ایک ہے" بارات کے آنے سے پہلے تک راشدہ بیاہ میں شریک ہر خاص و عام عورت سے یہ بات کہہ رہی تھیں۔

"بارات آگئی، بارات آگئی" بچوں نے شور مچایا تو خولہ کی دھڑکن اتھل پتھل ہوئی چہرے گھٹنے پہ ٹکائے وہ سرخ چہرہ لیے مسکرائے جاتی، شرمائے جاتی۔ کیا وہ خوش قسمت نہیں تھی؟

بلاشبہ تھی مگر......

سدرہ اندر دلہن کے کمرے میں آئی۔ مسکراتے ہوئے خولہ سے چند باتیں کیں اور ہنستے مسکراتے باہر چلی گئی۔ بلاشبہ سدرہ ہنس بول رہی تھی۔ مگر جوش کچھ کم تھا جانے کیوں ایسے تھا؟ بہرحال......

راشدہ کمرے میں آئیں۔ دل تو چاہا خولہ کو چٹا چٹ چوم لیں۔ مگر میک اپ نہ خراب ہو، اسی لیے خواہش پر قابو پایا۔

"میری بیٹی اتنی خوبصورت ہے، میں تو جانتی ہی نہ تھی" راشدہ عام بات کرتے ہوئے بھی کھل کھلا کر ہنسیں۔

"زیادہ مت رونا، ٹشو سے آنکھیں صاف کرتی رہنا، میک اپ خراب نہ ہو جائے۔" راشدہ سرگوشی کرتے ہوئے تاکید کر رہی تھیں۔ نئے زمانے کے انداز واطوار سے وہ اس حد تک تو واقف ہی تھیں۔

خولہ بے ساختہ مسکرا دی۔ آج تو یاں بھی سہیلیوں سے مشورے دے رہی تھی۔ راشدہ باہر گئیں تھوڑی دیر بعد ایک سہیلی آئی اور باآواز گویا ہوئی۔

"مولوی صاحب مردانے میں نکاح پڑھ رہے ہیں۔" کمرے میں موجود خولہ کی نوعمر سہیلیاں شوخ سے انداز میں ہنستے ہوئے خولہ کو چھیڑ رہی تھیں۔ خولہ مسکراہٹ دبائے بیٹھی رہی دل کی دھڑکن تھوڑی اور تیز ہوئی۔

اس سے قبل کہ مولوی صاحب اس طرف آتے یا پھر کوئی اور شوخ خبر آتی ایک عجیب و غریب صورتحال پیش آگئی۔ یکدم باہر سے اونچی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان آوازوں میں غصہ تھا، رنج تھا، ناراضی تھی مگر خوشی نہ تھی۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ خولہ سر اٹھائے سراسیمہ سی سکھیوں کو دیکھنے لگی۔ کوئی باہر کی خبر اس تک بھی پہنچائے۔ آخر ہوا کیا ہے۔ تبھی ایک سہیلی باہر سے آئی۔ اس کا تنفس قدرے تیز تھا۔ چہرے کا رنگ فق تھا۔

لب کچلتے ہوئے اس نے جو کہا اس سے کمرے میں گونجتا دبا دبا شور سکوت میں بدل گیا۔

"دولہا نکاح کے بغیر چلا گیا۔" خولہ حیرانگی سے سہیلی

کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنے کانوں سے پر یقین نہ آیا۔

''نہیں سننے میں تو غلطی نہیں ہوئی'' خولہ دلہن بنی بغیر پلکیں جھپکائے سہیلی کو تکے جا رہی تھی۔

☆……☆……☆

پپوٹوں پر بوجھ سا دھرا تھا۔ بھاری ہوتے پپوٹوں نے حرکت کی اور منظر کچھ واضح ہونے لگا۔

ابھی سب کچھ دھندلا سا دکھتا تھا۔ کچھ دماغ بھی چیزوں کو معانی نہ پہنا رہا تھا۔ چیزیں واضح ہوتی گئیں اور اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے دعا کی نظر اسفر پر پڑی تو جیسے ساکت ہوگئیں۔ ایک درد کی لہر سی اٹھی اور روح میں سرایت کرگئی۔

''آہ'' دعا درد سے کراہی تھی۔ جسمانی چوٹیں درد کا باعث تھیں۔ ان جسمانی چوٹوں پر انسان بلاشرم کراہ تو سکتا ہے۔

''دعا حرکت مت کرو۔ تمہیں درد ہوگی۔'' اسفر آگے بڑھا تھا اور دعا کو پچکارنے لگا تھا۔ ''درد'' دعا بس اسی لفظ کو سوچ گئی۔ کیا اسفر کو اس کے درد سے سروکار تھا۔ آنکھوں میں پانی اترنے لگا تھا۔

نماز پڑھتی صاعقہ نے جب سلام پھیرا اور اس طرف متوجہ ہوئیں اور دعا کو کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تو خوشی وانبساط ان کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔

''یوں بھی کوئی کرتا ہے'' صاعقہ بیٹی کے بال سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے صاعقہ نے دعا کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

دائیں ٹانگ، بائیں کولہے کی ہڈی، دائیں کلائی اور بائیں کہنی، کتنی ہڈیاں ٹوٹی تھی۔ پھر بھی آرتھو پیڈک سرجن کہتا تھا۔

''شکر کریں، کھوپڑی نہیں ترخی اور ریڑھ کی ہڈی بھی محفوظ رہی ہے، خدانخواستہ وہ ترختیں تو……'' آرتھو پیڈک سرجن نے بات ادھوری چھوڑی تھی اور صاعقہ نے جھرجھری سی لی تھی۔

''یوں بھی کوئی اپنے والدین کا امتحان لیتا ہے'' باوجود کوشش کے آنکھیں خشک نہ ہوتی تھیں۔ آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کو ترک کرتے ہوئے صاعقہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی تھی۔ دعا ماں کو روتے ہوئے دیکھتی رہی، وہ صاعقہ کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ حادثاتا گرگئی تھی۔ خودکشی کی کوشش نہ کی تھی مگر وہ صاعقہ سے کچھ نہ کہہ پائی اور تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔

''میں نرس کو بتلا کر آتی ہوں کہ میری شہزادی ہوش میں آچکی ہے'' صاعقہ آنسو صاف کرتی باہر کو چل دی۔ باہر جاکر انھوں نے جان بوجھ کر معمول سے زیادہ دیر لگائی۔ بلاشبہ اس وقت تشویشناک صورتحال میں تھی۔ مگر اسفر سے تنہائی میں بات کرنا بھی تو ضروری تھا۔ صاعقہ کے جانے کے بعد اسفر چھوٹے چھوٹے قدم بھرتا آیا اور کرسی کھینچ کر دعا کے ساتھ بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کا بایاں ہاتھ سہلانے لگا۔ بایاں ہاتھ جو کلائی تک بینڈیج میں بندھا ہوا تھا۔

اسفر کے ہاتھ کا لمس دعا کے لیے تریاق کا کام کر رہا تھا۔

کیسا عجب لمس تھا۔

کیونکر اچھا لگتا تھا۔

گرم آنسو آنکھوں کے کونے سے نکلتے اور کن پٹی کی طرف بہتے تھے۔

چند لمحے اسفر دعا کو یوں آنکھیں موندے آنسو بہاتے دیکھتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر کن پٹی کی طرف بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔

''رونا بند کرو دعا، یہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں'' اسفر آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہتا تھا۔

دعا چپ چاپ آنکھیں بند کیے اس لمس کو محسوس کرتی رہی۔

''اب جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ، تم سے شادی بھی تو کرنی ہے۔'' اسفر نے ہاتھ پیچھے کھینچا تھا اور دعا نے گردن موڑ کر حیرانگی سے اسفر کو دیکھا تھا۔ آنکھوں میں حیرانگی کا ایک سمندر عیاں تھا۔

پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسفر اثبات میں سر ہلانے لگا اور کچھ وقفے سے گویا ہوا۔

''دعا میں تم سے محبت کرتا ہوں''

دعا یک ٹک اسفر کو دیکھے گئی۔ روح تک سرایت

کرب اور دکھوں میں غائب ہوا تھا۔

ہاں یہ اسفر ہی تھا جو محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔

پتھر موم میں بدل چکا تھا۔ دعا نے آنکھیں موندلیں۔ آنکھوں کے کونے پھر سے گیلے ہونے لگے تھے۔

☆......☆......☆

صبح ابھی سورج طلوع ہونے میں وقت تھا کہ چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے وہ اٹھی اور نماز کی تیاری کرنے لگی۔ گھر میں ایک انتہائی بوسیدہ جائے نماز تھی جو پچھلے کئی سالوں سے ٹرنک پر بچھی تھی اور لڑکیاں اس پر کپڑے استری کیا کرتیں۔ چند دن پہلے چنبیلی نے اس ٹرنک پر ایک اور بوسیدہ کپڑا ڈالا اور جائے نماز کو سرف سے دھویا اور پھر جب جائے نماز بچھانے کا وقت آیا تب چنبیلی شش و پنج میں مبتلا ہوگئی۔ گھر ترچھا تھا۔ سالوں پہلے نوید کے ساتھ بیوی بن کر رہنے والی عورت نماز پڑھا کرتی تھی۔ پتا نہیں کس کونے کی طرف جائے نماز بچھاتی۔ قبلہ رخ کس طرف تھا؟ یہ مسئلہ حل کرنے میں سیفی نے مدد کی۔ علاقے کی مسجد میں قبلہ رخ دیکھا اور اسی حساب سے گھر میں قبلے کا تعین کرلیا۔

وضو کرنے کے بعد چنبیلی نے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھائے۔ مگر حسب معمول یہ سمجھ نہ آیا کہ خدا سے کیا مانگے۔ خدا سے کبھی ایسا تعلق بنا ہی نہ تھا کہ اس سے کچھ مانگنے کی نوبت آتی۔

کافی دیر وہ بے مقصد جائے نماز پر بیٹھی رہی۔

ساتھ والی چارپائی پر چندہ بے سدھ سو رہی تھی۔ صبح کاذب کے وقت تو وہ گھر لوٹی تھی اب دوپہر سے پہلے اس نے نہ اٹھنا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھ کر چنبیلی پیسوں کا تعین کرنے لگی اور دل میں چھائی مایوسی سوا ہوگئی۔

کہنے کو تو وہ واپس لوٹ آئی تھی، مگر دل دوبارہ سے اس پیشے کو اپنانے پر آمادہ نہ ہوا تھا۔ اپنے صوم وصلوٰۃ کا پابند باپ یاد آتا تو دل ایک ان دیکھے بوجھ تلے دب جاتا اور سانس لینا دشوار لگتا۔ آنکھوں میں جھلمل جھلمل آنسو چمکنے لگتے۔

اس کا باپ نیک آدمی تھا۔ چہرے پر باریش داڑھی تھی۔ آنکھوں میں نیکوکاروں کی جھلک دکھتی تھی تو اب کیسے وہ مردوں کو لبھانے کا سامان کرسکتی تھی۔

کئی دن تو وہ کوئی فیصلہ ہی نہ کرپائی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ذہن میں ایک خیال اپنی جگہ بناتا گیا۔

کچھ پیسے اس نے چندہ سے ادھار لیے اور کچھ رانی سے۔ سیفی سے تھوک کی دکان سے کریانے کا کچھ سامان منگوایا۔ کچھ ٹافیوں اور بسکٹ کے پیکٹ بھی۔ کھلا سرف بھی، صابن کی ٹکیہ اور ماچس کے ڈبے بھی۔

پہلے تو سیفی لڑکیوں کے دور دراز کے کام کرنے سے پہلے خوب نخرے کرتا تھا اور اپنا کمیشن بھی لیتا تھا۔ مگر چنبیلی کے معاملے میں تو اب کچھ بھی پہلے جیسا نہ تھا۔ اسی لیے وہ چنبیلی کا کام پہلے کہنے پر کردیتا اور کوئی نہ کوئی ایسی بات بھی کہہ دیتا جس سے دلجوئی ہو۔

سامان منگوانے کے بعد چنبیلی نے وہ سامان ڈیوڑھی میں سجایا۔ بیرونی دروازے کے دونوں کواڑ وا کیے اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگی یوں اس نے اپنی چھوٹی سی کریانے کی دکان کی ابتداء کی۔ جس نے دیکھا انگشت بدنداں رہ گیا۔

''چنبیلی یہ کیا ہے؟'' رانی نے ڈیوڑھی میں ایک کپڑے پر بچھے سامان کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا تھا۔ چنبیلی شرمندہ ہوگئی۔ پتا نہیں اس میں شرمندگی والی کوئی بات تھی بھی کہ نہیں جب چنبیلی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ مگر رانی نے چنبیلی کی خاموشی سے جواب اخذ کرلیا اس لیے جھکی دوزانوں ہوکر چنبیلی کے ساتھ چادر کے ایک کونے پر بیٹھی اور چنبیلی کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

باہر گلی سے یہ منظر واضح تھا مگر راہ گیروں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ کھڑے ہوکر تماشا دیکھتے۔

''کیوں اپنی زندگی مشکل کرتی ہو'' رانی نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''مشکل'' چنبیلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور وہ دن تھا اور آج کا دن ڈیوڑھی میں سجی کریانے کی دکان قائم تھی۔ مگر آہستہ آہستہ سکڑ رہی تھی۔ دو ہزار کا خریدا سامان سکڑ کر آٹھ سو تک آن

پہنچا تھا۔ دن بھر کی اوسطاً بچت بیس روپے سے زیادہ نہ ہوتی اور بیس روپے سے وہ کیسے پورا دن گزارتی۔ سوچ سوچ کر ذہن شل ہو جاتا۔

جائے نماز تہہ کر کے اس نے ایک ٹرنک میں رکھی اور ڈیوڑھی میں اپنا کریانے کا سامان سجانے لگی۔ ناشتا بھی نہ کیا۔ پیٹ میں بھوک کا درد وقفے وقفے سے اٹھتا رہا مگر چنبیلی ڈھیٹ بنی برداشت کرتی رہی۔ رات کو بھی اس نے کھانے کے نام پر بسکٹ کھائے تھے۔ اب تو جیسے بھوک سے پیٹ میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔

آج دوپہر تک کوئی گاہک نہ آیا۔ چنبیلی بت بنی بیٹھی گزرتے راہ گیروں کو تکتی رہی۔ لوگ اسے اشارہ کرتے منہ ہی منہ میں ساتھ والے سے کچھ کہتے اور چلے جاتے اور چنبیلی ہر راہ گیر کو اس آس سے دیکھتی کہ شاید راہ گیر رک کر اس سے کوئی چیز خریدتا جائے مگر کوئی راہ گیر نہ رکا۔

ڈھلتی دوپہر میں چندہ آئی چہرے پر ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتی اس نے چادر پر بچھے سامان سے ماچس کے ڈبے میں سے ایک ڈبیہ نکالی اور چنبیلی کی طرف دو روپے کا سکہ بڑھایا۔

چنبیلی نے ایک نظر چندہ کے ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا کو دیکھا۔ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل گویا ہوئی۔

''چندہ ماچس تین روپے کی ہے۔'' نیند کے خمار آلود آنکھیں لمحے بھر میں خمار سے عاری ہوئی تھیں۔ خالی نظروں سے چندہ لمحہ بھر چنبیلی کو دیکھتی رہی پھر پلٹی۔ جب واپس آئی تو اس کی مٹھی میں پانچ روپے کا سکہ دبا تھا۔ پانچ روپے کا سکہ اس نے چنبیلی کی طرف بڑھایا تھا۔

''دو روپے میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔'' چنبیلی کی آواز جیسے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم پانچ روپے رکھ لو۔'' چندہ نے سادگی سے کہا تھا۔

''نہیں، تم مجھے وہ دو روپے والا سکہ ہی دے دو۔''

چندہ جھکی چادر پر پانچ کا سکہ رکھا اور واپس اندر کی طرف چلی گئی۔ اندر جاتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ چنبیلی آ گئی جو ہزار ہزار روپے والی شراب کی بوتل منگواتی تھی۔ مہنگا سگریٹ آدھا پی کر پھینک دیتی تھی۔ پیسے کو ہاتھ کی میل سمجھتی تھی اور آج وہ چنبیلی دو اور تین روپے کے حساب میں الجھی تھی۔

شام کو جب تمام لڑکیاں کام پر جانے کی غرض سے تیار ہو رہی تھیں۔ تب تک چنبیلی اپنی کریانے کی دکان پر بیٹھی تھی۔

روزی اور رانی چلی گئیں، سیفی کا نیا ہیجڑہ دوست آیا تو سیفی اس کے ساتھ چلا گیا۔ چندہ بھی بس نکلنے ہی والی تھی۔ آخری بار اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے کے بعد چندہ کمرے کی لائٹ بجھا کر باہر آئی۔

ڈیوڑھی میں چنبیلی چادر بچھائے سامان کی ڈھیری کے سامنے بیٹھی تھی۔ ٹک ٹک کرتی جوتی پہنے چندہ خاموشی سے نکل رہی تھی کہ اس کے دل میں اچانک بات آئی اور وہ پلٹی چنبیلی کے قریب پیروں کے بل بیٹھی۔

''چنبیلی ایسے کیسے چلے گا۔ تمہیں بھی ہمارے ساتھ کام پر جانا شروع کر دینا چاہیے۔''

چندہ کا لہجہ دھیما تھا۔ چنبیلی کا سر جھک گیا۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا اور وہ زار زار رونے لگی۔

''نہ، نہ میری بہن، چندہ دلاسہ دینے لگی۔ چنبیلی کا سر اپنے کندھے سے لگا کر بال سہلانے لگی۔

''انسان سے زیادہ بے بس اس دنیا میں کوئی اور نہیں۔ یہ تو زمانے کا دستور ہے اور دستور کے مطابق چلے بغیر چارہ نہیں۔'' چندہ تسلی دیتے ہوئے کہے جا رہی تھی اور چنبیلی کے آنسو تھمتے نہ تھے۔

☆......☆......☆

لیکچر ہال اتنا بڑا تھا کہ تین سو طلباء با آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ بنچوں کے پیچھے بیٹھے فائنل ایئر کے طلباء سرجری کے پروفیسر کا انتظار کر رہے تھے۔

لیکچر ہال کی وضع قدیم طرز کی تھی۔ اوپر کی سمت جاتے قدمچے تھے۔ ہر قدمچے پر چوبی بنچ نصب تھے۔ سامنے دیوار پر بلیک بورڈ تھا۔ بلیک بورڈ کے اوپر قدیم دیوار گیر گھڑی نصب بھی تھی۔ گھڑی اتنی

بڑی تھی کہ آخر میں بیٹھے طلباء بھی بآسانی وقت دیکھ سکتے۔ بلیک بورڈ کے آگے اسٹیج تھا۔ اسٹیج لگ بھگ سات فٹ اونچا تھا۔ اسٹیج پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ اسٹیج پر ہی ایک طرف ملٹی میڈیا نصب تھا۔

لیکچر ہال میں بیٹھے طلباء خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ادھر پروفیسر صاحبہ نے لیکچر ہال میں قدم رکھا اور ادھر بے ہنگم شور سکوت میں بدل گیا۔ ایسی خاموشی چھاگئی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جاسکتی۔

پروفیسر الطاف فاطمہ قریشی، اپنے نام کی طرح ان کی شخصیت میں رعب تھا۔ شہر کی جانی مانی سرجن تھیں۔ ان کی سرجری اس قدر فائن اور کلین ہوتی کہ بڑے بڑے سرجن ان کے گرویدہ تھے۔ ایک زمانہ ان کی تعریف کرتا تھا۔ شہر میں مرد سرجنز کی کمی نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود ایک خاتون سرجن مقبول تھیں اور بے شک وہ اس مقبولیت کی حق دار تھیں۔

پروفیسر الطاف فاطمہ نے ایک نظر ہال میں بیٹھے طلباء پر ڈالی۔ ایم بی بی ایس فائنل ایئر کے طلباء نصف سال بعد ان طلباء نے ڈاکٹرز ہونا تھا۔ ایک بھاری ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہونی تھی۔

پروفیسر الطاف فاطمہ اپنے لیکچر کا آغاز کرچکی تھیں۔ ان کا لیکچر اس قدر کامل اور جامع ہوتا کہ جونیئرز ڈاکٹرز بھی اٹینڈ کرنے آجاتے۔ فی الوقت ہال میں بیٹھے طلباء محویت سے پروفیسر صاحبہ کے منہ سے نکلا لفظ لفظ سن رہے تھے اور اہم نکات نوٹ کرتے جارہے تھے۔ فائنل ایئر کی اس کلاس میں جتنے بھی طلباء سرجن بننا چاہتے تھے بلامبالغہ نہیں تو نصف طلباء پروفیسر الطاف فاطمہ سے متاثر تھے۔

لیکچر نصف ہوچکا تھا، جب پروفیسر صاحبہ ایک وقفے کے بعد گویا ہوئیں۔

''اب اسٹوڈنٹس سے ایک سوال، یہ سوال فائنل ایئر اسٹوڈنٹس کے لیول کا تو نہیں مگر پھر بھی گزشتہ پچیس سالوں سے یہ سوال فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس سے پوچھ رہی ہوں۔ مگر آج تک کوئی اسٹوڈنٹ مجھے جواب نہیں دے پایا۔ آپ میں سے ہے کوئی جو جواب دے پائے۔'' کاغذ پر لفظ گھسیٹتے قلم رک گئے۔ طلباء کے دل عجب لے پر دھڑکنے لگے تھے اور وہ مزید متوجہ ہوکر پروفیسر صاحبہ کو سننے لگے۔

پروفیسر صاحبہ نے سوال دھرایا۔ یہ BILIARY SURGERY سے متعلق پیچیدہ نوعیت کا سوال تھا۔ جو کافی باریکی کا متقاضی تھا۔

''جی کوئی بھی، کوئی بھی اسٹوڈنٹ جو درست جواب دے پائے، کوئی بھی'' کلاس میں ایک ہل چل پیدا ہوئی تھی۔ سرگوشیوں میں تبادلہ خیال ہونے لگا تھا۔

''جی ہے کئی جو پروفیسر الطاف فاطمہ کو خوش کر پائے۔'' پروفیسر صاحبہ نے مسکراتے ہوئے سوال دوھرایا تھا۔

تبھی گلا کھنکھارتا جواد کھڑا ہوا تھا۔

''ویلکم مائی بوائے۔'' پروفیسر صاحبہ نے ہال میں بیٹھے سرونٹ کے ہاتھ مائیک جواد کی طرف بھیجا تھا۔

جواد نے جواب دیا۔ لڑکھڑاتا ہوا جواب۔

پروفیسر صاحبہ نے نفی میں سرہلایا۔

'' I APPRECIATE YOU کہ تم نے جواب دیا مگر تمہارا جواب بالکل غلط ہے۔ کوئی اور کوئی اور۔۔۔'' جواد پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

تبھی اظہار نے ہاتھ کھڑا کیا۔ اظہار کلاس کے ٹاپرز میں تھا۔ مگر میڈیسن اور الائیڈ اس کے پسندیدہ سبجیکٹ تھے۔ انھی میں اس کا دماغ چلتا تھا۔ سرجری کے سبجیکٹ میں وہ ڈھیلا تھا۔

''نہیں'' اظہار کے جواب پر بھی پروفیسر صاحبہ نے نفی میں سرہلایا۔

''کوئی اور، کوئی اور اسٹوڈنٹ جو جواب دے پائے ورنہ اگلے سال یہ سوال دوھراتے ہوئے کہوں

کہ پچیس سال سے یہ سوال پوچھ رہی ہوں مگر کوئی سٹوڈنٹ جواب نہیں دے پایا۔"

کلاس میں ہلچل سی ہو گئی۔

فوزیہ، فرخندہ، احمر، زید، خالد، مرتضیٰ، وقار، زوہیب، ثانیہ، عینی، صدف، عندلیب، رمیز، سالار۔۔۔۔ مائیک ایک سٹوڈنٹ سے دوسرے سٹوڈنٹ کو منتقل ہوتا رہا۔ سبھی نے اپنے تئیں جواب دیا۔ مگر کسی کا جواب ٹھیک نہ تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرے بچوں میں سے کوئی بھی درست جواب نہ دے پایا۔ اگلے سال پھر یہ سوال کروں گی۔ میرے دل میں اس سوال سے متعلق عجیب خواہش ہے کہ میرے ریٹائر ہونے سے پہلے کوئی طالب علم جواب دے پائے مگر تا حال کوئی جواب نہیں دے پایا۔ اب تو میری ریٹائرمنٹ میں محض چار سال رہتے ہیں دیکھو کوئی طالب علم جو جواب دے پائے تو بچو جواب یہ ہے کہ۔۔۔۔"

اس سے قبل کہ پروفیسر صاحبہ جواب دیتیں ایک کونے میں بیٹھی سدرہ نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"یس مائی چائلڈ" مائیک سدرہ تک پہنچایا گیا۔

سدرہ کھڑی ہوئی اور جواب دینے لگی۔ سدرہ نے جو جواب دیا وہ تھوڑا پیچیدہ تھا۔ جس چیز کی طرف سدرہ نشاندہی کر رہی تھی، بعید از قیاس ہی لگتا۔ ذہن مانتا ہی نہ تھا۔

"ادھر آؤ" سدرہ خاموش ہوئی تو پروفیسر صاحبہ نے اسے اسٹیج پر بلایا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سدرہ قدم اٹھاتی اسٹیج پر پہنچی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پروفیسر الطاف فاطمہ کے تاثرات سے ان کے دل کا حال جاننا مشکل تھا۔

"سدرہ زوار"

"ہم ہم۔۔۔" پروفیسر صاحبہ اثبات میں سر ہلانے لگیں اور اگلے لمحے ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

"بلاشبہ سدرہ نے صحیح جواب دیا ہے اور پچیس سال بعد کوئی سٹوڈنٹ آیا ہے جو درست جواب دے پایا ہے۔" مسکراتے ہوئے پروفیسر الطاف نے سدرہ کو باقاعدہ گلے لگایا۔ سدرہ اس عزت افزائی پر دنگ رہ گئی۔ مگر ابھی کچھ مزید تھا۔

گلے لگنے کے بعد پروفیسر صاحبہ اپنے گلے میں لٹکی چین کا ہک کھولنے لگیں۔ چین گلے سے اتارنے کے بعد پروفیسر صاحبہ وہ چین سدرہ کے گلے میں پہنا رہی تھیں۔

"سدرہ بے شک تم اس عزت افزائی کی حق دار ہو۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ تم مستقبل کی الطاف فاطمہ ہو۔" پروفیسر صاحبہ مسکرا رہی تھیں۔

ساری کلاس کھڑی ہوگئی اور بے اختیار تالیاں پیٹنے لگی۔ پروفیسر صاحبہ خود بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ سدرہ حق دق سب دیکھتی رہ گئی۔

بلاشبہ یہ سدرہ کی زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

☆......☆......☆

گھاس کے قطعے میں سایہ دار درخت کے نیچے آٹھ دس کے قریب لڑکے بیٹھے تھے۔ تمام کے تمام فائنل ایئر کے سٹوڈنٹ تھے۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے جواد کا موڈ سخت آف تھا۔ بجھے دل کے ساتھ موبائل پر وہ اپنی نئی منگیتر سبین کے میسج کا جواب دے رہا تھا۔ سبین کا نیا میسج آیا وہ شاید لمبی چیٹنگ کے موڈ میں تھی۔

"سبین میں تمہیں تھوڑی دیر تک کال کرتا ہوں۔" جلدی جلدی میسج ٹائپ کر کے جواد نے موبائل جینز کی جیب میں کھسیڑا اور بے دلی سے لڑکوں کی گفتگو سننے لگا۔ گفتگو کیا تھی۔ سدرہ نامہ تھا۔ لڑکے سدرہ کی لن ترانیوں اور ذہانت کا تذکرہ کرتے ہوئے تھکتے نہ تھے اور جواد بیزار سا بیٹھا سنے جا رہا تھا۔ دل میں دبا حسد سینے میں آگ لگائے ہوئے تھا۔

تبھی سدرہ دو تین اور فیلوز کے ساتھ پاس سے گزری سدرہ کے انداز میں ایک تمکنت تھی۔ لڑکے لمحے بھر میں خاموش ہو گئے اور ادھر وہ لڑکیاں نظروں سے اوجھل ہوئیں ادھر وہ دوبارہ سے بولنے لگے۔

''واقعی کوئی بات تو ہے اس لڑکی میں جو پروفیسر الطاف فاطمہ کہہ رہی ہیں کہ سدرہ مستقبل کی الطاف فاطمہ ہے۔'' اظہار کے لہجے میں رشک تھا۔ یہ بات کم وبیش چار دفعہ وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ جواد کو تاؤ ہی آ گیا۔

''یار اظہار رہنے دو، اتنا انسپائر ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ ایک ذہانت کا اچار ڈالنا ہے، بندے کا آگے پیچھے بھی درست ہونا چاہیے۔ پتا ہے تمھیں۔ اس کی ایک بہن PROSTITUTE ہے۔'' جواد کا لہجہ ترش تھا۔

لمحے بھر کے لیے کوئی بول ہی نہ پایا۔ لڑکے ٹکر ٹکر جواد کا منہ دیکھنے لگے۔ اس خاموشی کو اظہار نے توڑا تھا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے حسد سے مغلوب ہو کر جواد ایک لڑکی سے متعلق ایسا کہتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آئی۔ تمھاری اپنی بھی بہن ہے۔ سدرہ تمھاری سابقہ منگیتر ہے یہ بات تم اگر بھول بھی چکے ہو تو ہم نہیں بھولے۔ ایسا مزید کچھ مت کہنا کہ ہمارا تمھاری طرف سے دل مزید میلا ہو۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے اور تم غصے میں غلط سلط بول کر حدیں پار کر لیتے ہو۔ بہت بری بات ہے۔'' اظہار کے لہجے میں ملامت تھی۔

جواد کے چہرے کا رنگ لمحے بھر میں بدلا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ جواب دیتا۔ نظر اٹھا کر اس نے اردگرد بیٹھے باقی لڑکوں کو دیکھا۔ ہر لڑکا تاسف بھری نظروں سے جواد کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس کے دوست اس کی سچی بات پر اسے جھوٹا کہے جا رہے تھے۔ ملامت بھری نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ بےبسی کا احساس مزید گہرا ہوا تھا۔

''جواد اتنا مت گرا کرو۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔'' سالار سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جواد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر الفاظ ہی نہ مل پائے۔ یک ٹک وہ اپنے دوستوں کا چہرہ تکے گیا۔

بلاشبہ یہ اس کی زندگی کے برے دنوں میں سے ایک دن تھا۔

☆......☆......☆

ہنی مون کی فرمائش دعا نے کی اور جگہ کا انتخاب بھی اسی نے کیا۔

جھیل سیف الملوک۔

وادی ناران سے جھیل کا فاصلہ آٹھ کلومیٹر تھا۔ پر پیچ پہاڑوں کے درمیان ٹیڑھا میڑھا دشوار گزار راستہ۔ سیاحت کے رسیا لوگ تو یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرتے اور قدرت کے حسین نظاروں سے خوب لطف اندوز ہوتے لیکن چونکہ دعا کی دائیں ٹانگ میں لنگ آ گیا تھا اور سرجن نے بھی زیادہ مشقت اور زیادہ چلنے سے منع کیا تھا اسی لیے جیپ کرائے پر لی۔ خوشی دعا کے چہرے سے پھوٹی تھی۔ ہنستی آنکھوں کے ساتھ وہ ہر ہر منظر کو آنکھ میں قید کر رہی تھی۔ جیپ پہاڑی راستوں پر ہچکولے کھاتی رواں دواں تھی۔ تبھی اسفر نے غیر محسوس طریقے سے دعا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''دعا میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔''

دعا بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ آنکھوں میں پانی آ گیا۔

''ہنستی کیوں ہو؟'' اسفر نے خفگی سے دعا کو دیکھا تھا۔

''اتنی محبت کرتے تھے تو میرے پانچویں منزل سے گرنے کا انتظار کیوں کیا؟ پہلے ہامی بھر لیتے۔'' دعا نے اسفر کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ میں حرارے دوڑتے محسوس کیے تھے۔

''بس پاگل تھا۔'' اسفر خجل سا ہو کر بال سہلانے لگا۔

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں مسز اسفر ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں۔ جو چاہا بے شک پا لیا۔'' جیپ نے جھٹکا کھایا۔ دعا سیٹ سے اچھلی اسفر نے ہاتھ بڑھا کر دعا کو سہارا دیا۔

''تمھیں پتا ہے میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں۔'' دعا نے اپنا سر اسفر کے کندھے سے لگا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ دونوں میاں بیوی اترے۔ ڈرائیور نے ہدایت کی کہ تین گھنٹے تک واپس آ جائیں۔ اندھیرا پھیل جائے تو واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

پیالہ نما جھیل کے پانی کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ارد گرد پہاڑ تھے۔ سامنے برف سے ڈھکا گلیشئر۔ دعا مبہوت سی جھیل کے حسن کو دیکھے گئی۔

تبھی ایک ارغوانی رنگ کی تتلی پاس سے گزری اسفر نے پکڑنا چاہا مگر ناکام رہا۔

''اگر میں تتلی پکڑ لیتا تو تمہیں تحفے میں دیتا۔'' اسفر دور جاتی تتلی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

دعا مسکراتے ہوئے اسفر کو تکے گئی۔

''ہم اس پتھر پر بیٹھتے ہیں اور خوب ساری باتیں کرتے ہیں۔'' دعا نے دور پڑے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں میاں بیوی قدم بڑھاتے پتھر کی طرف بڑھنے لگے۔ دعا تھوڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ اسفر اسے سہارا دیتا تھا۔

''میں چاہتی ہوں تم آج بہت سارا بولو اور میں سنے جاؤں۔'' پتھر پر بیٹھ چکنے کے بعد دعا نے کہنی ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔

''بہت سارا بولوں۔۔۔'' اسفر نے زیر لب لفظ دوہرائے ہے۔ اور پھر خاموشی چھا گئی اسفر مدہم آواز میں گویا ہوا وہ تمام باتیں بتانے لگا جن کو سوچتے ہوئے اس نے زندگی گزاری تھی۔

''سدرہ میری جڑواں بہن تھی۔ مگر زندگی کے ہر میدان میں مجھ سے آگے رہتی مجھے احساس بھی نہ ہوا میں اس سے حسد کرنے لگا۔ میں نے ہر امتحان میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کی مگر کبھی کامیاب نہ ہوا۔ سدرہ کی کامیابیاں میری ناکامیاں اسے مجھ پر برتری ملنے لگی گھر میں بھی امی کا سکہ چلتا تھا۔۔۔۔''

اسفر ربط بے ربط دھیمی آواز میں کہتا گیا، کہتا گیا دعا چپ چاپ سنتی گئی۔ ایک ایک لفظ اندر اتارتی گئی۔ اسفر نے بھی سب کچھ بتایا۔ اپنے سدرہ کے متعلق جذبات، والد صاحب کی کم کم توجہ، چنبیلی کی آمد، پھر چنبیلی کا چلے جانا، اپنا ناول، دعا اور وہ خود وہ اور خود دھیرے دھیرے سب کچھ بتاتا گیا اور دعا سنتی گئی۔

اسفر جب خاموش ہوا تو ایک بار پھر خاموشی نے راج قائم کر لیا۔ اس خاموشی کے راج کو دعا کی نرم آواز نے توڑا۔

''ملاح کی غلطی سے بادبان پھٹ جائے تو ملاح کو کشتی کے ڈوبنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ کوئی ایسا سامان کرنا چاہیے جو بادبان کا نعم البدل ہو۔ کچھ ایسا جو بادبان کا کام کرے۔ کشتی کو ڈوبنے دے اور نہ بے سمت ہونے دے۔'' اسفر سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''زندگی میں کچھ باتیں تسلیم کر لی جائیں، تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ زندگی کو مشکل بنانے والے تو ہم خود ہیں۔'' دعا لمحے بھر کو رکی۔

''اپنی خامیوں کو تسلیم کر لینے سے انسان کا قد بڑا ہی ہوتا ہے اسفر۔'' دعا نے اپنا ہاتھ اسفر کے گھٹنے پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ دبانے لگے۔

اسفر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دعا کی آنکھوں میں محبت تھی۔

محبت۔

وہ شے جس کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔

جس کے بغیر زندگی ادھوری ہوتی ہے۔

اور اسفر کے پاس محبت تھی۔ زندگی کو مکمل کرنے والی محبت

''تم جیسے ہو تمہیں خدا نے بنایا، میں جیسی ہوں سدرہ جیسی ہے اسی خدا نے بنایا۔ سدرہ کی ذہانت میں اس کا کمال ہے نہ تمہاری خامیوں میں تمہارا ہاتھ ہے۔'' وہ بات جو اسفر ساری زندگی نہ سمجھ سکا۔ دعا نے محبت کے نرم جذبے کے زیر اثر لمحوں میں سمجھا دی۔

''اچھا تو ناول پھر سے کب لکھو گے؟ یہاں سے واپسی پر شروع کر دینا۔ مجھے تمہارا ناول پڑھنے کے لیے بے چینی لاحق ہے۔'' بے چینی دعا کے لہجے سے جھلکنے بھی لگی تھی۔

اسفر یک ٹک دعا کو دیکھے گیا دعا اس کے لیے

خدا کا انعام نہیں تھی؟ وہ انعام جس سے اس نے جتنا پہلو بچایا مگر وہ اسے دامن میں آہی گرا۔

''چنبیلی آپی کو ہم ڈھونڈ لائیں گے۔ وہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔'' اسفر اب بھی دعا کو تکے جاتا تھا۔

''اچھا اب اٹھو اس گلیشئر تک تو چلیں تین گھنٹے ختم ہونے میں ایک گھنٹہ ہی رہتا ہے جانے پھر کبھی آنا ہو نہ ہو۔'' دعا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسفر بیٹھا ہی رہ گیا۔

''اب اٹھو بھی کیا بت بن کر بیٹھ گئے ہو صبح سے یہ بھی نہیں پوچھا میں کچھ کھانا چاہتی ہوں کہ نہیں۔ اب تو نئی شادی ہے، تھوڑے لاڈ ہی اٹھا لو۔ چلو تم نے نہ پوچھا میں خود ہی بتا دیتی ہوں CARNETTO ڈبل چاکلیٹ کھانی ہے وہ جو دور سٹال ہے ادھر آئسکریم ہے یہاں آتے ہوئے میری نظر پڑی تھی تب سے من کیے جا رہا ہے۔'' دعا مسکرا رہی تھی۔ اسفر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ دوڑ کر گیا اور آئسکریم لے آیا۔

دونوں میاں بیوی آئس کریم کھاتے ہوئے گلیشئر کی طرف بڑھنے لگے۔

''اسفر تمہیں جھیل سیف الملوک سے متعلق وہ لوک داستان آتی ہے جو بے حد مشہور ہے؟'' آئسکریم کھاتے ہوئے دعا کو خیال آیا تھا۔

''ہوں'' اسفر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر سناؤ نا۔'' دعا نے فرمائش کی اور اسفر نے دعا کی فرمائش پوری کی۔

''ایک خوبصورت شہزادہ تھا جس کا نام شہزادہ سیف الملوک تھا۔ ایک رات خواب میں اس نے ایک حسین و جمیل پری کو دیکھا اس پری کا حسن اس قدر فسوں خیز تھا کہ شہزادہ اس پری کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور پری کی تلاش میں نکل پڑا راستے میں اسے کسی نے بتایا کہ اگر وہ جھیل پر بارہ سال ریاضت کرے تو پری جھیل کنارے آئے گی۔ چنانچہ شہزادے نے اس جھیل کے کنارے ریاضت کی اور بارہ سال بعد وہ حسین و جمیل پری نہانے کی غرض سے جھیل پر آئی۔ شہزادے کی چاہت کو دیکھتے ہوئے پری بھی شہزادے کی محبت میں مبتلا ہو گئی۔ مگر پری نے بتایا کہ اس پر ایک سفید دیو قابض ہے۔ دیو کو پتا چل گیا تو وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔۔۔'' اسفر کہانی سناتا رہا، دعا انہماک سے سنتی رہی اور وہ آگے بڑھتے رہے۔

☆......☆......☆

یہ ایک عام سی صبح ہی تھی۔ سب گھر والے صحن میں افقی سمت میں بچھی چارپائیوں پر سوئے تھے ادھر مؤذن نے اذان دی اور ادھر خولہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وضو کر کے نماز پڑھنے سے پہلے اس نے ماں کو اٹھایا۔ راشدہ کی بے خوابی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ رات کے آخری پہر ہی آنکھ لگتی تھی۔ ماں کے بعد اس نے بھائیوں کو اٹھایا مسلمان اٹھ گیا۔ نمازوں کا چور ذیشان نہ جاگا۔

نماز کے بعد قرآن مجید کی تلاوت بھی ان کے صبح کے معمول کا حصہ تھی۔ قرآن مجید پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر یونہی قرآن مجید گود میں لیے بیٹھی رہی پھر اٹھی اور قرآن مجید رحل میں رکھ آئی۔

باورچی خانے سے ٹماٹر کا ایک ٹکڑا لیے وہ مٹھو کے پنجرے کی طرف آئی۔ پنجرے کے قریب آ کر اس نے جو دیکھا تو ٹماٹر کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

بوڑھا مٹھو پنجرے کے فرش پر بے حس و حرکت مرا پڑا تھا۔

''مٹھو۔۔۔۔'' خولہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے پنجرہ کھولا تھا اور مٹھو کو باہر نکالا تھا۔ مٹھو سے اس کی محبت اٹوٹ تھی۔ بارہ سال سے وہ اسے پال رہی تھی۔

بند آنکھوں سے مٹھو اور بھی معصوم دکھتا۔ مٹھو کے ہاتھ میں لیے خولہ وہیں برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مٹھو کی موت غیر متوقع نہ تھی وہ پچھلے کئی ہفتوں سے بیمار تھا۔ نہ کچھ کھاتا نہ پیتا بس چپ چاپ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا تھا۔

راشدہ ... بیٹی تو ... [illegible]

قدموں سے چپکی ہوئی بیٹی نے پاس آئی۔

''اماں مٹھو'' خولہ کے آنسو نہ رکتے تھے۔ بیٹی کا سر سینے سے لگا کر راشدہ دلاسہ دینے لگی۔

''بس میری جان'' راشدہ نے خولہ کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے تھے اور نرمی سے اس کے ہاتھوں سے مٹھو کا مردہ وجود لیا تھا۔

سارا دن خولہ غمزدہ رہی۔ مٹھو کی شرارتیں یاد آتیں تو دل بھر آتا اور یہ اسی شام کی بات ہے کہ خولہ کے والد کے دوست تشریف لے آئے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد وہ پہلی بار تشریف لائے تھے۔

لڑکوں نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا۔ راشدہ بھی خیر و عافیت پوچھنے کی غرض سے بیٹھک میں آن بیٹھیں۔

''راشدہ بھابی شاہد حسن تو یوں اچانک ہی ہم سے روٹھ گیا۔ بچپن کا دوست تھا بھولتا ہی نہیں۔'' شوہر کے تذکرے پر راشدہ کا دل اداس ہو گیا۔

''یہ بات میں شاہد حسن سے کہنا چاہتا تھا مگر وقت نے اجازت نہ دی۔ آپ میری بھابی ہی نہیں بلکہ بہن بھی ہیں عرض یہ ہے کہ خولہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں میرے بیٹے نوجیب کے لیے وہ جو دبئی میں ملازم ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دونوں میاں بیوی باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔'' منیر احمد اجازت طلب نظروں سے راشدہ کو دیکھ رہے تھے اور راشدہ کا دل اس سے خدا کے حضور سجدے میں تھا۔

بے شک خدا کی اپنی مصلحتیں ہیں، گاؤں کی دوشیزہ کا نصیب لاہور کے کم گو لڑکے سے نہیں بلکہ دبئی کے ہینڈسم سے وابستہ تھا۔

☆☆☆

''موسم حسین تھا۔ بادل اٹھکیلیاں کرتے تھے ہوا بھی شرارت بھری تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ ایسی حسین شام زندگی میں پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی آئے گی ---'' اصغر نے ناول لکھنا شروع کیا تو پتا ہی نہ چلا، مہینے کے اندر اندر ناول مکمل کر لیا۔

صاف لکھائی میں لکھ کر اس نے ایک کاپی فوٹو اسٹیٹ کروالی کہ خدانخواستہ ناول گم ہو بھی جائے تو وہ پھر سے خالی ہاتھ نہ ہو۔ ناول کو اس نے مشہور میگزین بھیج دیا۔

پندرہ دن بعد ہی میگزین کے ایڈیٹر کا فون آ گیا۔

''تمہارا نام مستنصر سے ملتا جلتا ہے جب تمہارا ناول موصول ہوا مجھے یہی گمان گزرا کہ مستنصر حسین تارڑ نے ناول بھیجا ہے اور یہ مجھے اپنے اور اپنے میگزین کی خوش قسمتی ہی لگی مگر ذرا دھیان سے دیکھا تو مستنصر نہیں اصغر نام درج تھا۔ خوشی پر اوس تو پڑ گئی مگر بہرحال میں نے فارغ وقت میں ناول کا مطالعہ کیا تو حیران ہی رہ گیا۔ لڑکے تم نے کمال ہی کر دیا۔ لفظوں سے ایسی دلکشی پیدا کی ہے کہ دل عش عش کر اٹھا۔ مجھے تو ناول ایک ہی نشست میں ختم کرنا پڑا لیکن اپنے میگزین میں ہم تین اقساط میں شائع کریں گے۔ آخر میگزین کی ریٹنگ کا معاملہ بھی تو ہے اور لڑکے، تم لکھنے کی صلاحیت سے مالا مال ہو اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ تم اردو ادب کا مستقبل ہو۔'' اصغر بے یقینی سے کان لگائے کھڑا رہا۔ اسے لگا جیسے سارے جسم پر چیونٹیاں دوڑ رہی ہیں۔ مگر یہ چیونٹیاں نہیں تھیں یہ سنسناہٹ تھی جو خوشی بن کر جسم میں بجلی بھر رہی تھی۔

''تعریف کا شکریہ'' اصغر نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف شکریہ سے بات بننے والی نہیں میں تم سے معاہدہ کرنا چاہتا ہوں کہ تم آئندہ جو ناول بھی لکھو گے میرے ادارے کو ہی بھیجو گے۔ تمہاری اور میری انڈرسٹینڈنگ سے ہم دونوں کو فائدہ ہوگا اور میں معاوضہ بھی پوری مارکیٹ سے زیادہ دوں گا۔'' ایڈیٹر تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے تھے۔

اصغر کی پسینہ ہوتی ہتھیلیوں سے موبائل بار بار پھسلتا تھا۔

''آپ مجھے وقت بتا دیں جب آپ فارغ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہوں میں آپ سے مل لیتا ہوں۔''
اسفر کی آواز خوشی کے احساس سے بوجھل تھی۔
''برخوردار فراغت ہی فراغت ہے۔ تم آنے والے بنو۔ ہمارے دفتر کا ٹائم صبح دس سے شام سات بجے تک ہے۔ تم کس وقت آ سکتے ہو؟؟'' ایڈیٹر صاحب پوچھ رہے تھے اور اسفر کو احساس ہونے لگا کہ ایسی عزت اسے زندگی میں پہلے کبھی نہ ملی تھی۔

☆......☆......☆

وہی ساڑی تھی۔ جواب بوسیدہ ہو چکی تھی سرخ بلاؤز اور سنہری پلو۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے چنبیلی کو یاد آیا وہ ایک لمبے عرصے بعد خود کو آئینے میں دیکھ رہی ہے۔ آئینے اور اس کی تو جیسے دشمنی ہو چلی تھی۔

کپڑوں میں جیسے آگ لگی تھی اور یہ آگ اس کے جسم کو جلا رہی تھی۔ جانے کب تک اس نے جل کر راکھ ہونا تھا۔

چندہ کسی کام کے سلسلے میں کمرے میں آئی تھی۔ چنبیلی کو آئینے کے سامنے یوں ساکت کھڑے دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ کس جوار بھاٹے سے گزر رہی ہوگی۔

چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی چنبیلی کے مقابل آئی اور اسے کندھوں سے پکڑ کر مخاطب ہوئی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' کیسا عجب دلاسہ تھا سب کچھ غلط ہو رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

چندہ نے ساتھ پڑی پرفیوم کی سستی بوتل اٹھائی اور چنبیلی پر چھڑکنے لگی۔

''ایک بار پھر سے پیسوں میں کھیلنے لگے گی یوں ٹکے ٹکے کا حساب نہیں رکھنا پڑے گا۔''

چندہ اپنے تئیں قائل کر چکی تھی۔ چنبیلی خالی نظروں سے اسے تکے گئی۔

''تم بالکل اپنی ماں کی طرح دراز قد ہو رخسار بھی ایسے ہی متاثر کن قد کی مالک تھی مجھ سے ایک آدھ انچ قد بڑا ہی تھا۔'' کانوں میں باپ کی بھولی بسری آواز گونجی تھی تو آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ نم آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے وہ آنکھوں میں کاجل بھرنے لگی۔

''باپ کے علاوہ بہن بھائی بھی تو ہیں سگے نہ سہی سوتیلے تو ہیں۔ وہی لحاظ کر لیتے کاش آ جاتے تو آج پھر اس دلدل میں تو قدم نہ رکھنا پڑتا۔'' چنبیلی نے کڑواہٹ سے سوچا تھا۔ اس دنیا سے کڑوی بھی کوئی شے ہے۔

سر توڑ کوشش اور ثابت قدمی۔ دونوں سے کام لے کر دیکھ لیا مگر کریانے کی دکان بار آور نہ ہو سکی اتنے مہینے کی جدوجہد کے بعد جب سہیلیاں بھی ادھار پیسے دینے سے کترانے لگیں تو پھر واپس اسی کام کی طرف لوٹے بنا چارہ ہی نہ تھا۔

یکدم سگریٹ کی طلب ہونے لگی تھی۔ یوں تو وہ اب سگریٹ ترک کرنے جتنا کم کر چکی تھی مگر آج دل کچھ ایسا جلا ہوا تھا کہ دھواں اندر اتارنے کا دل کر رہا تھا۔ مگر پیسے نہ تھے۔

''چلو آج رات کی بات ہے صبح میرے پاس بھی پیسے ہوں گے۔'' تلخی سے مسکراتے ہوئے چنبیلی اپنا پلو درست کرنے لگی۔

تبھی دروازے پہ دستک ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ردا کی ہمراہی میں اسفر اور دعا اس کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

''آپی آپ یوں چلی آئی تھیں۔'' دعا گلے لگی تو الگ ہونے کا نام نہ لیا۔

''یوں چپ چاپ گھر چھوڑ کر آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔ پتا ہے کتنا ڈھونڈا۔ یہ تو شکر ہے ردا صاحبہ کا کہ آپ کی خیر و عافیت جاننے کے لیے گھر آئیں اور یہاں پہنچنے کا کوئی وسیلہ بنا۔'' اسفر مسکراتی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

''مانا کہ آپ سے عمر میں چھ سات سال چھوٹا ہوں گا مگر آپ کا بھائی ہوں۔ آئندہ آپ نے کوئی ایسا ویسا کام کیا تو قسم سے بڑی سختی سے پیش آؤں گا۔'' اسفر کے لہجے میں مصنوعی رعب تھا۔

اسفر، دعا اور ردا بات سے بات کیے جا رہے تھے اور چنبیلی یک ٹک ان کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

☆☆☆ختم شد☆☆☆

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

آخری فیصلہ



جاوید راہی

جب زخم زخم زندگی اصلی نقلی کی پہچان کھو دے تو آخری فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہتا

جاوید راہی کے قلم سے ایک اور نشتر

میں نے کبھی ان نو دولتیے باپ کی اترانے والی بیٹیوں کی پیروی نہیں کی تھی۔ جو ہنس کی چال چلتے ہوئے اپنی چال بھی بھول جاتی ہیں۔ کل تک نورن، طہورن نظر آنے والی صاحبزادیاں، تراشیدہ بال، دوپٹے سے محروم چست لباس بلیک شرٹ اور جینز میں ملبوس ٹیڑھی زبان میں اردو بولتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

ایک شاندار بنگلے میں رہنے کے باوجود خدا کے فضل سے ہمارے گھر میں یہ سب نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس گھر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ ایک ماں ہی گھر کی صحیح تصویر بناتی ہے اور اس کے گوشے گوشے سے اس کی فراست اور سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔ باپ کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ باہر کی دنیا کو چوکس رکھے۔

تو ابو امی کے انتقال کے باوجود اپنی ذمہ داریوں سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ بلکہ انہوں نے مزید وہ فرائض جو ماں کی ذمہ داری ہوتے ہیں بھی سنبھال لئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دوسری شادی کیلئے مجبور کیا مگر وہ ہنس کر ٹال گئے۔ البتہ انہوں نے میری پرورش کیلئے ایک خاتون کی ضرورت محسوس کر کے زاہدہ پھوپھی کو ضرور بلوا لیا تھا جو بیوہ تھیں اور جنہوں نے آ کر گھر کے نظام کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔

ابو مکمل طور پر سیلف میڈ تھے انہوں نے ایک نیم سرکاری ادارے کے معمولی سے ٹھیکہ دار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا لیکن اب ایک بڑی اور قابل اعتماد کنسٹرکشن کمپنی کے مالک تھے۔ دیندار، نماز روزہ کے پابند، لین دین میں بہترین مشہور، یہ ان کی خوبیاں تھیں اس طرح پھوپھی جان بھی ابو کے مزاج کی تھیں ابو سے بڑی تھیں اور بڑی کند مزاج تھیں۔ ابو کو بچوں کی طرح سمجھتی تھیں اور کسی بھی ناپسندیدہ بات پر انہیں ڈانٹ بھی دیا کرتی تھیں اور اس ڈانٹ ڈپٹ کا ابو گویا انتظار کرتے تھے جیسے اس سے دل کی کسی حس کو تسکین ملتی تھی۔

میرے مسئلے میں بھی پھوپھی نے جو اصول تراشے تھے انہیں ابو کی مکمل تائید حاصل تھی۔ اسکول پھر کالج برقعہ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی



بس گاؤن پہننا ضروری تھا۔ ہلکا پھلکا میک اپ بھی کیا جاسکتا تھا۔ لباس ایسا کہ بدن پوشی کرے نہ کہ بدن کو نمایاں کردے۔

میں نے کبھی ان سے اختلاف نہیں کیا تھا ہاں پہلا دھچکا اس وقت لگا جب بی اے مکمل کرنے کے بعد کہا گیا نہیں بس کافی ہے نوکری تو کرنی نہیں ہے اب گھر داری پر توجہ دینی ہے۔

بھلا کس کی مجال تھی کہ ان کی بات کی تردید کر دے میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ سہیلیوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ سب سے پیاری دوست رافعہ تھی اسے میرے گھر کے لوگ بھی پسند کرتے تھے۔ میرا زیادہ تر اس کا ساتھ رہتا تھا بازار وغیرہ بھی اس کے ساتھ نکل جاتی تھی۔ پھر میری ایک اور سہیلی ماریہ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ ہم لوگ یعنی میں اور رافعہ بھی تیاری میں مصروف ہوگئے۔

''رافعہ میں ماریہ کو سونے کا زیور دینا چاہتی ہوں۔''

''ضرور دو ماشاءاللہ تم تو دے سکتی ہو۔'' رافعہ نے خلوص سے کہا۔

''مطلب؟''

''سونا تو آجکل والدین بھی جہیز میں نہیں دے سکتے۔ بات نقلی جیولری پر چل رہی ہے۔''

''کوئی ہلکی پھلکی چیز لے لیں گے۔ لاکٹ سیٹ انگوٹھی کیساتھ۔''

''بالکل ٹھیک۔''

رافعہ کے بغیر لاکٹ خریدا ہی نہیں جا سکتا۔ ہم جیولری مارکیٹ چل پڑے یہاں ہمیشہ بہت رش ہوتا ہے' آس پاس پارکنگ نہیں ملی تو ڈرائیور نے میری اجازت سے کافی دور کار پارک کی اور یہاں سے میں اور رافعہ پیدل چل پڑے۔ میرے پرس

میں اس وقت بہت بڑی رقم تھی جو میں نے ابو سے لی تھی۔ میں بڑے اطمینان سے پرس جھلاتی ہوئی اِدھر اُدھر دوکانوں میں دیکھتی جا رہی تھی کہ کسی نے اچانک میرے پرس پر جھپٹا مارا اور پرس آسانی سے میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ ساتھ ہی میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔

میں نے پرس چھیننے والے کو دیکھا۔ سکوٹر پر سوار تھا ہیلمٹ پہنے ہوئے تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ نہیں نظر آ رہا تھا۔ پوری پلاننگ سے اس نے یقیناً کام کیا تھا' پرس لیکر وہ رش میں نکلتا ہوا کافی دور گیا اور پھر ایک گلی میں مڑ گیا۔ میرے منہ سے تو خوف کی وجہ سے آواز ہی نہیں نکل سکی لیکن رافعہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔

''چور، چور، ڈاکو۔ پکڑو۔ وہ ہمارا پرس چھین کر بھاگ گیا۔ پکڑو۔''

قریب کے فٹ پاتھ پر ایک نوجوان تھا جو اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا اس نے رافعہ کی چیخیں سنیں اور چونک کر اِدھر دیکھنے لگا۔

رافعہ چیخنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے اشارہ بھی کر رہی تھی۔ نوجوان کی بائیک اسٹارٹ ہو چکی تھی اس نے بڑے طوفانی انداز میں اسے آگے بڑھایا اور رافعہ کے اشارے کی طرف دوڑ پڑا۔ ہمارے آس پاس بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ رافعہ انہیں اس کی لٹیرے کے بارے میں بتانے لگی۔ لوگ اس بارے میں باتیں کرنے لگے۔

ہماری نظریں بار بار اس گلی کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں وہ شیر دل اس لٹیرے کے پیچھے گیا تھا۔ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا تھا ہم نے گھر والوں کی اجازت سے پورا پروگرام بنایا تھا۔ پہلے جیولری خریدنی تھی۔ اس کے بعد چھ بجے ایک فلم دیکھنی تھی اس کی ریزرویشن کرائی گئی تھی اس کے بعد ایک مشہور تکہ کڑاہی ریسٹورنٹ سے کڑاہی گوشت کھانا تھا۔ اس دوران ڈرائیور کی ڈیوٹی تھی کہ وہ ہمیں سینما ہاؤس چھوڑ کر گھر چلا جائے پھر شو کے خاتمہ کے قریب آ جائے بعد میں ہمیں کھانا وغیرہ کھانا تھا لیکن پرس کے ساتھ شو کے ٹکٹ بھی چلے گئے تھے۔

''بی بی! اب وہ کہاں ہاتھ آئے گا؟ صبر کر لو۔'' کسی بزرگ نے کہا۔

''ہاں۔ ایسے لوگ اپنے فن کے پکے ہوتے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔

''ٹھیک ہے رافعہ آؤ چلیں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''دو تین منٹ اور رک جاؤ۔ شائد ارے وہ دیکھو وہ واپس آ رہا ہے۔'' اچانک ہی رافعہ نے کہا اور میں چونک کر اُدھر دیکھنے لگی۔

''وہی ہے۔ تم نے پہچان لیا۔'' میں بولی۔

''اس کے ہاتھ میں تمہارا پرس لٹک رہا ہے۔'' رافعہ کے لہجے میں خوشی کی لہر تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دھڑکتے دل سے اس نوجوان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی جو رانگ سائیڈ سے آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ نوجوان قریب آ گیا اس نے پرس آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو۔ آپ کا پرس' پلیز اسے چیک کر لیجئے۔''

''میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ تو ٹھیک ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ خدا کا شکر ہے اس کو خود ہی عقل آ گئی۔ خود ہی پرس پھینک کر بھاگ گیا ورنہ میں اس کا جو حال کرتا وہ زندگی بھر یاد رکھتا۔ آپ براہِ کرم پرس چیک کر لیں تا کہ میں جاؤں۔''

میں نے پرس کھول کر دیکھا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ رافعہ اس دوران میٹھی نظروں سے نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔''

''او کے۔'' نوجوان نے موٹر بائیک گھمانے کی کوشش کی تو رافعہ جلدی سے بولی۔

''کم از کم آپ اپنا نام تو بتا دیجئے۔ میرا مطلب ہے۔ میرا نام رافعہ حیدر ہے اور یہ میری دوست ونیزہ ہیں۔ ہم لوگ اپنی ایک دوست کی شادی کی شاپنگ کرنے نکلے تھے۔''

نوجوان نے عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا اور بائیک موڑ دی۔ مجھے رافعہ کی یہ بات بری لگی تھی مگر میں خاموش رہی۔ رافعہ اسے دور جاتے دیکھ رہی تھی پھر اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''مغرور کہیں کا۔''

''نہیں رافعہ' مغرور نہیں۔ اعلیٰ ظرف اور بلند کردار۔''

''پھر بھی۔ دو باتیں کر لینے میں اس کی کوئی شان گھٹ جاتی۔'' رافعہ نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر ہم احتیاط سے مارکیٹ میں داخل ہو گئے۔ اپنی پسند کی خریداری کی۔ سارا پروگرام چوپٹ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ خریداری کے بعد ہم سینما ہاؤس پہنچ گئے لیکن یہاں ایک اور مصیبت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ پتا چلا ہمارے ٹکٹ کینسل کر دیئے گئے ہیں اور ہماری سیٹیں کسی اور کو دے دی گئی ہیں۔

میرا پارہ چڑھ گیا۔ ہم دونوں منیجر کے پاس پہنچ گئیں۔ رافعہ مجھ سے زیادہ تیز تھی اس نے خوب لے دے کی اور کہا کہ ہم نے کوئی ٹکٹ کینسل نہیں کرائے۔ منیجر نے کہا کہ اس نے خود فون ریسیو کیا تھا اور ٹکٹ کینسل کئے تھے۔ اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا تھا۔ ہم مایوس ہو کر باہر نکل آئے۔ پروگرام کے مطابق ڈرائیور کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔

''اب کیا کریں؟''

''ٹیکسی کر کے گھر چلیں اور کیا کریں۔''

''یار۔ یہ تو غلط ہوا۔''

''مگر یہ کیا کس نے؟''

''اللہ جانے۔''

''کسی کی شرارت بھی نہیں ہو سکتی۔ پتا چل جائے کہ ایسا کس نے کیا ہے پھر دیکھو۔'' رافعہ نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ہم ٹیکسی کیلئے نظریں دوڑانے لگے۔

''یار بڑی ہمدہ پکچر ہے۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ اب دیکھو مجھے ٹی وی پر فلم دیکھنا زہر لگتا ہے۔ بالکل مزا نہیں آتا۔ میں کبھی ٹی وی پر فلم نہیں دیکھتی۔'' رافعہ واویلا کر رہی تھی کہ اس وقت پیچھے سے آواز آئی۔

''ایکسکیوزمی''

ہمیں ہی مخاطب کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو سادہ لباس میں ملبوس ایک سادہ سے چہرے والی نوجوان لڑکی تھی جو ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''جی۔'' میں نے کہا۔

''معافی چاہتی ہوں۔ آپ دونوں جو باتیں کر رہی تھیں وہ میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں کیا آپ کو ٹکٹ نہیں ملے۔''

''ٹکٹ مل گئے کسی نے ایکنویئی کر ڈالی۔''

''کیسی ایکنویئی؟'' وہ بولی اور رافعہ نے اس کو پوری کہانی سنا دی۔

''کمال ہے۔ لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ میرے پاس دو ٹکٹس ایکسٹرا ہیں۔ میری دو سہیلیوں کو آنا تھا۔ ابھی کال آئی ہے کہ نہیں آسکتیں۔ میرے پاس تین ٹکٹ ہیں دل چاہ رہا تھا کہ پھاڑ کر پھینک دوں آپ لوگ پسند کریں تو۔''

''ارے ہاں ہاں۔ آپ وہ ٹکٹ ہمیں دیدیں۔''

''آیئے۔ مجھے ان دونوں کے نہ آنے کا بہت دکھ تھا۔ کم از کم آپ کی کمپنی مل جائے گی۔ آپ میرے ساتھ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گی۔''

''بالکل نہیں۔'' رافعہ نے کہا۔ مجھ سے زیادہ رافعہ بولتی تھی۔ ہم اس کے ساتھ واپس آ گئے۔ تعارف ہوا اس کا نام عمارہ تھا۔ بڑی اچھی لڑکی تھی ایک بینک میں نوکری کرتی تھی۔ اپنی بیوہ ماں اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ایک درمیانی آبادی میں رہتی تھی۔ اس نے کوشش کے باوجود ہم سے ٹکٹوں کے پیسے نہیں لئے تھے۔

ابھی فلم شروع نہیں ہوئی تھی۔ اچانک رافعہ نے میرا شانہ ہلایا۔

''وہ دیکھو وہ۔'' وہ گردن سے بائیں جانب اشارہ کر رہی تھی۔

''کون۔ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ارے وہ اگلی سیٹ پر۔'' رافعہ نے کہا اور میں

نے ادھر دیکھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے ہمارا پرس اس جیب کترے سے چھین کر ہمیں دیا تھا۔

''عجیب اتفاق ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا اس وقت روشنیاں بجھنے لگیں اور پھر قومی ترانہ شروع ہوگیا۔ پھر ہم فلم دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ اس نوجوان کا فلم دیکھنا کوئی اہم بات نہیں تھی۔ شو ختم ہوگیا اور ہم باہر نکل آئے۔ عمارہ کے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ میرے ڈرائیور نے مجھے سیل پر کال کر کے بتایا کہ وہ آچکا ہے۔

''تم گھر جاؤ گی عمارہ۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہیں گاڑی میں چھوڑ دوں گی۔'' میں نے کہا اور وہ تیار ہوگئی۔ وہ کافی دور دراز علاقے میں رہتی تھی۔ راستہ لمبا اور سنسان تھا۔ کئی راستوں سے گزر کر ہماری کار ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جو زیادہ چوڑی نہیں تھی اور اس سے دو گاڑیاں احتیاط سے گزاری جاسکتی تھیں۔ اس سڑک پر ایک ٹیکسی اس طرح کھڑی تھی کہ راستہ رُک گیا تھا۔

ڈرائیور نے کار کی رفتار سست کر کے ہارن بجانا شروع کر دیا لیکن دوسری طرف سے کوئی تحریک نہ ہوئی۔ پتا نہیں کون بے وقوف ہے۔ ڈرائیور نے کار روکی اور نیچے اُتر گیا۔ اس نے زور سے آواز بھی لگائی تھی۔

''کون ہے بھائی۔ راستہ تو دو۔''

لیکن خاموشی چھائی رہی۔ ہم لوگ پریشان نظروں سے اِدھر دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے قریب جا کر ٹیکسی میں جھانکا لیکن اس وقت اس کی چیخ سنائی دی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

اس وقت ٹیکسی کے دوسری طرف سے کئی سائے باہر نکل آئے ان کے ہاتھوں میں ہاکی اسٹکس تھیں۔ میں نے انہیں کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ڈرائیور بے چارہ تو پہلے ہی ڈھیر ہو چکا تھا۔ ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے کوئی بہت بڑی بات ہونے والی تھی۔

وہ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ خوف کے مارے ہمارا بُرا حال تھا۔ کار کے پاس آکر ان میں سے ایک نے کار کا دروازہ کھولا۔ اس طرف میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے بازو پر آہنی گرفت کی اور مجھے باہر کھینچ لیا۔

میرے منہ سے چیخ بھی نہیں نکلی تھی۔ انہوں نے تو عمارہ کو نہ ہی رافعہ کو کچھ کہا بس مجھے ٹیکسی کی طرف گھسیٹنے لگے۔ میں بے جان ہو رہی تھی۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا کہ اچانک روشنی کی ایک کرن چمکی۔

یہ تصویر کی روشنی نہیں تھی بلکہ کسی موٹر بائیک کی ہیڈ لائٹ تھی۔ جو سیدھی ہم پر پڑ رہی تھی۔

''جلدی۔ کوئی آ رہا ہے۔ مجھے گھسیٹنے والے نے کہا اور وہ بڑی بے دردی سے مجھے کھینچنے لگے۔ لیکن موٹر سائیکل آن کی آن میں سر پر پہنچ گئی اور ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔'' یہ کہہ کر موٹر سائیکل سوار نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کی اور نیچے آ کر ہماری طرف بڑھا۔ جس شخص نے مجھے پکڑا ہوا تھا اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور دوسرے دو افراد نے موٹر سائیکل سوار پر ہاکی اسٹکوں سے حملہ کر دیا۔ لیکن میرا مددگار بھی کمال کا پھرتیلا تھا۔ اس نے ان کا وار خالی کر دیا اور بڑی مہارت سے ان میں سے ایک کی ہاکی چھین لی۔ اس کے بعد کھٹا کھٹ کی آوازیں اور ان لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں پھر میں نے ان سب کو بدحواسی میں ٹیکسی کی طرف بھاگتے دیکھا اور آن کی آن میں ٹیکسی سیدھی ہو کر فراٹے بھرنے لگی۔ ہمارا ڈرائیور بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ کار میں جائیے۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ کون لوگ تھے؟'' ہمارے مددگار نے کہا اور میں چونک پڑی۔ یہ وہی نوجوان تھا جو ہمارے لئے فرشتہ رحمت تھا۔ یہ ہی میرا پرس بھی واپس لایا تھا اور اس وقت تو اس نے مجھے بچا ہی لیا تھا ورنہ نجانے میرے ساتھ کیا ہوتا؟

عمارہ اور رافعہ بھی نیچے اُتر آئی تھیں۔ رافعہ چہک کر بولی۔

''آپ نے ہمیں پہچانا نہیں۔''

''آپ پہچان گیا۔'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

''یوں لگ رہا ہے کہ آپ نے ہماری مدد کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ آپ زخمی تو نہیں ہوئے۔''

''نہیں شکریہ۔''

''ویسے ہمیں آپ کا نام تو معلوم نہیں ہے۔ کیا ہم آپ کو مددگار کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔'' رافعہ ان حالات کے باوجود شرارت سے باز نہیں رہی تھی۔

''آپ ڈرائیور کو دیکھئے وہ آپ کو گھر پہنچانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو ہم پہنچ ہی جائیں گے۔ آج تعارف کے بغیر آپ نہیں جاسکیں گے۔ ان کا نام ونیزہ ہے۔ آپ نے پاک کنسٹرکشن کا نام تو سنا ہی ہوگا یہ اس کے مالک احسن عابدی صاحب کی بیٹی ہیں۔ اور میں......''

اچانک ہی ہم سب نے نوجوان کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا۔ وہ ایکدم دور ہو گیا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ یہاں پکنک منانے رکے ہیں؟ وہ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔ آپ پلیز ڈرائیور کو دیکھئے کہ وہ آپ کو گھر پہنچانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔''

میری سمجھ میں اس کا بدل جانے والا رویہ نہیں آیا تھا۔ اس وقت ڈرائیور ہمارے پاس پہنچ گیا اور اس نے واپس جانے کیلئے کہا۔

''آپ سب لوگ ایک ہی جگہ جائیں گے یا......''

''کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' رافعہ تنک کر بولی۔

''اس لئے کہ میں اس طرف جا رہا ہوں کوئی میرے ساتھ چلنا چاہے تو......''

''پلیز...... مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں اس طرف جا رہی تھی۔'' عمارہ نے کہا۔

''آیئے۔'' وہ بولا اور عمارہ نے ٹھیک سے سلام دعا بھی نہیں کی اور اچک کر اس کی بائیک پر جا بیٹھی۔ ہمارے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ہم کار میں جا بیٹھے۔ ڈرائیور نے کار واپس موڑ لی تھی۔

☆......☆......☆

رافعہ کو اس کے گھر چھوڑ کر میں گھر واپس آگئی۔ ابو بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں پوری تفصیل بتائی تو وہ سخت پریشان ہو گئے۔

''اور اب تم اپنی سہیلی کی شادی کے سارے پروگرام اٹینڈ کرو گی۔''

''ہاں ابو۔ ماریہ میری گہری دوست ہے۔''

''خیر میں خود تمہارے ساتھ تمہیں چھوڑنے اور لینے کی ذمہ داری لوں گا۔''

بہت سے واقعات سالہا سال تک ذہنوں پر مسلط رہتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی آسانی سے بھولا نہیں جاسکتا تھا۔ رافعہ تو بس ہر وقت اس شخص کو یاد کرتی رہی تھی۔

''ویسے ایک بات ہے ونی۔''

''کیا؟''

''کمبخت تھا بہت ہینڈسم۔ بالکل انڈین فلموں والا۔''

''لعنت ہے۔ یہ انڈین فلموں کا نام کیوں لیا؟''

''کیونکہ ایسے مناظر وہیں کی فلموں میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ یار کس طرح اس نے ان سب لوگوں کی دھلائی کی تھی۔ مجھے تو وہ کوئی فلمی ہیرو نظر آرہا تھا۔''

''چل ٹھیک ہے۔'' میں نے بات ٹالی۔

''کمبخت نے نام بھی نہیں بتایا۔'' رافعہ بولی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

ابو ان دنوں بہت مصروف تھے۔ وہ ایک بڑے پروجیکٹ کے ٹینڈر کی تیاری میں مصروف تھے۔ جس سے انہیں کروڑوں کے فائدے کی اُمید تھی۔

میرا زیادہ تر وقت تنہا ہی گزرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بھیانک رات کا خیال آجاتا تھا۔ ان لوگوں نے عمارہ اور رافعہ کو نظر انداز کر دیا تھا اور مجھے ہی اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیوں؟ ایک بات صاف ظاہر تھی کہ وہ مجھے تاوان کیلئے اغوا کرنا چاہتے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ عمارہ یا رافعہ کو لے جانے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے انہوں نے مجھ پر ہی ہاتھ ڈالا تھا۔ اور وہ ہم نے اسے فلم دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیسا انوکھا اتفاق تھا۔

پھر ایک دن وہ دوپہر کو اچانک عمارہ آ گئی۔ اس دن کے بعد وہ آج نظر آئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''شکر ہے۔ آج تمہیں یاد آ گیا۔'' اس نے کہا

''حضور ہمیں تو یاد آ گیا ہے۔ آپ نے تو یاد بھی نہیں کیا۔ فون تک نہیں کیا۔''

''یار میں اپنی ایک دوست کی شادی میں مصروف تھی۔ اس دن خیریت سے پہنچ گئی تھیں۔''

''ہاں وہ تمہارے عاشر صاحب تو کسی مینٹل ہسپتال سے بھاگے ہوئے لگتے تھے۔''

''عاشر؟''

''ارے ہاں وہی۔ ایک کو ماریں دو مر جائیں تیسرا خوف کھا کے مر جائے۔'' عمارہ نے اس انداز میں کہا کہ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کہاں کی ہانک رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''یار وہی عاشر جو ان کے سامنے آ گئے تھے اور بعد میں مجھے چھوڑنے گئے تھے۔ عجیب خشک آدمی تھا بڑی مشکل سے اپنا نام بتایا۔''

''ارے واہ تم نے اس کا نام بھی معلوم کر لیا۔''

''ہاں وہ بھی بڑی ٹیکنیک سے......'' عمارہ نے ہنس کر کہا۔

اس وقت باہر سے کچھ شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ میں بھاگ کر کھڑکی پر پہنچی اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ لڑائی ہو رہی تھی لیکن تین چار بندے مل کر ایک بندے پر ہاکی و مکوں سے حملے کر رہے تھے اور وہ اکیلا بندہ پینترے بدل بدل کر ان کے حملے خالی دے رہا تھا۔ آس پاس بہت سے لوگ جمع تھے لیکن کوئی اس بندے کی مدد نہیں کر رہا تھا۔ عمارہ بھی میرے پیچھے سے باہر جھانکنے لگی۔ پھر ایک دم چیخ پڑی۔

''ونیزہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔ عاشر ہے۔۔ وہی عاشر۔۔۔''

اب میں نے غور سے دیکھا تھا وہی تھا۔

''ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ وہ اسے مار ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چوکیدار۔۔۔ چوکیدار۔۔۔'' میں چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ عمارہ بھی میرے پیچھے لپکی تھی۔ میری آواز سن کر دوسرے ملازم بھی آ گئے۔ میں تیزی سے باہر نکلی اور میں نے نوکروں سے کہا۔

''مارو۔۔۔ ان کتوں کو مارو۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ اس شریف آدمی کو۔''

''ہمارا چوکیدار گل خان کسی گینڈے کی طرح طاقت ور تھا۔ اس نے ایک غنڈے سے اسٹک چھین کر اسے گھٹنے سے مار کر توڑ دیا اور پھر ایک گھونسا غنڈے کو رسید کیا۔ میں نے صاف دیکھا اس غنڈے کے دانتوں کی پوری قطار غائب ہو گئی تھی۔ اپنے ایک ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے غنڈوں نے ریس لگا دی اور میرے سامنے کی گلیوں میں غائب ہو گئے۔ نوجوان جس کا نام میں جان گئی تھی حیرت سے مجھے اور عمارہ کو دیکھنے لگا' پھر تعجب سے بولا۔

''ارے...... آپ لوگ؟''

''جی ہم لوگ...... آئیے۔ آپ کی آستین خون سے بھیگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ...... کوئی خاص نہیں...... بس...... او کے۔'' وہ واپسی کیلئے مڑا۔

''کتنی بری بات ہے۔ آپ کسی کے خلوص کو اس طرح ذلیل کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''خلوص کو ذلیل۔'' وہ بولا اور ہنس پڑا۔

''یہ اچھی بات تو نہیں ہے عاشر صاحب۔ آئیے۔ پلیز۔ آئیے۔'' میں نے کئی بار کہا تو وہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑے۔

''ہم اس کا پیچھا کریں بی بی صاحب۔'' گل خان نے پوچھا۔

''اب تک تو وہ اپنے گھروں پر چائے پی رہے ہوں گے گل خان۔'' میں نے کہا' جاؤ...... سب لوگ آرام کرو۔''

''یہ آپ کے نوکر ہیں؟'' عاشر بولا۔

''ہاں...... اور اگر آپ ہمارے ساتھ اندر نہ آئے تو یہ سب آپ کو اٹھا کر اندر لے چلیں

گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ ہمارے ساتھ اندر آ گیا۔ میں اور عمارہ اسے ڈائننگ روم میں لے آئے۔ میں فرسٹ ایڈ بکس لے آئی۔ اس دوران پھوپھی جان بھی ڈرائینگ روم میں آ گئیں۔ عمارہ انہیں ساری تفصیل بتا چکی تھی اور پھوپھی جان عاشر کو دعائیں دے رہی تھیں۔
عاشر نے بتایا کہ'' یہ وہی غنڈے تھے جنہوں نے اس وقت مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت کے بعد سے یہ مجھے مسلسل دھمکیاں دے رہے ہیں اور آج انہوں نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔''
''میرے خیال میں تو اس کی اطلاع پولیس کو دینی چاہیئے۔'' عمارہ نے تجویز پیش کی۔
''ارے نہیں۔۔ میں نے پہلے سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب یہ دوبارہ سامنے آئے تو انہیں وہ سبق دوں گا کہ یاد رکھیں گے آپ کا شکریہ۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔'' عاشر اُٹھ کھڑا ہوا تو پھوپھی جان نے کہا۔
''نہیں بیٹا ایسے کیسے جاؤ گے۔ چائے پی کر جانا۔''
''نہیں خاتون بے حد شکریہ۔ معافی چاہتا ہوں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور خود کو آپ کے برابر کھڑا رکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔'' پھر وہ نہ رُکا اور سلام کر کے باہر نکل گیا میں نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔
''تم ٹھیک کہتی تھیں عمارہ۔''
''کیا؟''
''یہ سچ مچ کھسکا ہوا ہے۔'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ''ارے یہ فائرنگ۔۔۔''
''اوہ مائی گاڈ۔ ایک بار پھر میں نے باہر چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال ٹھیک نکلا' ایک ٹیکسی تیزی سے گیٹ کے سامنے سے گزری' گیٹ کے سامنے عاشر اوندھے منہ پڑا تھا۔ گل خان چوکیدار نے ریپٹر نکالی اور ٹیکسی پر برسٹ مارا لیکن ٹیکسی پھرتی سے ایک گلی میں گھس گئی جو آگے جا کر دوسری چوڑی سڑک پر نکلتی تھی۔
میں نے عاشر کے پاس جھک کر دیکھا۔ عاشر بے ہوش تھا۔ اس کا لباس خون میں بھیگا ہوا تھا۔ اس دوران عمارہ بھی آ گئی۔ اس کے پیچھے پھوپھی جان بھی تھیں۔ عاشر کو اس عالم میں دیکھ کر نجانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔
''گل خان اسے اندر لے چلو۔'' پھوپھی جان نے کہا اور گل خان نے عاشر کو گود میں اُٹھا لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے لیکن پھوپھی جان ہمت سے کام لے رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر آفاقی کو فون کر دیا اور سچویشن بتائی کہ ایک بندے کو گولی لگی ہے۔''
ڈاکٹر آفاقی ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ایک ماتحت کے ہمراہ پہنچ گئے۔ اس دوران عمارہ نے عاشر کا زخم دیکھا اور بولی'' دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگی ہیں۔'' آفاقی صاحب نے بہت مہربانی کی تھی کہ آندھی طوفان کی طرح پہنچے تھے۔ انہوں نے صورتحال کنٹرول کر لی اور خوشخبری سنائی۔
''تشویش کی بات نہیں ہے۔ ہڈیاں محفوظ ہیں' صرف پنڈلیوں کے گوشت کو نقصان پہنچا ہے۔ معمولی زخم ہیں۔ چند روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔
کچھ دیر کے بعد عاشر ہوش میں آ گیا۔ پھوپھی جان نے ہی ابو کو بھی فون کر دیا تھا اس لئے ابو پریشان پریشان گھر پہنچ گئے۔
ڈاکٹر آفاقی نے انہیں زخموں کے بارے میں بتایا پھر کہا'' یہ آپ کے کون ہیں؟ اور ان پر گولیاں کیوں چلائی گئی ہیں؟'' کسی اور کے بولنے سے پہلے پھوپھی جان نے ساری بات بتا دی تو ابو بولے۔
''اوہ یہ ہے وہ نوجوان۔ آفاقی بس یوں سمجھ لو یہ فرشتہ ہے۔ میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے اس نے۔ میری بیٹی کو تاوان کیلئے اغوا کیا جا رہا تھا وہاں بھی اس نے جان پر کھیل کر اسے بچایا' اسی وقت سے مجرم اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تم جانتے ہو آفاقی اپنی بیٹی کیلئے میں اپنا سب کچھ دے سکتا ہوں۔''

''آپ فوری طور پر پولیس کو اطلاع دیں عابدی صاحب۔''

''نہیں سر۔ معافی چاہتا ہوں میری درخواست ہے کہ پولیس کو اس بارے میں ملوث نہ کیا جائے میں شکر گزار ہوں گا۔'' عاشر نے کہا۔

سب چونک کر عاشر کو دیکھنے لگے۔

''کیوں؟ مسٹر عاشر۔'' ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا۔

''میں اپنے نئے مستقل دشمن نہیں چاہتا۔ میں ابھی ان لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور کسی کی دشمنی افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''لیکن وہ تو آپ کے دشمن بن چکے ہیں۔ کسی پر دوستی میں گولی نہیں چلائی جاتی۔ یہ گولیاں تھوڑی سی اوپر لگتیں تو آپ کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن بزرگ خاتون آپ کو ساری صورتحال بتا چکی ہیں۔'' عاشر نے پھوپھی جان کی طرف اشارہ کر کے کہا تو پھوپھی جان چونک پڑیں اور بولیں۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ غصے سے بولیں۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کو پوری تفصیل تو بتا دی ہے۔'' عاشر گھبرا کر بولا۔

''وہ تو میں نے بتا دی ہے لیکن تم نے یہ بزرگ خاتون کس کو کہا۔ کیا میں تمہاری پھوپھی جان نہیں ہوں۔''

''اوہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ خدا جانے میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔ جی ڈاکٹر صاحب تو میں عرض کر رہا تھا۔''

''کچھ عرض نہیں پہلے میرا مسئلہ حل کرو۔'' پھوپھی جان نے کہا اور عاشر مسکرا دیا۔ پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میرا مطلب ہے پھوپھی جان آپ کو پوری تفصیل بتا چکی ہیں۔ میری ان سے براہ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس رات میں سینما دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ میں نے وینزہ صاحبہ کے اغوا کی کوشش دیکھی۔ ظاہر ہے مجھے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ میں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا اور وہ فرار ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ بات ختم ہو گئی لیکن آج جب میں اپنے ایک دوست سے مل کر واپس جا رہا تھا کہ میں نے اس بنگلے کے گرد چند افراد کو دیکھا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ یہ بنگلہ مس وینزہ کا ہے لیکن میں نے انہیں پہچان لیا اور شائد انہوں نے بھی مجھے، میں تو کشمکش میں تھا لیکن انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور میں نے بھرپور مقابلہ کیا۔ ان میں سے دو میرے ہاتھوں سے زخمی ہوئے ہیں۔ تب وہ بھاگ گئے اور مس وینزہ مجھے اندر لے آئیں۔ انہوں نے میری بینڈ یج وغیرہ کی اور میں شکریہ کہہ کر باہر نکلا لیکن وہ لوگ گئے نہیں تھے بلکہ یہیں کہیں چھپ کر بیٹھے تھے۔ انہیں دو مرتبہ میری وجہ سے وینزہ صاحبہ کے اغوا میں ناکامی ہوئی تھی جس سے انہوں نے سوچا کہ میں ان کے راستے کا سب سے بڑا کانٹا ہوں اور مجھے راستے سے ہٹائے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتے چنانچہ انہوں نے یہ کارروائی کی مگر تقدیر تھی کہ میں بچ گیا۔ یہ ہے پوری کہانی۔''

''آپ ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہیں لیکن پولیس کو اطلاع دینی تو ضروری ہے۔ وہ لوگ تیسری بار بھی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن اپنے بارے میں، میں بتا چکا ہوں۔''

''کیا؟''

''میں ایک ملازمت پیشہ انسان ہوں۔ پولیس کے ہاتھ لگ جانے کے بعد بہت سی الجھنیں کھڑی ہو جاتی ہیں اس لئے منع کر رہا ہوں۔'' عاشر نے کہا۔

''میرے خیال میں ڈاکٹر، عاشر کی بات مان لی جائے۔'' اس بار ابو نے مداخلت کی۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔''

''کچھ معاملات میرے بھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اس وقت کسی اور مشکل میں پھنسوں۔ کچھ ایسے ہی کاروباری معاملات ہیں جن کی وجہ سے میں کسی دوسرے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے عابدی صاحب لیکن آپ سوچ لیں

کہ دو بار آپ کی بیٹی کو اغوا کرنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ تیسری بار بھی یہ کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''اس کا انتظام میں کرلوں گا۔''

''اوکے'' ڈاکٹر صاحب نے کہا اور پھر کچھ ہدایات دے کر چلے گئے۔

''براہ کرم مجھے میرے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں۔ میں موٹر سائیکل نہیں چلا سکتا۔'' عاشر نے کہا تو ابو نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ ہمیں اتنا ناسمجھ سمجھتے ہیں عاشر صاحب۔ آپ نے ہماری وجہ سے گولیاں کھائی ہیں اور ہم آپ کو اس طرح بے یارومددگار چھوڑ دیں۔''

''لیکن جناب۔'' عاشر نے کہا۔

''ہاں کیا جناب۔'' اس بار پھوپھی جان غرائیں۔

''میری والدہ اور بہنیں۔''

''اللہ انہیں خوش رکھے۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' پھوپھی جان نے کہا۔

''پھر بھی۔''

''نہیں عاشر صاحب' میں آپ کو اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک آپ ٹھیک نہ ہو جائیں۔ جہاں تک بات رہی آپ کی والدہ اور بہنوں کی تو ان کی طرف سے بے فکر رہیں۔ میں ان کی حفاظت کا بندوبست کردوں گا۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں اور یہ صرف تاوان کا معاملہ ہے یا اس کے پس پردہ کچھ اور بھی ہے اور اس کیلئے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت بھی ہے۔''

''میں حاضر ہوں لیکن۔''

''حاضری میں لیکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔''

''جی۔'' عاشر نے گہری سانس لے کر کہا۔ گویا عاشر تیار ہو گیا تھا۔ مجھے عاشر کے تیار ہو جانے سے ایک خوشی کا احساس ہوا تھا۔ عاشر یہاں رہے گا کتنا مزا آئے گا۔ ابو کہہ رہے تھے۔

''اب یوں کرو گھر فون کر کے بتاؤ کہ تم دو تین دن کیلئے کسی دوسرے شہر جا رہے ہو۔ تمہاری کمپنی ایمرجنسی میں تمہیں بھیج رہی ہے۔ وہ لوگ فکر نہ کریں۔''

عاشر خاموش ہو گیا۔ ابو نے پھر کہا۔

''بار بار کہنا اچھا نہیں لگتا عاشر۔۔۔ اس وقت تم نے جس طرح جان کی بازی لگا کر میری بیٹی کی حفاظت کی ہے اس کا کوئی بدلہ نہیں دیا جا سکتا۔ تم ہمارے محسن ہو اور ہم تمہیں بڑے اعتماد سے اپنا فیملی ممبر کہہ سکتے ہیں۔ میں چلتا ہوں اور تم فکر مت کرنا۔ اب وہ لوگ اگر تیسری کوئی کوشش کریں گے تو بچ کر نہیں جا سکیں گے۔'' ابو چلے گئے۔

''کھانا کھا کر چلی جانا عمارہ۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں۔ تم اپنے مہمان کی تیمارداری کرو۔ میں پھر آؤں گی۔'' عمارہ چلی گئی۔ عاشر نے اپنے گھر فون کر کے کہا۔

''امی۔ میں اپنی فرم کے کسی کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ واپسی میں کچھ وقت لگ جائے گا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔''

عاشر کیلئے میرے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ اٹھا تھا۔ یہ شخص واقعی میرا محسن تھا۔ ہر مشکل گھڑی میں کام آیا تھا۔ اس دن پرس بھی اس کی وجہ سے واپس ملا۔ پھر اس نے اغوا ہونے سے بچایا اور اب بھی وہی کام آیا لیکن اس نے اپنی خاموشی او رنجیدگی برقرار رکھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم لوگ اسے بالکل پسند نہیں آئے ہوں۔

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب پٹی کرنے آئے تو بولے۔ ''ارے۔۔۔ آپ تو کمال کے انسان ہیں۔''

''کیوں ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔''

''اتنی تیزی سے زخم بھر رہے ہیں کہ یقین نہ آئے۔''

''یہ تو آپ کا کمال ہے ڈاکٹر صاحب۔''

''نہیں آپ کا بھی ہے۔''

''میں کب تک اس قابل ہو جاؤں گا کہ چل پھر سکوں۔''

''آپ تو آج بھی دوڑ سکتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ تھوڑا وقت اور آرام کر لیں۔'' ڈاکٹر صاحب

کچھ ہدایات دے کر چلے گئے۔

میں عاشر کے پاس موجود تھی۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں عاشر۔''

''پوری کر دیں گی؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ارے ہاں۔۔۔ بتائیے۔'' میں نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''ایک ٹیکسی منگوا دیں تو عنایت ہو گی' میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حد ہوتی ہے خود پرستی کی۔ انا سب کے اندر ہوتی ہے لیکن اتنا گریز بھی مناسب نہیں ہوتا۔ حد کر دی اس شخص نے' میں خود کو باز نہ رکھ سکی۔

''عاشر صاحب! آپ میرے محسن ہیں۔ کئی بار مشکل ترین حالات میں آپ میری مدد کر چکے ہیں۔ کوئی معمولی احسان نہیں کیا ہے آپ نے مجھ پر اور میرے گھرانے پر اور اس کے نتیجے میں آپ زخمی ہوئے ہیں۔ عاشر صاحب براہ کرم میری بات کو گستاخی نہ تصور کریں۔ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اچھوت اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہوں۔ آپ کے ہر تاثر سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔ کیا آپ مجھے میری بات کا جواب دینا پسند کریں گے۔ یہ آپ کا کیا انداز ہے۔'' میں نے عاشر کو گھورتے ہوئے کہا۔

عاشر کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کچھ لمحے توقف کیا' پھر بولا۔

''یہ سوال نہ کریں ونیزہ صاحبہ۔۔۔''

''کیا مطلب؟''

''پلیز یہ سوال نہ کریں۔''

''اس کا کوئی جواب بھی ہے۔''

''جی ہے۔''

''او مائی گاڈ۔۔۔ کیا؟''

''میں جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن بعض اوقات تقدیر انوکھے کھیل کھیلتی ہے۔ بالکل اتفاق ہے کہ مجھے اس طرح آپ کی خدمت کا موقع ملا نہیں۔۔۔۔''

''میں شدید سسپنس کا شکار ہوں عاشر صاحب خدا کیلئے مجھے بتائیے۔ کیا بات ہے۔''

''مجھے بتائیے اگر کوئی شخص آپ کے والد پر جھوٹا الزام عائد کر کے انہیں جیل پہنچا دے۔ یہاں وہ دنیا اور اپنے عزیزوں کی نظروں میں رسوا ہونے کی شرمندگی میں خودکشی کر لیں اور ان کی بیوہ اور بچوں کو در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں تو آپ کے جذبات اس شخص کے بارے میں کیا ہوں گے؟''

''مگر یہ کہانی کس کی ہے عاشر' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''میرے مرحوم والد فاروق احمد کی جو محسن عابدی صاحب کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ عابدی صاحب نے ان پر لاکھوں کی رقم خورد برد کرنے کا الزام لگا کر انہیں جیل پہنچا دیا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے جیل میں خودکشی کر لی۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال تھی اور میری تینوں بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتیں کہ ہم پہ کیا قیامت ٹوٹی تھی۔ ہم بہن بھائیوں اور ماں نے زمانے کی اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ لہولہان ہو گئے ہیں۔ یہ پندرہ سولہ سال ہم نے جس طرح گزارے ہیں ہم ہی جانتے ہیں۔ میں نے اور میری ماں نے عابدی صاحب کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا اور مجھے تلقین کی کہ میں کبھی انتقام لینے کے بارے میں نہ سوچوں۔ پھر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ مجھے آپ کے راستے پر لے آئی اور مجھ پر فرض عائد ہوا کہ میں آپ کی مدد کروں لیکن معاف کیجئے گا' کوئی اپنے باپ کے قاتل کو بھی بھول سکتا ہے؟''

میں حیرت و سکتے کے عالم میں یہ سب سن رہی تھی۔ مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میں ابھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں عاشر؟''

''میں کبھی آپ کو نہ بتاتا اور خاموشی سے یہاں سے چلا جاتا لیکن آپ نے اتنا مجبور کر دیا۔''

''جی۔۔۔ یعنی میں اپنے باپ کی موت کے بارے میں بتا رہا ہوں اور آپ مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو۔'' وہ کسی قدر ناگواری سے بولا۔

''نہیں ۔۔۔ میں آپ کو جھوٹا نہیں کہہ رہی۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے ابو ایسے ہرگز نہیں ہیں۔ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''نہیں ونی۔۔۔ یہ سچ ہے۔'' کوئی آواز اُبھری۔

میں نے تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ پھوپھی جان نہ جانے کب سے پیچھے کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ پھوپھی جان کمرے کے اندر آ گئی تھیں۔

''یہ واقعہ کبھی نہیں بھولا جا سکتا۔ پندرہ سولہ سال گزر چکے ہیں لیکن کل کی سی بات لگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فاروق احمد کے ساتھ سراسر زیادتی اور ظلم ہوا تھا لیکن وہ واقعی غلط فہمی تھی' ایک سنگین غلط فہمی۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں پھوپھی جان؟''

''یہ سچ ہے بیٹی۔ وہ غبن بڑی چالاکی سے کیا گیا تھا اور اس میں اسسٹنٹ منیجر ملوث تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ الزام بے چارے فاروق احمد پر آ گیا اور انہیں سزا ہو گئی۔ انہوں نے جیل میں خودکشی کر لی۔ بعد میں اصل حقیقت کا علم ہوا تو عابدی پر دورے پڑنے لگے۔ اسے سخت غم ہوا تھا پھر اس نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کیلئے فاروق احمد کے بیوی بچوں کو تلاش کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن یہ لوگ کہیں نہیں ملے۔''

میرا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے سہمی ہوئی آنکھوں سے عاشر کو دیکھا۔ پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں' میں بری طرح رو رہی تھی۔ نہ جانے کس طرح میرے منہ سے آواز نکلی۔

''عاشر...... عاشر...... میں معافی مانگتی ہوں۔ عاشر مجھے اور میرے ابو کو معاف کر دو۔ عاشر......

میں تمہاری ماں بن سکتی۔۔۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

''میں جانا چاہتا ہوں ونیزہ صاحبہ......''

''نہیں بیٹے...... میں تمہاری ماں تو نہیں ہو سکتی لیکن ماں جیسی ضرور ہوں۔ تم آج نہ جاؤ۔ نہ جانے عابدی کے دل میں کیا کیا ہے۔ ممکن ہے اسے آج بھی فاروق احمد کے بیوی بچوں کی تلاش ہو۔ ایک بار اس سے مل لو صرف ایک بار...... میری درخواست ہے۔''

''نہیں پھوپھی جان۔ براہِ کرم مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

''آخری بار میری بات سن لیں عاشر...... وعدہ کرتی ہوں اس کے بعد میں زندگی بھر آپ سے نہیں ملوں گی۔ مجھے حقیقت کا کوئی علم نہیں تھا۔ آپ بلاشبہ ہم سے نفرت کریں اور ہمارے ساتھ حقارت آمیز سلوک کر لیں لیکن اپنی بڑائی کو برقرار رہنے دیں۔ بس ایک بار میرے ابو سے مل لیں اور اگر اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے تو میں ابھی ٹیکسی منگوا دیتی ہوں۔''

''نہیں ونی۔۔۔ یہ نہیں جائیں گے۔ اس باپ کی اولاد ہیں جس نے اپنی غیرت کو مجروح دیکھ کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ کسی کی اتنی بات ضرور سنیں گے۔''

پھوپھی جان بھی سسکیاں لینے لگیں۔ عاشر کے چہرے پر شکستگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

☆......☆

پھوپھی جان نے شائد فون پر ابو کو عاشر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ جان کر کہ عاشر فاروق احمد کا بیٹا ہے ابو پر کیا گزری' ظاہر ہے میں نے تو نہیں دیکھا لیکن اتنا جانتی تھی کہ ابو ایک حساس آدمی ہیں۔ اس بات کا بھی یقین تھا کہ ابو کو کوئی بڑا ہی دھوکا ہوا ہو گا جو انہوں نے اتنی بڑی کارروائی کی ورنہ وہ ایسی سنگ دلی نہ کرتے۔

غرض یہ کہ ابو آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کا آفس اردلی بھی تھا جس کے پاس ایک بڑا سا بیگ تھا۔ ان

کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

پھوپھی جان نے انہیں عاشر کے بارے میں بتایا تو وہ بولے' یہ بھی قدرت کی طرف سے میرا ایک اور امتحان ہے اور سزا ہے کہ جس شخص کو میرے ہاتھوں اذیت پہنچی وہی مجھ پر اتنا بڑا احسان کرے' وہ بھی جان کر۔۔۔''

''میں تو اس سے کہوں گی کہ وہ میرے بھائی کو معاف کردے۔''

''نہیں باجی۔۔ میں اس سے تنہائی میں بات چیت کروں گا۔'' ابو نے پھوپھی جان کی پیشکش مسترد کردی۔ پھوپھی جان خاموش ہوگئیں۔

اردلی جو بیگ لایا تھا اس میں اکاؤنٹس کا پرانا ریکارڈ رجسٹر اور فائلیں تھیں۔ ابو نے چائے بھی نہیں پی اور اس کمرے میں چلے گئے جہاں عاشر موجود تھا۔ مجھے بے حد تجسس تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ابو باہر آئے اور وہ رجسٹر وغیرہ لے کر دوبارہ کمرے میں چلے گئے۔ پھر مزید ایک گھنٹے کے بعد وہ باہر آئے اور مجھ سے بولے۔

''ونیزہ۔ عاشر کیلئے چائے بھجوادو۔''

''جی ابو۔ آپ عاشر کے ساتھ چائے پئیں گے۔''

''نہیں۔ میں آفس جا رہا ہوں۔''

''دوبارہ۔''

''ہاں کام ہے' تھوڑی دیر کے بعد آؤں گا۔'' اور رجسٹر وغیرہ لے کر اردلی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ میں نے چائے کا بندوبست کیا اور ٹرالی دھکیلتی کمرے کے اندر داخل ہوگئی۔ عاشر مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

''ارے۔ آپ ٹرالی لے کر کیوں آئی ہیں؟ ملازم کہاں گئے؟''

''میں جو ہوں آپ کی ملازم۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور عاشر مسکرایا۔

''اور ذلیل کریں گی۔'' وہ بولا۔

''بخدا نہیں۔ اس میں ذلیل کرنے کی کیا بات ہے۔''

''مجھے آپ کے رونے کا شدید دکھ ہوا ہے۔''

''چلئے۔ کچھ تو ہماری فریاد کام آئی۔'' میں نے کہا اور عاشر نے گردن جھکالی۔ میں نے پھر کہا۔

''اب تو آپ نہیں جا رہے؟''

''جانا تو ہے۔''

''ہاں۔ نہیں ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟''

''جب آپ کے زخم ٹھیک ہوجائیں۔''

''بعض زخم کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

اس کے بعد عاشر نے جانے کی ضد نہیں کی۔ البتہ اس نے اپنی والدہ سے دو تین بار فون پر بات کی تھی اور یہی کہا تھا کہ آفس کا کام لمبا ہو گیا ہے وہ فکر نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ آرہے تھے اور پٹیاں بدل رہے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق عاشر کے زخم تقریباً ٹھیک ہوگئے تھے۔

☆......☆

دوسری طرف ابو کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ وہ صبح نکل جاتے اور رات کو گھر واپس آتے۔ میں نے پھوپھی جان سے اس بارے میں پوچھا تھا۔

''مجھے بھی تفصیل معلوم نہیں۔ بس عاشر والے معاملے میں کسی کام میں مصروف ہیں۔''

چھٹے دن وہ دوپہر کے کھانے پر آگئے۔ میں نے کہا۔

''آپ تو بس مہمان بن کر رہ گئے ہیں ابو۔''

''نہیں بیٹے۔ کئی کام جمع ہوگئے تھے۔ عاشر سے بھی بڑی سرسری ملاقات رہی۔ ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں اور ان کے ساتھ میں ان کے گھر بھی جاؤں گا۔ ان کی امی سے میں خود معافی مانگوں گا۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' میں نے بچے کی طرح کہا اور ابو ہنسنے لگے۔ ''کب جائیں گے ابو؟''

''اگر ممکن ہوسکا تو آج ہی لیکن سوری بیٹے' آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گی۔''

''کیوں؟'' میں نے لاڈ سے تنگ کرنا۔

''کچھ باتیں بڑی سیکرٹ ہوتی ہیں۔ اچھا میں ذرا چلتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔'' ابو چلے گئے تو میں عاشر کے پاس بیٹھ گئی۔

''تو آپ جا رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''جی۔''

''دوبارہ ملیں گے؟'' میرے لہجے میں اُداسی تھی۔

''روزانہ۔'' عاشر نے بڑی اپنائیت سے کہا اور میں خوشی سے اُچھل پڑی۔ عاشر کے اپنائیت کے انداز نے میری ساری اُداسی دور کر دی تھی۔

''ہاں۔'' عاشر نے جواب دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ بات صرف عاشر کے احسان کی نہیں ہے بلکہ کم بخت دل کا کوئی اور گوشہ بھی متاثر ہو گیا ہے۔

☆......☆......☆

ابو جب عاشر کے گھر سے واپس آئے تو ان کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ عاشر کی والدہ سے ملاقات بے حد کامیاب رہی ہے۔

انہوں نے کہا ''زبیدہ خاتون سے ملاقات کر کے میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس قدر دین دار اور صابر خاتون ہیں کہ شائد ہی مثال ہو۔''

''صلح صفائی ہو گئی۔'' پھوپھی جان نے کہا۔

''ہاں انہوں نے مجھے موردِ الزام قرار نہیں دیا اور بتایا کہ بس تقدیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ کو ہمارا امتحان منظور تھا۔ خود فاروق احمد کے بارے میں بھی انہوں نے یہی بتایا کہ فاروق کہتے تھے کہ عابدی صاحب ایسے انسان نہیں۔ کوئی بڑی غلط فہمی ہی تھی جو ان کے دل میں ڈالی گئی ہے۔''

''انہوں نے تمہیں معاف کر دیا۔''

''ہاں۔۔۔ خلوص دل سے۔''

''ابو۔ اب تو میں ان سے مل سکتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ایک آدھ دن رُک جاؤ پھر پھوپھی جان کے ساتھ چلی جانا۔''

عاشر وعدے کے مطابق دوسرے دن آ گیا۔ اس گھر میں اس کیلئے اب دوسرا مقام بن گیا تھا۔ تین دن کے بعد ایک دن ہم عاشر کے ساتھ ہی اس کے گھر گئے۔ ابو نے ٹھیک کہا کہ بے حد مخلص اور پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ یہی کیفیت اس کی بہنوں کی بھی تھی۔ ہم بہت ہی اچھے تاثرات لے کر آئے تھے۔

عاشر کے زخم ٹھیک ہو گئے تھے اور وہ اپنے کام پر جانے لگے تھے۔ باقی تو سب ٹھیک تھا لیکن اس طویل دورانیے میں نہ تو رافعہ سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی عمارہ کی کوئی خیر خبر ملی تھی۔ حالانکہ وہ عاشر کو زخمی چھوڑ کر گئی تھی۔

رافعہ کے بارے میں تو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے بھائی کے رشتے کیلئے اپنی امی اور ابو کے ساتھ سکھر گئی ہے لیکن عمارہ پر حیرت تھی۔ دوسری حیرت ان غنڈوں پر بھی تھی جو ایک دم عاشر کو زخمی کرنے کے بعد غائب ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کیلئے ابو نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اگر وہ وہاں آ جاتے تو انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا تو وہ ایک دم غائب ہو گئے تھے۔

عاشر وعدے کے مطابق آ جاتے تھے اور ہم ان کے عادی ہو گئے تھے۔ ایک دن میں نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ ''عاشر۔۔۔ ان بے چارے غنڈوں کی بھی کوئی خیر خبر ملی؟''

میرا خیال تھا کہ عاشر میرے ان الفاظ کو انجوائے کریں گے لیکن وہ سنجیدہ ہو گئے۔

''کیوں۔ آپ کو اغوا ہونے کا شوق ہے؟''

''کیا حرج ہے۔ وہ مجھے اغوا کر لیں اور پھر آپ فضا میں اُڑتے ہوئے آئیں اور مجھے ان کے چنگل سے نکال کر لے آئیں۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

عاشر نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا۔

''ویسے عاشر سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ وہ کیا قصہ تھا؟ کیا انہوں نے صرف تاوان کیلئے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟''

اس بات پر عاشر بری طرح چونکے تھے۔
انہوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا تھا پھر کہا۔
''آپ کا کیا خیال ہے؟'' ان کے اس سوال کا انداز عجیب تھا اور انہوں نے یہ سوال کرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا تھا۔
''نہیں۔۔۔۔۔ بس ایسے ہی خیال آیا تھا۔''
''عابدی صاحب اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''
''ارے بس۔ آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔ یہ خیال ایسے ہی میرے دل میں آ گیا تھا۔ ابو سے میں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔''
''ہاں۔ لیکن بات تو سوچنے کی ہے۔'' عاشر نے پرخیال انداز میں کہا۔
پتا نہیں میرے اس سوال سے عاشر کے ذہن میں کیا خیال آیا تھا۔
عاشر آتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ دن میں ساڑھے بارہ بجے آیا تھا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔
''بس ایک عادت بن گئی ہے یقین کرو' کبھی کبھی تو بالکل بے خیالی میں آ جاتا ہوں اور یہاں آ کر ہوش آتا ہے تو ہنستا ہوں کہ کیسے آ گیا۔''
''اور یہاں بھی آنکھیں گیٹ پر لگی رہتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ یہ ہم دونوں کا اظہار محبت تھا لیکن آج اس رات کو دس بجے عاشر کی دوبارہ آمد پر حیرت ہوئی تھی۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ میں ابو اور پھوپھی زلزلوں کے بارے میں بات کر رہے تھے جو آجکل روزانہ آ رہے تھے کہ ابو نے چونک کر کہا۔
''ارے عاشر آیا ہے۔''
میں نے بھی چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔
عاشر کی بائیک اندر داخل ہوئی تھی۔
''خدا خیر کرے۔ اس وقت کبھی نہیں آیا۔'' پھوپھی بولیں۔
''کوئی خاص بات ہوتی تو فون کر لیتا۔'' ابو نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔
''کہاں جا رہے ہو؟''
''باہر جا کر دیکھتا ہوں۔'' ابو بولے۔
''نہیں آ جائیے گا۔'' پھوپھی نے کہا۔ عاشر اندر داخل ہو گیا تھا۔ ایک ملازم اسے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس نے سلام کیا اور بولا۔
''ناوقت آمد کی معافی چاہتا ہوں۔''
''کیسی باتیں کر رہے ہو بیٹے' تمہارا اپنا گھر ہے۔'' ابو خلوص سے بولے۔
''تنہائی میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''
''اوہو۔ خیریت۔۔۔'' ابو بولے۔
''جی بالکل خیریت ہے۔ بس کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی تھیں۔''
''آؤ۔'' ابو بولے اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ عاشر سنجیدہ تو رہتا تھا لیکن اس وقت زیادہ ہی سنجیدہ تھا۔ وہ چلے گئے تو میں اپنا شدید تجسس نہ روک سکی۔
''پھوپھی جان۔ میں ان کی باتیں سنوں گی۔''
''اوہ۔۔۔۔ یہ غیر اخلاقی حرکت ہو گی۔''
''مجھے معلوم ہے۔ آپ آرام کریں۔'' میں نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔ اس وقت پھوپھی جان کی مداخلت بری لگی تھی۔ پھر میں ان کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئی۔ ابو کا کمرہ میرے کمرے کے برابر تھا۔ درمیان میں ایک بڑی کھڑکی تھی جس سے دوسری طرف کی باتیں سنی جا سکتی تھیں۔ میں اس سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔
''انکل۔ میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ جو واقعات تھے پوری طرح آپ کے علم میں آ چکے ہیں اور مجھے بھی اس بات سے اتفاق ہے کہ جو کچھ میرے والد کے ساتھ ہوا وہ سب غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔''
''ہاں۔ تم نے سارے کاغذات اور رجسٹر بھی دیکھے ہیں۔''
''جی ہاں۔ پوری طرح۔''
''میں خود کو بے گناہ نہیں کہوں گا۔ مجھے بھی صبر سے کام لینا چاہئے تھا۔''
''کاش ایسا ہو جاتا۔ کم از کم ہم اس طرح موجود نہ ہوتے۔'' عاشر نے کہا۔

میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ پتا نہیں بھابھی نے مجھے معاف کیا ہے یا نہیں۔'' حسن عابدی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''امی سے میری تفصیلی بات ہو چکی ہے۔''

''وہ کیا کہتی ہیں؟''

''ایک ہی بات کہتے ہیں ہم سب۔''

''کیا؟''

''یہ سارے تقدیر کے کھیل ہیں۔ ابو کو اسی طرح دنیا سے جانا تھا۔'' عاشر نے کہا۔ تھوڑی دیر کے لئے غم کا ماحول بن گیا تھا۔ میں بھی اس مظلوم خاندان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دنیا انہی حادثوں کا نام ہے۔ کسی کی ذرا سی غلطی کسی کیلئے عمر بھر کا غم بن جاتی ہے۔

میری توجہ پھر اندر ہونے والی گفتگو کی طرف ہو گئی۔ عاشر کے الفاظ تو بڑے عجیب تھے۔ اس نے کچھ لمحے توقف کے بعد کہا۔ ''انکل! میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ ایک پروقار اور بااصول انسان ہیں۔ ایک صاف ستھری طبیعت کے مالک ہیں لیکن۔۔۔''

''لیکن کہہ کر تم رُک کیوں گئے؟''

''ہمت نہیں پڑ رہی آگے کچھ کہنے کی۔''

''نہیں بے دھڑک کہو۔ میں پریشان ہو گیا ہوں۔''

''کچھ اور باتیں بھی مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوئی ہیں۔''

''اور باتیں۔'' ابو کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''مجھے بتاؤ تو سہی۔'' آخر انہوں نے کہا۔

''انکل میں آپ کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

''ہاں۔ ہاں۔ ضرور پوچھو۔ اور براہ کرم مجھے خلجان کا شکار نہ کرو۔ تمہاری یہ ہچکچاہٹ میرا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہے۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ گزشتہ کچھ برسوں کے درمیان آپ نے متعدد فرضی ناموں سے کئی کنسٹرکشن کمپنیاں قائم کیں اور لوگوں سے فراڈ کر کے کروڑوں روپے وصول کئے اور اس کے بعد وہ کمپنیاں غائب ہو گئیں۔ اس کے علاوہ کچھ جعلی ناموں سے کچھ پروجیکٹس بنائے بھی گئے تاکہ لوگوں کو آگے لوٹنے کیلئے ایک بھرم قائم کیا جائے لیکن ان میں اتنا سستا اور ناقص میٹریل لگایا گیا کہ کئی عمارتیں مکمل ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہو گئیں اور اس طرح بہت سی قیمتی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ پھر یہ کمپنیاں غائب ہو گئیں۔ ان تمام کارروائیوں کے پس پردہ آپ کا نام لیا جاتا ہے انکل اور اس بات نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔''

''تم پریشان ہو؟'' عابدی صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بے حد انکل۔''

''گویا کوئی نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف رہیں۔''

''نہیں انکل۔ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔''

''شکریہ۔ تب تم مجھے یہ ضرور بتاؤ گے کہ تم تک پہنچنے والی اس اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؟'' یہ سن کر عاشر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔

''نہیں انکل۔ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔''

''اوہ۔ گویا۔ تمہارے ذہن میں کچھ فیصد یہ خیال ضرور ہے کہ ممکن ہے ان معلومات میں کچھ صداقت ہو۔ خیر میں نے یہ دولت، یہ عزت، لاٹری میں نہیں کمائی عاشر بیٹے۔ اس کیلئے میں نے تگ و دو کی ہے۔ بھاگ دوڑ کی ہے۔ عقل کا استعمال کیا ہے۔ میں تمہیں ایک عام سی بات بتاؤں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص تمہیں دوسروں سے ممتاز' صاحب حیثیت نظر آئے تو اس بات پر یقین رکھو کہ وہ بیوقوف نہیں ہے اور اس نے عزت، دولت، شہرت اپنی صلاحیتوں سے کمائی ہے اور وہ اس کا اہل تھا۔''

''سو فیصد انکل۔''

''اور میں جانتا ہوں تمہاری ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں۔''

''ہاں۔

تو بتایئے۔"

"شکر ہے کہ آج تم نے خود یہ ذکر چھیڑ دیا۔ یہ جو الزامات مجھ سے منسوب کئے جا رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اس کمپنی کے ہیں جن میں تم کام کر رہے ہو۔ مجھے معاف کرنا میں اس قدر بے خبر انسان نہیں ہوں۔ وہی بات جو ابھی میں نے تم سے کہی۔ ہر کامیاب شخص بلا وجہ ہی کامیاب نہیں ہو جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہاری کمپنی مجھ پر یہ الزام تھوپنے میں مصروف ہے۔ اس لئے میں نے بھی تھوڑی سی جدوجہد کی اور اپنا ڈیفنس کرتے ہوئے کچھ حقائق اعلیٰ حکام تک پہنچائے۔ جن کی بنیاد پر تمہاری کمپنی کے خلاف تحقیقات شروع ہو گئیں اور آخر کار بہت سے ثبوت مہیا ہو گئے اور اب بہت جلد تمہاری کمپنی پر ریڈ ہونے والا ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔ ایسی بات ہے۔"

"میری ہدایت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو تم وہاں سے استعفیٰ دے دو ورنہ تم بھی حالات کی لپیٹ میں آ سکتے ہو۔"

میں نے ابو کی بات سنی۔ اپنے باپ کے لہجے اور الفاظ کی ادائیگی کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔

عاشر بھی سحر زدہ سا نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی سرسراتی آواز ابھری "تو یہ کام دلاور خان بلڈرز کے ہیں۔"

"جو کچھ ہے بس چند ہی روز میں سامنے آ جائے گا۔"

"اوہ انکل۔ یقین کریں۔ یہ بھی بے شک بہت بڑی بات ہے کہ کچھ ہونے سے پہلے ہی آپ نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اب میں سو فیصد ہی وہاں سے پیچھا چھڑا لوں گا لیکن اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ میری ایک ذہنی خلش دور ہو گئی۔ انکل جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے ابو کے سلسلے میں آپ بے گناہ ہیں تب سے میرے دل میں آپ کا احترام سو گنا بڑھ گیا ہے۔"

"اور بیٹے۔ مجھے بھی تم ونیزہ سے کم عزیز نہیں ہو اور سنو میں کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اور میرے درمیان یہ فرق کو بھول جاؤ۔ یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ جب دل چاہے بھابھی اور بچیوں کو یہاں لایا کرو۔ وہ یہاں رہنا چاہیں تو رہا بھی کریں مجھے خوشی ہو گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ باجی بھی تم لوگوں کو بہت پسند کرتی ہے اور تمہاری تعریفیں کرتی رہتی ہیں۔"

"میں خوش نصیب ہوں۔ شکریہ اب اجازت۔" عاشر نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ونیزہ وغیرہ سے نہیں ملو گے؟"

"اس وقت نہیں پھر حاضری دوں گا۔"

"او کے۔" ابو نے کہا اور پھر وہ عاشر کو چھوڑنے باہر تک گئے۔

میرے دل میں نہ جانے کیوں گدگدیاں سی ہو رہی تھیں۔ کس طرح ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا اور وہ ہماری دنیا میں آ گیا۔ بعض اتفاقات کتنے انوکھے ہوتے ہیں۔ میں تو اس اچکے کی شکر گزار تھی جو میرا پرس لے کر بھاگا تھا۔

اس رات میں نے عاشر کو خواب میں دیکھا۔ بار بار آنکھ کھل رہی تھی اور دوبارہ نیند آتی تو پھر عاشر میرے خوابوں میں آ جاتا۔

"اے۔ مجھے پریشان مت کرو۔" میں نے عاشر کو ڈانٹا اور خود اپنی حماقت پر مسکرا کر سو گئی۔

دوسرے دن طبیعت پہ ایک خوشگواری کیفیت طاری تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں اخبار ضرور پڑھتی تھی۔ اس وقت بھی اخبار پڑھتے ہوئے چونک پڑی۔ وجہ وہ تصویر تھی جو ایک گوشے میں خبر کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ مجھے اس تصویر نے چونکا دیا تھا۔

میں نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ مجھے دھوکہ نہیں ہوا تھا۔ یہ تصویر ان غنڈوں میں سے ایک کی تھی جنہوں نے عاشر پر حملہ کیا تھا۔ میں نے دن کی روشنی میں انہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اسے پہچاننے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بے صبری سے

لاش کے ساتھ چھپی خبر پڑھی۔ لکھا تھا۔ پولیس کو ایک گندے نالے سے کسی نامعلوم شخص کی لاش ملی ہے۔ لاش کے جسم پر موجود لباس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جس کی مدد سے اسے شناخت کیا جا سکے۔ لاش کے جسم پر گولیوں کے تین نشانات موجود ہیں جس سے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ عوام سے اپیل ہے کہ اگر اس تصویر سے کوئی شناخت ممکن ہو تو پولیس کو اس بارے میں اطلاع دی جائے۔

معلوم مجھے بھی کچھ نہیں تھا اس بارے میں۔ بس اس حقیقت سے پہچان لیا تھا کہ میں نے اسے عاشر پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ میں ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ اسی دوپہر کو اچانک عاشر آ گیا اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔ آپ کو ہم یاد تو آئے۔''

''ارے۔ یاد انہیں کیا جاتا ہے جسے بھول جایا جائے۔''

''واہ۔ اچھی منطق ہے۔''

''ویسے اس وقت میں آیا نہیں بھیجا گیا ہوں۔''

''اچھا۔ بڑی عنایت ہے بھیجنے والے کی۔''

''وہ میری والدہ محترمہ ہیں۔ انہوں نے آپ کو اور پھوپھی جان کو بلایا ہے۔''

''ارے واہ چچی جان ہوں تو ایسی۔ ابو تو آفس چلے گئے۔ پھوپھی جان سے کہتی ہوں۔'' میں پھوپھی جان کے پاس جانے کیلئے اٹھی تھی کہ پھوپھی جان خود آ گئیں۔ عاشر کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ عاشر نے اپنے آنے کی وجہ بتائی تو پھوپھی جان بولی۔

''اوہو۔ میرے لئے خوشی کی بات تھی لیکن پڑوس میں ایک ضروری تقریب ہے۔ ایک بچی کا رشتہ دیکھنے والے آ رہے ہیں۔ ان کے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہے مجھے ہی ان کی میزبانی کرنی ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے بلکہ میرے خیال میں تم وِنی کو لے جاؤ۔''

''جیسا آپ کا حکم۔'' عاشر نے نیاز مندی سے کہا۔

''جاؤ دوشیزہ تیار ہو جاؤ۔''

عاشر معمول کے مطابق اپنی موٹر بائیک پر آیا تھا اگر پھوپھی جان ساتھ ہوتیں تو ظاہر ہے ٹیکسی میں جانا پڑتا لیکن اب بائیک پر عاشر کے ساتھ جانا تھا۔ مجھے اس کا مزا آ رہا تھا۔ عاشر کچھ الجھا نظر آ رہا تھا کہنے لگا۔

''آپ کیلئے ٹیکسی کر لوں۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا اور اچک کر بائیک پر بیٹھ گئی۔ وہ بائیک اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ مجھے تو لطف ہی آ گیا تھا لیکن عاشر معمول کے مطابق نمس تھا۔ میں نے راستے میں کئی بار بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہوں، ہاں سے آگے نہ بڑھا تو مجھے چڑ ہو گئی۔

عاشر کی امی نے بڑے پیار سے مجھے گلے سے لگایا تھا۔ تینوں بہنیں مجھ سے ایسے لپٹ گئی تھیں جیسے بچپن سے مجھے جانتی ہوں۔ تمام لوگ اتنے محبت کرنے والے تھے۔ پتا نہیں ان کے درمیان عاشر جیسا بور شخص کہاں سے آ گیا تھا۔

''ہم کیسے یاد آ گئے خالہ جان۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں بھولتا کون ہے بیٹی۔ تمہیں دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔ بس میں نے ہمت کر لی۔''

''اس میں ہمت کی کیا بات تھی۔ آپ بس ایک فون کر دیتیں۔''

''اب یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی؟''

''میں شام کو چائے پی کر چلی جاؤں گی۔ رات کو دیر تک رکنے کی اجازت نہیں ملے گی۔'' میں نے کہا پھر جلدی سے بولی۔ ''کسی دن جلدی آؤں گی اور دوپہر کا کھانا کھا کر جاؤں گی۔''

عاشر کی بہنوں سے گپ شپ کا موقع ملا تو میں نے عاشر کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ پھر شام ہو گئی۔ چائے کے ساتھ زبردست لوازمات پھر میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیں خالہ جان۔ ابو کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ عاشر مجھے چھوڑ دیں گے۔''

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔" خالہ جان نے کہا۔

اصل میں اس میں میری بھی چالاکی تھی۔ ابو سے ذرا بھی بات کی تو وہ مجھے لینے چلے آئیں گے جبکہ میں عاشر کے ساتھ سفر کرنے کا ایک اور موقع نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ راستے میں' میں نے کہا۔

"مسٹر آپ کا چپ شاہ کا روزہ کب کھلے گا۔"

"بس کھلنے والا ہے۔" عاشر نے کہا مجھے اس شوخ جواب کی اُمید نہیں تھی۔

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔

"مس ونیزہ' آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"مس ونیزہ۔ اللہ اکبر۔ لگتا ہے لکھنؤ کی تہذیب کے رکھوالے کے طور پر آپ اس دنیا میں تنہا رہ گئے ہیں۔ مس ونیزہ۔۔۔ مس ونیزہ۔۔۔ واہ' میں نے کہا۔

"لوگ لکھنؤ ہی کی تہذیب کا حوالہ کیوں دیتے ہیں۔ خواتین کا احترام تو ہمارے پاکستان کی' ہمارے مذہب کی ثقافت ہے۔"

"ارے واہ۔ آج تو بلبل ہزار داستان کا کوئی باب کھل گیا ہے۔ یہ آواز پہلی بار کانوں میں پڑی ہے۔" میں نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میرا سوال ادھورا رہ گیا۔" عاشر نے کہا۔

"کون سا سوال؟"

"جو میں نے آپ سے پوچھا تھا۔"

"پلیز ایک بار دوبارہ۔" میں نے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ پلیز سنجیدگی سے بتایئے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"آپ کو مجھ پر اعتماد ہے۔؟"

"آپ نے واقعی مجھے سنجیدہ کر دیا ہے۔ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ میرے رکھوالے ہیں۔ میرے محسن ہیں۔ آپ نے ہمیشہ میرے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے۔ آپ میرے۔۔۔ آپ میرے۔۔۔" میری زبان رُک گئی۔ نہ جانے آگے میرے منہ سے کیا نکلنے والا تھا۔

"اگر میں آپ کو کہیں بلاؤں۔ میرا مطلب ہے تنہا تو آپ آجائیں گی۔"

"ضرور آجاؤں گی۔ ہر بار۔" میں نے کہا لیکن میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔

"آپ یہ نہیں سوچیں گی کہ میں تنہا آپ کو کیوں بلا رہا ہوں؟"

"بات حیران کن ضرور ہوگی لیکن تشویشناک نہیں کیونکہ مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔"

"تب پھر آپ گھر میں کسی کو بتائے بغیر کہ میں نے آپ کو بلایا ہے کل شام سات بجے نیشنل پارک کے اسٹاپ پر آسکتی ہیں۔۔۔؟"

"مجھے ذرہ برابر بھی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو حالات ہوئے ہیں ان کے تحت پھوپھی جان نے ہدایت کی ہے کہ مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلا کروں۔"

"آپ ایسا کرسکتی ہیں کہ چار پانچ بجے اپنی دوست رافعہ کے گھر چلی جائیں۔ اپنے ڈرائیور سے کہیں کہ وہ ساڑھے آٹھ بجے آکر لے جائے لیکن آپ ساڑھے چھ بجے ٹیکسی لیکر نیشنل پارک پہنچ جائیں۔ میں وہاں سے آپ کو پک کرلوں گا۔ یہ ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کرلوں گی۔" میں نے کہا۔

"آپ یہ نہیں سوچیں گی کہ میں آپ کو تنہا کیوں بلا رہا ہوں؟"

"اس سے انکار نہیں کروں گی لیکن اس بات پر بھی یقین کرلیں کہ صرف تجسس ہوگا۔ اس میں اور کوئی سوچ شامل نہیں ہوگی۔"

"یقین کرلیا۔" اس نے مسکرا کر کہا اور میں نے پہلی بار اسے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھا اور سوچا" کہ وہ لوگ کس قدر دلکش لگتے ہیں جو کبھی کبھی مسکراتے ہیں۔"

☆......☆......☆

انسان بھی کمال کی چیز ہوتا ہے ایک لٹیرا میرا پرس لیکر بھاگا دوسرے لٹیرے نے اس سے پرس

چھین کر مجھے واپس کر دیا لیکن اس نے اتنا بڑا ڈاکہ مارا کہ میری دنیا ہی لوٹ لی۔ عاشر نے میرا دل ہی لوٹ لیا تھا۔ میرا سینہ خالی کر دیا تھا اور اب اس نے مجھے ایک عجیب و غریب دعوت دے ڈالی تھی۔

''کیوں؟ کہاں؟''

رات بھر سوتی جاگتی رہی۔ عجیب و غریب خواب نظر آ رہے تھے۔ کوئی بات بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن ایک بات ضرور تھی مجھے اس پر مکمل اعتماد تھا۔ مکمل اعتماد۔۔۔۔۔

ناشتے کی میز پر پھوپھی جان اور ابو موجود تھے میں نے کہا ''ابو میں شام کو رافعہ کے گھر جاؤں گی۔''

''ہوں۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ہمراہ آؤٹ آف سٹی گئی ہے۔''

''آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''او کے۔ ٹھیک ہے۔''

''آپ چار بجے کار بھیج دیں۔''

چار بجے کار آ گئی' میں تیار بیٹھی تھی۔ رافعہ کو میں نے فون کر دیا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کار سے اترتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ وہ ساڑھے آٹھ بجے آ جائے۔ رافعہ سے میں باتیں کرتی رہی۔ اسے تقریباً چند ضروری باتوں کے علاوہ۔۔۔ سب کچھ معلوم تھا لیکن میں نے اس وقت کی بات اسے نہیں بتائی تھی۔ البتہ میری کیفیت کو محسوس کر کے اس نے کہا۔

''کوئی خاص بات ہے وینزہ۔''

''کیوں؟'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''تم بات کرتے کرتے کھوسی جاتی ہو' جیسے کوئی اور سوچ تمہیں اُلجھائے ہوئے ہے۔''

''کچھ نہیں یار۔۔۔ تمہارا وہم ہے۔ مجھے سات بجے ضرور گھر پہنچنا ہے۔ تم مجھے ساڑھے چھ بجے ٹیکسی منگوا دینا۔''

''کار نہیں آئے گی۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابو کسی کام سے جائیں گے۔''

ٹھیک ساڑھے چھ بجے رافعہ نے اپنے چھوٹے بھائی سے ٹیکسی منگوائی اور میں رافعہ کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑی۔ کمبخت دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''کیوں بلایا ہے اس نے۔ کیوں بلایا ہے؟''

میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے نیشنل پارک پر اُتار دیا۔ میں نے ڈرائیور کو پیسے دیئے پھر چاروں طرف دیکھا۔ کچھ ہی فاصلے پر عاشر ایک خوبصورت لباس میں ملبوس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے قریب ایک ہنڈا سٹی کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھ گئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''شکریہ۔'' یہ کہہ کر آگے والی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ یہ بھی میری ذات پر اعتماد کا اظہار تھا میں بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اندر بیٹھ گئی اور عاشر دوسری طرف آ کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

مجھ پر خواب جیسی کیفیت طاری تھی۔ گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ عاشر کار چلا رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی اپنے کے ساتھ جا رہی ہوں۔ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ کیوں لے جا رہا ہے؟ مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔

کار کہاں کہاں سے گزری' عاشر کی کیفیت کیا ہے؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر یہ سفر رہا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں تو اس وقت چونکی جب کار ایک طرف جا کر رُکی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کسی کمپنی کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ کافی صاف ستھرا علاقہ تھا اور نیا نیا آباد ہوا تھا۔ زیادہ تر گھر خالی پڑے ہوئے تھے۔

''آیئے۔'' عاشر نے کہا اور میں اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ چند قدم چل کر ایک بند گھر کے دروازے پر رُکا جیب سے چابی نکالی' لاک کھولا اور دروازہ کھول کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر تاریکی تھی۔ عاشر نے سوئچ آن کر کے روشنی کر دی۔

بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک ڈبل بیڈ چار کرسیاں اور سینٹر ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ بیڈ پر ایک سادہ سی چادر بچھی ہوئی تھی اور دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔

میرے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ کیا انوکھی کیفیت تھی۔ ایک خالی گھر کا کمرہ۔ دور دور تک کسی انسان کا وجود نہیں تھا اور ایک نوجوان لڑکی ایک ایسے نوجوان لڑکے کے ساتھ جس پر اسے اعتماد تھا لیکن گنجائش تھی۔

"بیٹھیے وینیزہ۔"

میں کوئی جواب دیئے بنا بیٹھ گئی۔ عاشر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور لائٹر سے اسے جلایا۔ میں نے حیرت سے یہ عمل دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے عاشر کو کبھی سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

عاشر نے ماہرانہ انداز میں سگریٹ کے دو تین گہرے گہرے کش لئے۔ پھر اس کی گھمبیر آواز ابھری۔

"مجھے افسوس ہے وینیزہ کہ مجھے اس انداز میں آپ کو یہاں لانا پڑا لیکن میں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں وہ آپ کے اور عابدی صاحب کے حق میں بہترین ہے۔"

عاشر رُک گیا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر میں نے سگریٹ کے دھوئیں کو منتشر کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ دھواں بُرا لگ رہا ہے۔"

عاشر نے ایک لمحے توقف نہ کیا اور سگریٹ بجھا دی۔

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

"یہ بات کوئی دس ماہ پہلے کی ہے، جب کنسٹرکشن کی ایک فرم دلاور بلڈرز نے اپنے جنرل منیجر کیلئے ایک پرسنل اسسٹنٹ کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا۔ دوسرے بہت سے امیدواروں کی طرح میں نے بھی درخواست بھیج دی اور مجھے بھی انٹرویو کیلئے بلایا گیا۔

میں ان دنوں بیروزگار تھا اور مجھے شدت سے نوکری کی ضرورت تھی۔ لاتعداد انٹرویو دیئے گئے تھے۔ لیکن ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ زندگی ایک تلخ تجربہ سے دوچار ہو رہی تھی جبکہ ضرورتوں نے خودکشی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ خیر۔۔۔ میں دلاور بلڈرز پہنچ گیا۔ وہاں امیدواروں کا زبردست ہجوم تھا۔ فرم کے جنرل منیجر دلاور خان صاحب خود انٹرویو لے رہے تھے۔ امیدوار اندر جا رہے تھے اور منہ لٹکائے واپس آ رہے تھے پھر میری باری آ گئی۔ دلاور خان صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور میری درخواست کی طرف دیکھ کر بولے۔

"نام؟"

"عاشر احمد۔"

"والد کا نام؟"

"فاروق احمد۔"

"کہاں نوکری کی ہے؟"

"کہیں نہیں۔"

"کوئی تجربہ؟"

"جی۔ کوئی نہیں، انٹرویو دینے اور ناکام رہنے کا تجربہ ہے۔"

"والد کیا کرتے تھے؟"

"پاکستان کنسٹرکشن کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔" میں نے کہا اور میں نے دلاور خان کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے میری درخواست پر دوبارہ نظریں دوڑائیں۔ کچھ سوچا پھر بولے۔

"آپ کا یہی ایڈریس ہے جو درخواست میں لکھا ہے۔"

"جی۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" دلاور خان نے کہا۔ پھر بولے۔

"سنو، یہ وہی فاروق احمد تھے جنہیں کمپنی میں ایک بڑے غبن کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا اور انہوں نے جیل میں خودکشی کرلی تھی۔"

"جی ہاں۔ اس قتل کا اعزاز انہیں ہی حاصل ہے۔ جس کے بارے میں بعد میں تصدیق ہوئی تھی

کہ وہ بے گناہ تھے اور غبن اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ نے کیا تھا۔''

''بالکل۔۔۔بالکل۔۔۔لیکن تم نے اپنے باپ کے بارے میں کیوں خاموشی اختیار کر لی۔''

''اس وقت میں گیارہ بارہ سال کا تھا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن انڈین فلموں کی طرح تم قسم بھی تو کھا سکتے تھے کہ ابا میں تیرے خون کا بدلہ لوں گا۔ میں تیرے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ خیر۔۔۔تم یوں کرو' پہلی تاریخ کو میرے پاس آجانا' میں منیجر کو بتا دوں گا۔''

مجھے لگا جیسے مجھے نوکری مل گئی اور میرا خیال ٹھیک تھا۔ مجھے نوکری مل گئی' دلاور خان صاحب کی پوری توجہ مجھ پر تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے موٹر بائیک خرید کر دی تھی اور ہر آسانی فراہم کر دی تھی جبکہ مجھے کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اکثر وہ میرے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ موضوع میرے والد ہی ہوتے تھے جنہیں بے گناہ مار دیا گیا تھا۔''

''اور پھر عابدی۔۔۔پاکستان کنسٹرکشن کے نام پر لوگوں کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ انتہائی قابل افسوس ہے۔ تم شائد تصور بھی نہ کر سکو کہ اس نے کیا کیا' کیا ہے۔'' دلاور صاحب نے کہا۔

''کیا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کئی جعلی کمپنیوں کے نام پر لوگوں سے کروڑوں روپیہ وصول کیا ہے اور پھر یہ جعلی کمپنیاں اچانک غائب ہو جاتیں۔ ان کے فرضی مالکان کے بارے میں اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ وہ لندن' امریکہ' دوبئی وغیرہ فرار ہو گئے۔ اُف میرے خدا کتنا چالاک انسان ہے وہ۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد کوئی اور کمپنی معرض وجود میں آجاتی ہے۔''

''دلاور خان نے عابدی صاحب کے بارے میں میرے سینے میں آگ بھر دی تھی۔ پھر کچھ دن پہلے مجھے بلایا اور سخت ملامت کرتے ہوئے کہا کہ میرے دل میں اپنے باپ کی موت کے انتقام کا کوئی جذبہ نہیں ابھرتا۔''

''میں کیا کروں جناب۔۔۔مجھ پر اپنی ماں اور بہنوں کا بوجھ ہے۔''

''وہ بالکل محفوظ ہیں اور پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ انتقام کی پیاس خون سے ہی بجھائی جائے۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''ان کی ساکھ' ان کے منصوبوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس طرح تمہاری حقیقت بھی بدل سکتی ہے۔ تمہیں کم از کم پانچ کروڑ کے منافع کی گارنٹی میں دے سکتا ہوں۔ یہ رقم میں تمہیں اپنے ہاتھ سے ادا کروں گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ عابدی صاحب کی کنسٹرکشن کمپنی دھوکے بازی اور فراڈ سے حکومت اور عوام دونوں کو بیوقوف بناتی رہی ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ دو ارب روپے کی لاگت سے متوسط طبقے کے لئے رہائشی فلیٹوں کا ایک عظیم منصوبہ زیر غور ہے۔ اس سلسلے میں جلد ہی ٹینڈر طلب کئے جانے والے ہیں۔ اگر یہ کنٹریکٹ پاکستان کنسٹرکشن کے بجائے دلاور کنسٹرکشن کو مل جائے تو حسن عابدی کیلئے اس سے بڑی شکست اور کوئی نہیں ہوگی۔ اسے کم از کم نوے کروڑ کا نقصان پہنچے گا اور یہ فائدہ ہمیں حاصل ہوگا۔ میں اس میں سے پانچ کروڑ تمہیں دوں گا۔''

''مجھے کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیونکہ یہ منصوبہ تمہارے ذریعہ ہی تکمیل کو پہنچے گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں بتاتا ہوں'' دلاور صاحب نے کہا پھر جو منصوبہ انہوں نے مجھے بتایا اسے سن کر میرے دماغ میں ٹھک ٹھک ہونے لگی۔ صاف پتا چل گیا کہ دلاور خان میرے کندھے پر بندوق رکھ کر شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی اور اپنی کمپنی کی ایمانداری کا ڈھول پیٹ کر اصل میں سب کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ ورنہ ان کی سوچ بھی اتنی ہی پست اور گندی ہے جتنی کسی

مجرم مل سکتی ہے۔
مجھے برق رفتاری سے فیصلہ کرنا تھا۔ اپنے ہوشیار ہو جانے کا تذکرہ کر کے میں اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے دلاور صاحب۔ میں تیار ہوں۔''
میرے تیار ہونے سے دلاور خان بہت خوش ہوئے لیکن میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ یہ کہ عابدی صاحب کو بھی قریب سے دیکھوں اور یہ معلوم کروں کہ میرے والد کی بے بسی کی موت میں ان کا کتنا ہاتھ ہے اور اگر موقع مل جائے تو ان دونوں میں سے کسی ایک کو قانون کے حوالے کروں۔
میں سانس روکے یہ عجیب کہانی سُن رہی تھی اور میری آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا اور پھر میں نے بمشکل زبان کھولی۔
''وہ منصوبہ کیا تھا؟ آپ مجھے بتائیں گے۔''
''وہ بتانے جا رہا ہوں۔ منصوبہ یہ تھا کہ ٹینڈر جمع کرانے کی آخری تاریخ سے ایک دن قبل آپ کو اغوا کر لیا جائے اور عابدی صاحب کو دھمکی دی جائے کہ اگر وہ اپنی بیٹی کی زندگی چاہتے ہیں تو۔۔۔ ٹینڈر داخل نہ کریں۔''
''تو۔۔۔ تو۔۔۔ آپ۔۔۔ اوہ میرے خدا'' میرے منہ سے رندھی آواز نکلی۔
''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ جلدی نہیں۔۔۔ جلدی نہیں۔۔۔ پہلے پوری بات سُن لیں۔'' عاشر نے نہایت سکون سے کہا۔ پھر بولا۔
''اور دلاور خان نے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا وہ کمال کا تھا یعنی عابدی صاحب کی بیٹی اغوا بھی ہو جائے اور وہ یہ بھی ثابت نہ کر سکیں کہ اسے اغوا کیا گیا تھا بلکہ بظاہر لگ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی تھی۔''
''اپنی مرضی سے......؟'' میں پھر چیخ پڑی۔
''دھیرج...... دھیرج...... دھیرج...... سنیں تو سہی پوری بات۔'' عاشر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اور میں غصے سے اسے دیکھنے لگی۔
''جی فرمایئے۔'' میں نے طنز سے کہا تو عاشر پھر ہنس پڑا۔
''عرض کیا ہے'' وہ شرارت سے بولا'' اس منصوبے کا پہلا دن وہ تھا جس دن وہ جعلی اُچکا آپ کا پرس لے کر بھاگا تھا اور ایک بہادر نوجوان نے آپ کا وہ پرس لا کر آپ کو دیا تھا۔ وہ اُچکا بھی دلاور خان کا آدمی تھا اور میں بہادر نوجوان۔''
''عاشر......'' میں رونے والی تھی۔
''نہیں...... آزردہ نہ ہوں۔ میں دلاور خان کا آلہ کار نہیں بنا تھا۔ میں صرف اپنے منصوبے پر کام کر رہا تھا میں حقائق کو روشنی میں لانا چاہتا تھا اور اس پر کام کر رہا تھا۔ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ اغوا کا ڈراما بھی صرف ڈراما تھا۔ دلاور خان کے منصوبے کے مطابق مجھے آپ کے محسن کی حیثیت سے آپ کے قریب ہونا تھا۔ اس کے بعد دوسرا عمل یعنی گولیاں کھانا۔''
''تت...... تو...... تو......'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔
''مجھے اس کیلئے بھاری معاوضے کی پیش کش کی گئی تھی جو میں نے قبول نہیں کی لیکن میں یہ معلوم کرنے کیلئے آپ کے گھر میں ضرور داخل ہونا چاہتا تھا کہ میرے والد کے سلسلے میں عابدی صاحب واقعی اتنے سنگدل تھے یا...... اور...... میرا دل ان کی طرف سے صاف ہو گیا اور دلاور خان روشنی میں آ گیا۔''
''اور عمارہ...... کیا وہ بھی؟''
''سو فیصدی...... سارا کام ایک پلاننگ سے ہو رہا تھا۔ اس کا کام اتنا ہی تھا۔ وہ آپ سے دوبارہ کبھی نہیں ملے گی۔ ادھر میں اپنا کام کر رہا تھا۔ میں نے دلاور خان کے خلاف اپنا خفیہ کام شروع کر دیا تھا۔ جدید ایجادات نے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ چنانچہ دلاور خان کے آفس میں ہونے والی یہ خفیہ میٹنگ کی فلمیں اور ریکارڈنگ میرے پاس آ چکی ہے۔''
''اوہ میرے خدا...... اب...... اب کیا ہو گا؟''
''دلاور خان کو آپ کے اغوا کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ عابدی صاحب کو یہ دھمکی دینے کیلئے تیار ہے کہ ان کی بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہ ٹینڈر داخل نہ کریں۔''

"تب تو ..... تب تو آپ یہاں ....."

"نہیں ...... یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں منصوبے کے مطابق آپ کو لایا جانے والا تھا بلکہ اس جگہ کا بندوبست میں نے کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں بے اختیار بولی۔

"ہاں ...... یہ دوسری جگہ ہے جہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ دلاور خان کے مطابق یہ اس کا گرینڈ آپریشن ہے۔ جس میں اس کے بہت سے میرے جیسے سرگرم ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بھی آپ کو بچانا ضروری تھا۔"

مجھے یوں لگا جیسے تیز اور جھلسانے والی دھوپ میں چلتے ہوئے اچانک ٹھنڈی چھاؤں مل جائے۔

"میرا محسن۔ میرا دوست ......" میں نے کہا۔

"اب مجھے کیا کرنا ہے؟"

"مجھ پر بھروسا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

"اس کے بعد ......" میں نے بھی برجستگی سے کہا۔

"وہ ایک طویل پروسیجر ہے۔ فی الحال آپ کو یہاں کچھ گھنٹے گزارنے ہوں گے۔ یہ بالکل محفوظ جگہ ہے دلاور وغیرہ اپنے کام کیلئے تیار ہیں ممکن ہے کر بھی چکے ہوں لیکن مجھے نہ پاکر ان کے حواس گم ہو جائیں گے۔ میں آپ کو یہاں چھوڑ کر جاؤں گا اور ان کے خلاف آخری ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کو خطرہ نہیں ہوگا عاشر۔" میں نے تشویش سے کہا۔

"بہت زیادہ۔ لیکن اگر آپ خلوص دل سے دعا کریں تو پھر کوئی پرواہ نہیں ہے۔" وہ شرارت سے بولا اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اللہ آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔"

☆......☆

خالی گھر مجھے کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ عاشر اس کار میں چلا گیا تھا جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ دلاور خان نے اسے دی تھی۔ میں اس لمحے کو یاد کر رہی تھی جب عاشر مجھے ملا تھا۔ اس کا پرس واپس لانا' میرے گھر کے سامنے گولیاں کھانا۔

رات تو ایک بجے عاشر واپس آیا۔ اس کے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوشی ناچ رہی تھی۔

"مبارک ہو وینزہ۔ تمہارے اور تمہارے ابو کے سارے دشمن گرفتار ہو گئے اور ایسے گرفتار ہوئے کہ بس۔ مرتے ہوئے بھی یاد رکھیں گے۔"

"یہ پٹی کیسی ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"اصلی ہے۔ قسم لے لو۔"

"مذاق مت کرو پلیز۔" میں نے کہا اور عاشر نے مجھے بتایا کہ کس طرح انہوں نے دلاور خان کی کوٹھی کی خفیہ تجوری سے اس کے خلاف ثبوتوں کے تمام فائل حاصل کر کے انتہائی اعلیٰ حکام تک پہنچائے۔ اس کے لئے اسے یہ کھانی پڑی۔

"لیکن دلاور خان کے ستارے ہی گردش میں تھے۔ اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کی توہین کی تھی اور اتفاق سے میری اس افسر سے ملاقات ہوئی چنانچہ سارا کام ہو گیا۔"

"یہ کیا اصلی نقلی لگا رکھی ہے۔" میں نے کہا۔

"آؤ ...... اب چلیں۔"

جس وقت میں اپنی کوٹھی میں داخل ہوئی وہاں تیز روشنیاں ہو رہی تھیں۔ پھوپھی جان غشی میں پڑی تھیں۔ ابو ہاتھ میں تسبیح کھیل رہے تھے۔ سارے ملازم اور سب سے بڑی بات یہ کہ رافعہ اور اس کے گھر والے بھی موجود تھے۔ یہاں باقاعدہ روحانی رت جگا منایا جا رہا تھا۔

پھر جو خوشیوں کا طوفان آیا' اس کا ذکر ہی ممکن نہیں۔ ہاں اس طوفان میں بہتی ہوئی میں عاشر کے حجلہ عروسی میں پہنچ گئی۔ بس ان کی لاٹری میں ...... میں نکل آئی تھی۔

"قسم کھاتا ہوں میں اصلی ہوں۔ چاہو جیسے یقین کر لو۔" عاشر نے میرا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایں ...... ہاں ...... لگ تو رہے ہو۔" میں نے شرم و حیا بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا اور اس کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔

☆☆☆

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 19

صنوبر کا اقرار سارے گھر کے لیے ایک ایسا معمہ بن گیا جسے سلجھائے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ابھی فارس کا باپ خوشی سے دیوانہ ہوتا کہ درشہوار کے سوچتے ہوئے چہرے پر پھر ایک سوال کی سی کیفیت ابھری اس نے اپنے شوہر آصف کی طرف دیکھا جس کے چہرے کو ایسی حیرت نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا جہاں یقین اور بے یقینی میں سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ آصف کو عام حالات میں اس رشتے سے ایسی کوئی پرخاش بھی نہیں تھی کہ وہ بلاوجہ رحمٰن یزدانی کو اپنے گھر سے مایوس کرتا بلکہ اسے شرجیل اور صنوبر کے بارے میں درشہوار سے سب کچھ پتا نہ چل گیا ہوتا تو وہ اس رشتے پر باقاعدہ خوش ہوتا کیونکہ کاروباری حلقوں میں کوئی بات کسی سے چھپی نہیں رہتی اور آصف اچھی طرح جانتا تھا کہ شرجیل کا باپ سرفراز تو خود رحمٰن کا دستِ نگر ہے اس کا سارا بزنس رحمٰن کے پاس ایک طرح سے گروی پڑا ہوا ہے اور رحمٰن چاہتا تو سرفراز سے زبردستی بھی اپنے بیٹے کے راستے سے ہٹانے کے لیے زور ڈال سکتا تھا۔ جس ہوشیاری سے رحمٰن نے سرفراز کے بزنس کو اپنے کنٹرول میں لیا تھا اس کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں تمام حلقوں اور چیمبر میں گردش کرتی رہتی تھیں لیکن آصف اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔ اس نے کبھی ان باتوں کو سننے کے بعد ان پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن رحمٰن کی کاروباری ساکھ اور پوزیشن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ تاہم اس کے باوجود آصف کو اپنی اولاد خصوصاً اپنی بیٹی صنوبر سے بہت پیار تھا۔ اتنا پیار کہ کوئی باپ اپنی بیٹی سے کم ہی کرتا ہے اسی لیے اس نے ابتدا سے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کی مرضی سے زندگی گزارنے کا پورا حق دے گا۔ عموماً جو لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے سلوک سے نہیں رہتے وہ اپنی بیٹیوں سے لازمی محبت کرتے ہیں۔ ایسا اکثر سننے اور دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ چنانچہ صنوبر نے جب شرجیل کے حق میں فیصلہ کیا تو آصف نے اس کے باوجود اپنی بیٹی کے اس فیصلے کو دل سے تسلیم کر لیا تھا کہ سرفراز کی کاروباری پوزیشن اتنی اچھی نہیں تھی اور اس کا مستقبل رحمٰن کے ہاتھوں میں تھا رحمٰن جب چاہتا اسے سڑک پر لاسکتا تھا لیکن رحمٰن بہت ہوشیار بھی تھا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر رہا تھا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے بزنس کی دنیا کو لے کر چلنے کا ہنر معلوم تھا۔ سرفراز کے ساتھ کچھ بھی برا کرنے کا مطلب ہے اس کی اپنی ساکھ بھی بری طرح متاثر ہو سکتی



ہے۔ اس لیے وہ بہت احتیاط اور ذمہ داری سے سارا کاروبار چلا رہا تھا۔ آصف کے لیے صنوبر کا فیصلہ ایک لمحے کو حیرانی کا باعث بنا تو دوسرے ہی لمحے اسے ایسا لگنے لگا کہ کہیں صنوبر کسی قسم کے دباؤ میں تو نہیں ہے۔ اُسے یہ فیصلہ کچھ ہی لمحوں میں اپنی بیٹی کی مرضی سے زیادہ اپنی ہتک معلوم ہونے لگا جیسے اس کی بیٹی نے ایک ہی پل میں اسے رحمن کے سامنے نیچا دکھا دیا ہے۔ اس نے درشہوار کی طرف دیکھا جو ایسے گم صم بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو وہ اس وقت چونکی جب آصف نے وہاں رحمن سے کچھ دیر کا ایکسکیوز کیا اور خود اپنی بیٹی کا درست جواب معلوم کرنے اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ پیچھے پیچھے درشہوار بھی آ گئی۔ آصف کمرے میں پہنچا تو صنوبر ایک کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی دور کہیں آسمانوں کی طرف ایسی بے چارگی سے دیکھ رہی تھی جیسے دل ہی دل میں آسمان والے سے شکوہ کناں ہو کہ اس نے اس کے اور اس کے دل کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

''بیٹا صنوبر.....'' آصف کی آواز پر چونکی اور اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو جلدی سے ٹھیک کیا مگر اس کے باپ نے دیکھ لیا کہ بیٹی رو رہی ہے۔ آصف اس کے قریب گیا اور اس کو اپنے سینے سے لگا کر بولا۔

''میں جانتا ہوں تم کیوں رو رہی ہو۔ لیکن بیٹا یہ جو تم نے ابھی اپنی ماما کو بتایا ہے یہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہے۔ اس طرح اپنی مرضی اور اپنے دل کے خلاف کوئی بھی فیصلہ کرنا زندگی بھر کے لیے پچھتاوا بن جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔ تم نے کیوں ایسا فیصلہ کیا ہے جو تم دل سے نہیں چاہتیں؟''

جواب میں کچھ دیر تک صنوبر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ درشہوار نے اس کے قریب آ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''میں نے بھی تم سے کتنی بار پوچھا بیٹا کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو مگر تم نے مجھے تو رو کر بھی نہیں دکھایا۔ اسی لیے میں نے تمہارے پاپا اور رحمن سے کہہ دیا کہ تم اس شادی پر راضی ہو لیکن اب میں جو دیکھ رہی ہوں اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا کہ تم نے یہ فیصلہ کسی ذہنی دباؤ کے نتیجے میں کیا ہے۔'' درشہوار اور آصف نے اسے دیر تک حوصلہ دیا اور پھر جب وہ پانی پینے کے بعد کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تو انھوں نے اس کے اس فیصلے کے بارے میں جاننے پر اصرار کیا۔

''میں یہ فیصلہ کسی ذہنی دباؤ کی وجہ سے نہیں کر رہی پاپا۔ مجھے اگر شادی کرنا ہے تو وہ کسی سے بھی ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا تو آپ مجھے یہ یقین دلا دیں کہ مجھ سے ساری زندگی شادی کرنے کو نہیں کہیں گے تو میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ورنہ کسی سے بھی شادی ہو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' صنوبر نے کہا تو سپاٹ لہجے میں تھا مگر اس کے دل کے مرجھانے کی آواز کو دونوں نے سنا اور محسوس بھی کیا۔

''لیکن تم تو بیٹا شرجیل سے محبت کرتی ہو اسی سے شادی بھی کرنا چاہتی تھیں پھر اب کیا ہوا؟'' درشہوار نے وہی سوال کیا جو آصف پوچھنے کا سوچ ہی رہا تھا۔

''میں اب اس دھوکے باز کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ اس نے ایک بار نہیں دو بار میرے اعتبار اور میری محبت کو دھوکا دیا ہے۔ پہلے بھی جب اس کے والد نے اسے مجبور کیا تھا تو وہ مجھے بنا بتائے ہی لندن چلا گیا تھا اور مجھ سے فون پر بھی اپنا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ میں روتی رہی دل ہی دل میں تڑپتی رہی میں نے اس کے سب ہی دوستوں اور ملنے والوں سے پوچھا لیکن مجھے کسی نے اس کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں ہر روز اس امید پر اسکول جایا کرتی تھی کہ وہ آج ضرور واپس آ گیا ہوگا۔ اس نے مجھے ایک فون کر کے اپنے بارے میں بتانا تو کجا دو حرف تسلی کے بھی نہیں کہے۔ پھر وہ پورے تین مہینے بعد واپس آیا مجھ سے ملا میں اسے دیکھ کر جیسے کھل اٹھی اس کے معافی مانگنے سے پہلے ہی میں اسے معاف کر چکی تھی کیونکہ میں اس کے لیے بہت تڑپی بہت روئی تھی۔ اس نے کہا میں اپنی محبت کو آزمانا چاہتا تھا۔ تم سے رابطہ کرتا تو میں اپنی محبت کے امتحان میں پورا نہیں اتر سکتا تھا کمزور پڑ جاتا اس لیے میں نے تم سے کوئی رابطہ

نہیں کیا۔ اس کی یہ ڈیل پاور کی غلطی تھی مگر میں نے ایکسیپٹ کر لی اور اسے معاف کر دیا۔ کیا محبت صرف وہی کرتا ہے۔ میں نہیں کرتی...... تو پھر وہ کوئی بھی فیصلہ اکیلے کیوں کرتا ہے۔ جیسے میں تو اس کی زندگی میں شامل ہی نہیں ہوں۔ اب اس نے پھر ایسا ہی کیا ہے۔ اسے کہیں بھی جانا تھا وہ مجھے بتا کر تو جا سکتا تھا۔ میں کیا اسے روک لیتی اگر روکنا بھی چاہتی تو کم سے کم مجھے پتا تو ہوتا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا۔ اس نے دوسری بار مجھے بے قیمت اور ایسا بنا دیا ہے کہ میں اپنی نظروں میں گر گئی ہوں۔ سب میری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے کسی کو پتا ہو نہ پتا ہو مگر مجھے ضرور پتا ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟ لیکن اس نے مجھے اس قابل سمجھا ہی کب ہے۔ میں اب اسے کبھی معاف نہیں کروں گی.... کبھی بھی نہیں....''

اتنا سب کہہ کر وہ پھر سے زار و قطار رونے لگی۔ درشہوار نے اسے سینے سے لگایا تو کچھ ہی دیر میں وہ سسکیاں بھرتے ہوئے ایسی ہو گئی جیسے بے ہوش ہو گئی ہو مگر وہ دراصل گہری غنودگی میں جا چکی تھی۔ دونوں نے مل کر اسے بیڈ پر سلا دیا اور ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آصف بولا۔

''تم فکر مت کرو میں جا کے رحمن کو سمجھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر آصف ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا اور درشہوار وہیں اپنی بیٹی کے پاس بیٹھ کر اس کی طرف ایک قسم کی گہری محبت اور انسیت سے دیکھنے لگی اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھ بھی آصف نے ساری زندگی ایسا ہی کیا تھا کبھی اسے اس کا جائز مقام اور حیثیت نہیں دی ہمیشہ ایسا سمجھا جیسے میں تو اس کی زندگی میں بس ایک روٹین کی چیز ہوں اگر مجھے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو فرق کیا پڑتا ہے۔ اب ایسا ہی سلوک اس کی بیٹی کے ساتھ شرجیل کر رہا تھا تو کیا اس کی بیٹی بھی ایسی ہی زندگی گزارنے والی ہے جیسی اس نے گزاری ہے۔

وہ سوچتی رہی اور خود سے سوال و جواب کرتی رہی لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اگر صنوبر کی شرجیل سے شادی نہیں ہوئی تو کیا وہ کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ اور اگر شرجیل سے شادی ہو گئی اور اس نے صنوبر کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اس کے ساتھ آصف نے کیا ہے تب کیا صنوبر کو زندگی سے وہ خوشیاں مل سکیں گی جو ایک عورت کو ہمیشہ چاہیے ہوتی ہیں۔ جن کی وہ توقع کرتی ہے۔ جن کے وہ خواب بنتی ہے۔ تو کیا فارس سے شادی کر کے وہ خوش ہوگی۔ فارس جانتا ہے کہ وہ اس سے نہیں بلکہ شرجیل سے محبت کرتی ہے تو کیا ایک مرد شادی کے بعد کسی ایسی عورت کو خوش رکھ سکتا ہے جس کے بارے میں اسے پہلے سے معلوم ہو کہ اس کے دل اور روح پر کسی اور کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مرد بھی اتنے فراخ دل نہیں ہوتے یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ الجھتی رہی مگر اسے اپنی بیٹی کے لیے کوئی ایسا راستا نظر نہیں آیا کہ وہ جس پر چلنے کا وہ اپنی بیٹی کو مشورہ دے سکے۔ تب ہی اس نے سوچا کہ کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں وہ عورتیں جنھیں محبت نے کبھی نہیں چھوا کبھی نہیں ہوتا وہ کھاتی ہیں۔ اچھے سے اچھا پہنتی ہیں میاں کے پیسوں پر خوب عیش کرتی ہیں اور جی بھر کے شو آف کرتی ہیں۔ پارٹیوں میں جاتی ہیں اور دن رات اپنی زندگی میں مگن رہتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے شوہر اگر کوئی افیئر بھی چلائیں تو وہ ان عورتوں کی طرح جل جل کے نہیں مرتیں جو اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں۔ محبت کے بنا زندگی کا تصور کتنا ہی ویران اور دکھ دینے والا کیوں نہ ہو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبت بھی دکھ کا دوسرا نام ہے۔ اس کی بیٹی کو محبت کا ناگ ڈس چکا ہے اور اب اس کی زندگی کو حقیقی خوشیوں سے آباد کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس کی زندگی کانٹوں کی سیج اور اپنی حیثیت کے مسلے کچلے جانے سے عبارت ہے۔

درشہوار کی آنکھیں خود بخود ساون برسانے لگیں وہ خود کو ایک ایسی بے بس انسان محسوس کر رہی تھی جس کے سارے اختیارات یکا یک چھین لیے گئے ہوں۔ اتنی بے بسی تو اسے اپنے معاملے میں بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح آصف سے اپنا کچھ نہ کچھ حق تو وصول کر ہی لیتی تھی لیکن یہ تو اس کی بیٹی کا معاملہ تھا۔ اپنے درد کے

مقابلے میں کسی اور دوسرے کا درد دور کرنا کتنا مشکل ہے یہ اسے آج پتا چلا۔ اور وہ دوسرا اس کا اپنا خون، اپنی اولاد، اپنی بیٹی ہو تو یہ مشکل کتنی بڑی مشکل بن جاتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ابھی سوچوں کے الجھے ہوئے جنگلوں میں بھٹک رہی تھی کہ اس نے دیکھا اس کا شوہر آصف دروازے سے داخل ہوا۔

''ابھی سو رہی ہے۔ چلو اچھا ہے اسے سونے دو۔ دماغ کو آرام ملے گا تو کچھ بہتر سوچنے کے قابل ہو سکے گی۔'' جیسے وہ خود سے باتیں کر رہا ہو۔ اس نے درشہوار کی طرف دیکھ کر اس سے بات نہیں کی تھی اس کی کلام کرنے کی یہی عادت تھے۔ درشہوار کی آصف کی اس عادت سے جان جاتی تھی وہ ہمیشہ جل بھن جاتی تھی لیکن جب سے اس نے اپنے بچوں کی پروا کرنا شروع کی تھی تب سے اسے آصف کی اس عادت کی کوئی خاص پروا نہیں رہ گئی تھی اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے آصف کا کسی اور دیکھ کر بات کرنا ذرا بھی برا نہیں لگا تھا۔ وہ بولی۔ ''تم نے رحمن کو کیا کہا؟''

آصف نے ایک لمحے کو شاید پہلی بار درشہوار کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اداسی گھل مل گئی اسے لگا کہ درشہوار کو اپنی بیٹی کا دکھ اس سے کہیں زیادہ ہے اسے اس بات پر کبھی یقین نہیں آیا تھا کہ درشہوار جیسی خود غرض عورت اس کے بچوں کے بارے میں اتنی حساس ہو سکتی ہے۔ لیکن آج لمحے بھر کو اس نے جو کچھ درشہوار کی آنکھوں اور چہرے پر دیکھا اس نے آصف کو جیسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ وہ دھیرے سے اس کے قریب آیا اور بولا۔

''تم رو رہی ہو درشہوار؟'' اتنا کہنا تھا کہ شہوار جھٹ سے آصف کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی وہ روتے ہوئے یہ کہتی جا رہی تھی۔

''میری صنوبر، میری بیٹی کو بچا لو آصف اس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے'' آصف نے اسے بہت دیر تک دلاسا دیا اور یقین دلایا کہ سب اچھا ہو جائے گا۔ ہماری صنوبر کو دیکھنا ایک اچھی زندگی جیئے گی جسے دیکھ کر تم ہمیشہ خوش رہا کرو گی۔ ہمیشہ۔'' یہ کہتے ہوئے خود آصف کی آنکھیں بھی جیسے نم ہو گئیں اور پھر وہ دونوں صنوبر کا سوتا چھوڑ کر نیچے آ گئے۔ صوفے پر قریب قریب بیٹھتے ہوئے درشہوار نے پھر پوچھا۔

''تم نے بتایا نہیں رحمن سے تم نے کیا کہا''

''کیا کہتا سمجھ میں ہی نہیں آیا میں جانتا ہوں صنوبر کی ہاں سننے کے بعد اب اگر میں اسے منع کروں گا تو وہ یہ ضرور پوچھے گا کہ میں نے تو کہا تھا کہ اپنی زندگی کا فیصلہ میری بیٹی خود کرے گی اب جب اس نے رحمن کے بیٹے کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے تو میں کیوں اس کے فیصلے کے راستے میں رکاوٹ بن رہا ہوں۔ ویسے بھی ایک کاروباری آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور محبت میں کبھی کبھی انسان اس طرح کے فیصلے کس ذہنی دباؤ میں کر جاتے ہیں۔ مجھے اس سے کہنا پڑا کہ ابھی وہ صنوبر کے فیصلے کو حتمی نہ سمجھے اسے تھوڑا وقت دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل وہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے لگے تو تمہیں دوسروں کے سامنے اور مجھے تمہارے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے اس لیے وہ اس بات کا اعلان کرنے میں جلدی نہ کرے۔ پتا نہیں کیسے مگر اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی اور وہ بولا ٹھیک کہتے ہو۔ مگر مجھے کوئی وقت تو تمہیں دینا ہی ہوگا کیونکہ میرا بیٹا اور میری بیوی جاتے ہی مجھ سے ایسے سوالات کرنے لگیں گے کہ مجھے انھیں کچھ تو ضرور بتانا ہی ہوگا۔''

میں نے کہا'' بہتر ہوتا کہ تم اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے آتے تو درشہوار یا وہ خود صنوبر سے مل کر پوچھ لیتیں تو انھیں صحیح صورت حال کا پتا چل جاتا پھر اس کے اصرار پر میں نے اسے ایک ہفتے کا وقت دے دیا ہے۔'' آصف یہ سب کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''صنوبر کا دل ٹوٹ چکا ہے اب اس کے علاوہ شاید ہم کچھ اور نہ کر پائیں کہ ہمیں رحمن کو ہاں میں جواب دینا ہوگا۔ اگر صنوبر بھی اس پر قائم رہتی ہے۔'' درشہوار نے قدرے دکھ سے کہا۔

''اور اگر شرجیل لوٹ آیا تو؟'' آصف نے وہ بات کہی جس کا جواب اسے صنوبر یہ کہہ کر دے چکی تھی کہ وہ اب کبھی اسے معاف نہیں کروں گی۔ ''کاش وہ لوٹ آئے مجھے یقین ہے کہ اسے دیکھنے کے بعد صنوبر اپنا فیصلہ بدل دے گی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ صنوبر کی شادی فارس سے ہو یا شرجیل سے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''فرق تو پڑتا ہے۔ شرجیل کو وہ دل سے چاہتی ہے اور فارس سے وہ کسی غصے اور کسی بدلے کے لیے شادی کر رہی ہے۔''

''میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ شرجیل کے ساتھ اب اسی صورت میں خوش رہ سکتی ہے جب آنے والے دنوں میں شرجیل ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے صنوبر کو اپنے نظر انداز کیے جانے کا احساس ہو۔ شرجیل اگر ہماری بیٹی سے محبت کرتا ہے تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

درشہوار نے کہا۔

''پتا نہیں یہ آج کل کے لڑکے اتنے لاپروا کیوں ہوتے ہیں۔ اسے کہیں بھی جانا تھا کیا وہ ایک فون کر کے بتا نہیں سکتا تھا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہو۔ کچھ لوگ اس کی جان کے پیچھے تو پڑے ہوئے تھے۔''

درشہوار نے کسی وسوسے کے زیر اثر یہ بات کہی۔

''اس پہلو پر میں نے بھی سوچا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے شک ہے کہ ہو نہ ہو یہ کام رحمٰن کا ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر مجھے لگا کہ رحمٰن ایک ہوشیار بزنس مین ہے وہ کیوں ایسی حماقت کرے گا کہ جس کے بارے میں کبھی کسی کو پتا چل گیا تو اس کا سارا کیریئر اور اس کا بزنس تباہ ہو سکتا ہے۔''

''جو بھی ہو اگر شرجیل واپس نہ آیا تو ہماری بیٹی برباد ہو جائے گی۔ کچھ کرو اور شرجیل کو کہیں سے تلاش کر کے لاؤ۔ مجھے یقین ہے وہ شرجیل کو اپنے سامنے دیکھے گی تو اس کا غصہ کچھ ہی دیر میں ختم ہو جائے گا اور وہ جو غصے اور بدلے میں خودکشی کرنے کا سوچ رہی ہے۔ رحمٰن کے بیٹے سے شادی کرنے کا مطلب خودکشی ہی ہے۔ میں اسے یہ کام بھی نہیں کرنے دوں گی۔'' درشہوار جذبات کے بہاؤ میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

''تم نے ذرا سی سمجھداری سے کام لیا ہوتا تو مجھے یوں دوہری مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔'' آصف نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

''میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے کیوں الزام دے رہے ہو؟'' درشہوار کا ذہن اس وقت واقعی یہ نہیں سوچ سکا کہ اس نے کیا غلطی کی ہے۔

''تم جانتی تھیں کہ ہماری بیٹی اس وقت کس مشکل ذہنی کیفیت سے گزر رہی ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ شرجیل سے محبت کرتی ہے اسی شادی کرنا چاہتی ہے اور جو کچھ اس نے تم سے رحمٰن کے بیٹے کے بارے میں کہا وہ اس کی وقتی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کی وجہ سے تھا پھر بھی تم نے وہاں آ کر یہ کہا کہ صنوبر اس رشتے کے لئے راضی ہے۔ اب میں کچھ بھی کر لوں وہ شخص یہ سمجھے گا کہ صنوبر تو چاہتی ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ وہ میرا دشمن ہو جائے گا جو میں نہیں چاہتا۔ مگر اس وقت کی صورت حال ہمیں اسی طرف لے کر جا رہی ہے کہ اگر شرجیل وقت پر نہیں پہنچا تو ہمیں صنوبر کی شادی رحمٰن کی بیٹے سے کرنا ہو گی۔'' آصف نے گہری پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور تب درشہوار کو احساس ہوا کہ آصف بالکل صحیح کہہ رہا ہے وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ اس کی یہ بات کون سے حالات کو جنم دینے کا باعث بنے گی تو خود حیرت نے دھکا دیا تھا کہ صنوبر کو کیا ہوا ہے وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے وہ جب کئی بار پوچھنے پر صنوبر اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی تو وہ سمجھی کہ اب اسے رحمٰن کو بتانا ہی ہو گا کیونکہ آصف اور رحمٰن میں کچھ اس قسم کی ٹینشن کھڑی ہو چکی تھی جیسے دونوں میں کوئی شرط لگ گئی ہو اور دونوں جلد سے جلد اس شرط کو جیتنا چاہتے ہوں۔ آصف کو

یقین تھا کہ اس کی بیٹی اس رشتے کے لیے کبھی ہاں نہیں کرے گی اور پتا نہیں کیوں رحمٰن کو بھروسا تھا کہ جیت کا اعلان اسی کے حق میں ہونے والا ہے۔ صنوبر نے جب فارس کا نام لیا تو درشہوار کی وہ خشونت ایک دم سے بیدار ہو کر اس کے دل کو گدگدانے لگی کہ اس معاملے میں آصف کی شکست ہونے والی ہے اور آصف سے اسے جو ازلی پرخاش تھی اسے شکست دینے کی جو چاہ تھی اس وقت وہ کس قیمت پر پوری ہو رہی تھی۔ اس نے کسی بھی بات کی پروا نہیں کی۔ اسے تو بس آصف کو ہارتے ہوئے دیکھنے کا جنون تھا اور اس جنون میں اس نے سمجھو تو اپنی بیٹی کی خوشیوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اب اسے اپنی نادانی کا احساس ہو رہا تھا۔ کہ اس نے اگر یہ غلطی نہ کی ہوتی تو اس وقت آصف اور اس کی صنوبر اس مشکل میں نہ ہوتے۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لیے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بیٹی اور شوہر کو اس نے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ اس کی اپنی سمجھ تو جیسے جواب ہی دے گئی تھی۔

''پھر اب کیا ہوگا آصف؟'' وہ خوفزدہ سی ہو کر بولی۔ اس نے اپنی غلطی کو مان کر اسے اور ہوا دینے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ جو ہو چکا ہے اب اس کو واپس تو نہیں لیا جا سکتا تھا۔

''پتا نہیں میرا تو ذہن جواب دے چکا ہے۔ اگر شرجیل واپس نہ آیا تو سمجھ لو ہمیں رحمٰن کے بیٹے سے شادی کو منظور کرنا ہی ہوگا۔'' اتنا کہہ کر اس نے سوتی ہوئی صنوبر کی طرف دیکھا اور بولا۔

''میں جا رہا ہوں تم جب یہ جاگ جائے تو اس سے مزید پوچھنا۔ ہو سکتا ہے اس کی رائے بدل چکی ہو۔''

''یہ بدل گئی تو کیا رحمٰن مان جائے گا!'' ایک ہلکی سی امید پر درشہوار نے پوچھا۔

''نہیں۔'' آصف نے گمبھیرتا سے کہا۔ ''اب ہم کچھ بھی کریں تمام حالات میں رحمٰن کو یقین نہیں آئے گا اور وہ یہی سمجھے گا کہ ہم نے زور زبردستی سے صنوبر کو انکار کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''اگر وہ ایسا سمجھتا بھی ہے تو کیا۔ ہماری بیٹی ہے ہماری مرضی ہے ہم اس کی جہاں چاہیں شادی کریں۔'' درشہوار نے چڑ کے کہا۔

''جتنا آسان تم سمجھ رہی ہو یہ اب اتنا آسان نہیں ہے۔ میں نے کہا نا وہ میرا دشمن بن جائے گا اس بات کا تو مجھے سو فیصد یقین ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر وہ شرجیل کے باپ کو کبھی بھی اس رشتے کے لیے ہاں نہیں کرنے دے گا۔ یہ بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ جب تک اسے امید نہیں تھی اس نے رشتا مانگنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر اب بات کچھ اور ہو چکی ہے۔'' اتنا کہہ کر آصف کمرے سے چلا گیا۔ اور درشہوار کے چہرے پر خوف لرزنے لگا۔ اس نے اسی حالت میں صنوبر کی طرف دیکھا، اس کی سوچوں کے مطابق تو شرجیل بھی اس کی بیٹی کے لیے دوسرا آصف ہی ثابت ہونے والا تھا لیکن فارس وہ تو کسی بھی صورت صنوبر کا جیون ساتھی نہیں بننا چاہیے۔ یہی سوچ بار بار اس کی ذہن کی دیواروں سے ٹکراتی رہی اور وہ دھیرے دھیرے آنسو بہاتی رہی۔

☆☆☆

رحمٰن جب اپنے گھر پہنچا تو اس کی بیمار بیوی اور اس کا حد سے زیادہ اتاولا بیٹا فارس دونوں شدت سے اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ فارس جب صنوبر کے بھائی سلمان سے مل کر لوٹا تو اسے پورا یقین تھا اس کے ڈیڈی صنوبر کے گھر سے واپس اپنے گھر آ چکے ہوں گے کیونکہ نا ہو یا ہاں زیادہ دیر وہ صنوبر کے گھر بیٹھ نہیں سکیں گے لیکن جب بہت دیر تک وہ واپس نہیں آئے تو اس کی بے چینی سوا ہونے لگی۔ اس نے اپنی ماں کے کمرے میں جا کر ان سے پوچھا کہ اب تک ڈیڈی کیوں واپس نہیں آئے۔ اس کی ماں ان دنوں بیمار تھی اسی لیے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کا رشتا مانگنے نہیں جا سکی تھی۔ اسے خود بے چینی سے اپنے شوہر کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ ایک بار صنوبر کے کسی پارٹی میں مل چکی تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ صنوبر اس کی بہو بن جائے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ صنوبر جیسی لڑکی اس کے بیٹے فارس جیسے لڑکے کو کبھی اپنی زندگی کا شریک سفر بنانے پر راضی نہیں ہوگی کیونکہ اس کا بیٹا خواہ اس کا اپنا

بیٹا تھا لیکن جس قسم کے مزاج اور غرور میں وہ رہتا تھا ایسا تو کا صنوبر جیسی لڑکی کا دل کبھی نہیں جیت سکتا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ صنوبر کسی اور لڑکے سے محبت کرتی ہے تو اسے یہ سن کر کوئی زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی یہ خواہش بس ایسے ہی ہے جیسے کوئی چاند کو اپنی جھولی میں اتارنے کی ضد کرے۔

صنوبر کو تو کسی اور ہی کا نصیب بننا تھا لیکن اب جو صورت حال نے پلٹا کھایا واقعات نے کروٹ لی اسے آگے کی ساری بات اس کے شوہر رحمٰن نے بتا دی تھی شرجیل کے اس طرح غائب ہونے کے بعد اس کے دل میں پھر سے اس امید کی جوت روشن ہو چکی تھی اسے بھی ایسا لگنے لگا تھا۔ جیسے صنوبر کا رشتا مانگا جا سکتا ہے۔ لیکن جب اس کا رشتا مانگنے جانے کو اس کے شوہر نے کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں جا سکی اس کے سر میں آدھے سر کا درد اتنی زور سے اٹھا تھا کہ وہ بہت دیر سے دوا کھا کے کمرے میں اندھیرا کیے پڑی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر نے کہا بھی تھا کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تب چلیں گے مگر اس نے رحمٰن کو اصرار کر کے بھیج دیا تھا کہ اس وقت اس کا جانا ہی ٹھیک ہوگا ورنہ وہ لوگ پتا نہیں کیا سوچیں گے۔ سر کا درد اب کافی کم ہو چکا تھا لیکن یہ بیماری اسے اس قدر نڈھال بنا دیتی تھی کہ وہ دیر تک اندھیرے کمرے میں یونہی بے سدھ لیٹی رہتی تھی اور سب جانتے تھے کہ اس حالت میں وہ کسی سے کسی بھی قسم کی بات کرنے تک کو تیار نہیں ہوتی تھی اس لیے نوکروں کی فوج بس اِدھر اُدھر کونوں میں چھپتی پھرتی اور کوئی بھی کام ڈھونڈ کر کرنے میں جتی رہتی۔ لیکن فارس کی بے چینی ایسی تھی کہ اس نے ماں کی اس حالت کی پروا نہیں کی اور کمرے میں پہنچ کر بولا۔

''ماما ڈیڈی کا کوئی فون آیا تھا کیا؟'' اس نے پاس ہی لگے ہوئے سوئچ کو آن کیا تو کمرے میں ملگجی سی روشنی پھیل گئی جس میں نہ وہ فارس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی فارس اپنی ماں کی تکلیف زدہ حالت کو دیکھ سکتا تھا۔ فارس تو یوں بھی کبھی اتنا حساس نہیں رہا ماں کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی اسے تو بس اپنی پڑی رہتی تھی اس وقت بھی اسے اپنے باپ کے آنے اور صنوبر نے کیا جواب دیا یہ جاننے سے زیادہ کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی اور یہ بات اس کی ماں اچھی طرح جانتی تھی۔

''نہیں بیٹے مجھے تو ان کا کوئی فون نہیں آیا۔ کیوں کیا بات ہے؟'' اس نے قدرے مشکل سے پوچھا۔

''نہیں بات تو کوئی نہیں ہے لیکن اتنی دیر تو انہیں صنوبر کے گھر میں نہیں لگنی چاہیے تھی۔ لگتا ہے وہ وہاں سے نکل کر کہیں اور کسی اور کام سے چلے گئے ہیں۔ حالانکہ انہیں پتا بھی ہے ان کے آنے کا مجھے کتنا انتظار ہے۔'' فارس کے لہجے میں ہلکے ہلکے ابھرتے ہوئے طیش کو اس کی ماں نے محسوس کر لیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی اور کام سے نہیں گئے ہوں گے۔ انہیں وہیں صنوبر کے گھر میں ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''آپ کو کیسے پتا آپ نے تو ابھی کہا کہ ان کا کوئی فون بھی نہیں آیا۔'' وہ جرح کرنے لگا۔

''میں جانتی ہوں بیٹے وہ اس وقت کسی اور کام سے نہیں جائیں گے۔ کیونکہ میں نے بھی ان سے تاکید کی تھی کہ وہ سیدھے گھر ہی آئیں۔''

''کہیں ایسا نہ ہو صنوبر نے انکار کر دیا ہو اور وہ اس خبر کو ہمیں بتانا نہ چاہتے ہوں اس لیے کہیں اور چلے گئے ہوں؟'' فارس نے کہا۔

''انکار تو ہونا ہی ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تمہارے ڈیڈی پھر بھی سیدھے گھر ہی آنے والے ہیں کیونکہ اس لڑکی صنوبر کا انکار ہماری توقعات کے برعکس کوئی ایسا فیصلہ نہیں ہے جو ہم پہلے سے نہیں جانتے۔ اس لیے حوصلہ رکھو وہ جیسے ہی فری ہوں گے سیدھے گھر ہی آئیں گے۔'' ماں نے اسے تسلی بھی دی اور اس کے دل پر پاؤں بھی رکھ دیا۔

''تو کیا صنوبر واقعی انکار کرے گی؟'' فارس نے جیسے اپنی ٹوٹتی ہوئی امید کو تنکے کا سا سہارا دینے کی کوشش کی۔

''یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ تمہارے ڈیڈی نے تمہاری خاطر سرفراز کو مجبور کیا ہو کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔ ایسی صورت میں صنوبر کے پاس شاید انکار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ ہو مگر یہ پوری طرح یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔'' اب اس نے کمرے کی باقی لائٹس بھی روشن کر دیں اور اپنے بیٹے کو ایک گہری نظر سے دیکھا۔ نیلی ٹی شرٹ اور کئی رنگوں والے ٹراؤزر میں اس کا وجود کسی ایسے بے فکرے نوجوان کا حلیہ پیش کر رہا تھا جیسا کہ وہ تھا۔ اس نے ماں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ اور پھر بولا۔

''اب تو شرجیل یہاں سے جا چکا ہے تو اب وہ کیوں انکار کرے گی؟''

''شرجیل لاپتا ہے کوئی خدانخواستہ دنیا سے تو نہیں چلا گیا۔ وہ اس کا انتظار بھی تو کر سکتی ہے۔'' ماں اب بیڈ سے اٹھی اور اٹیچ باتھ روم میں چلی گئی۔ فارس کو اس بات نے پریشان کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ماں باتھ روم سے نکلی تو اس کا چہرہ فریش معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا نام ساجدہ تھا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ تمہارے رشتے کے لیے ہاں کہنے والی ہے۔ ایسا کیا ہوا ہے اب جس کی بنیاد پر تم یہ توقع کر رہے ہو؟'' اس نے تولیے کو واپس باتھ روم میں رکھتے ہوئے باہر آ کر کہا۔

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔ مجھے لگتا ہے ڈیڈی کو وہ لوگ منع نہیں کر سکیں گے۔'' فارس کے اس بے تکے جواب کو سن کر اس کی ماں کو اپنے بیٹے کی باچارگی پر کافی ترس آیا۔

''امید کسی تنکے کے سہارے سے بھی باندھا جا سکتا ہے۔ اس وقت تم بھی یہی کر رہے ہو کہ ایسا اس لیے ہو سکتا ہے اس لیے ہو سکتا ہے۔ جب کہ حقیقت ہم سب کے سامنے ہے۔ وہ لڑکی کسی اور کو پسند کرتی ہے تو وہ تمہارا رشتا کیوں قبول کرنے لگی۔ مجھے تو تم پر حیرت ہے بلکہ کبھی کبھی تو غصہ بھی آتا ہے جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ وہ لڑکی تم سے محبت نہیں کرتی تو کیوں اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ ایک ایسی لڑکی سے شادی ہو بھی جائے تو تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولے گی کہ وہ تم سے نہیں کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ تو کیا یہ سب برداشت کر لو گے تم؟'' ساجدہ کے لہجے میں اب ہلکی سی تلخی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''مجھے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے چاہے کچھ بھی ہو۔ مجھے اس بات سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس سے محبت کرتی ہے اور کس سے نہیں۔ شادی ہو جائے تو وہ میری ہو جائے گی اور مجھے اسے اپنا بنانا ہے بس۔'' فارس نے جھنجلا کر کہا۔

''ایک امیر باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے تم صنوبر سے شادی نہیں کر رہے ہو بلکہ اسے اپنی ضد سمجھ کے پورا کرنا چاہتے ہو..... یہی نا؟'' وہ اس کے قریب آ گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں مم آپ میری بات سے اتفاق کریں گی یا نہیں۔ مگر محبت دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو دل سے کی جائے اور ایک وہ جو کسی کی خوبصورتی سے کی جائے، اس کی اٹریکشن سے کی جائے۔ اور یہ جو دوسری والی محبت ہوتی ہے نا یہ بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کس سے محبت کرتا ہے یہ تو بس حاصل کرنا چاہتی ہے حاصل ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اور جب کسی کو حاصل کر لیتی ہے تو اسے قرار آ جاتا ہے۔ مجھے بھی صنوبر کو حاصل کر کے قرار آ جائے گا۔''

فارس کی بات سن کر ساجدہ ایک لمحے کو سوچ میں چلی گئی اور سوچ سے نکلی تو اس کی سمجھ میں اپنے بیٹے کی بات آ چکی تھی وہ جان گئی کہ اس کا بیٹا ہوس کا پجاری ہے اور اپنی ہوس کی آگ کو محبت سمجھتا ہے وہ صنوبر کے دل و دماغ سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ بس اسے صنوبر کا خوبصورت جسم چاہیے کیونکہ وہ ایک خاندانی لڑکی ہے اس لیے وہ شادی کر کے اسے حاصل کرنا چاہتا ہے ورنہ شاید اس کے بیٹے کا تعلق مردوں کی اس حیوان نسل سے ہے جو عورت کو اپنے

لیے کسی کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یہ کوئی اچھی سوچ نہیں تھی۔ وہ لرز کر رو دی اور اس کا دل چاہا کہ وہ فارس سے کہہ دے کہ ''تب تو میں دعا کروں گی کہ تمھیں صنوبر کبھی نہ ملے۔ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکی بس خاموش ہوگئی۔ اسی وقت اگر رحمن کے آنے کی خبر نہ مل جاتی تو ساجدہ کو لگنے لگا تھا کہ جو درد اتنی مشکل سے اس کے سر سے نکلا تھا وہ پھر سے اس کے سر میں داخل ہو چکا ہے۔ پتا نہیں اس کا بیٹا کب اس طرح کے خیالات کی دلدل میں گرا وہ تو جیسے جان ہی نہیں سکی۔ رحمن نے آتے ہی پہلے ایک گلاس پانی مانگا پھر وہ چائے کا مطالبہ کرنے لگا اور چائے پیتے ہوئے بھی وہ خاموش ہی رہا اس کی بیوی ساجدہ کو جیسے اس کے بات کرنے اور یہ بتانے سے اب اتنی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہ گئی تھی کہ صنوبر کے گھر سے وہ کیا جواب لایا ہے۔ لیکن فارس کی بے چینی جیسے چھت سے لگ گئی اور وہ مزید برداشت نہیں کر سکا۔

''ڈیڈی آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو کب سے آپ کا انتظار کر رہا تھا''

''کیا ان لوگوں نے انکار کر دیا؟'' اب ساجدہ نے بھی پوچھ ہی لیا۔

''نہیں.....!!'' رحمن کے اس مختصر جواب سن کر ایک لمحے کو فارس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ وہ بے صبری سے بولا۔

''تو کیا ہاں ہوگئی ڈیڈ؟''

''نہیں.....!!'' اس بار بھی رحمن نے نہیں کہا تو وہ ہی نہیں ساجدہ بھی الجھنے لگی۔

''کیا مطلب ہے نا ہاں ہوئی نا نا ہوئی تو پھر کیا جواب دیا ہے ان لوگوں نے۔ کچھ تو کہا ہوگا؟''

''انھوں نے انتظار کرنے کو کہا ہے'' رحمن نے اس بار قدرے زیادہ الفاظ کا استعمال کیا۔

''انتظار.......؟؟؟'' فارس کے منہ سے یہ لفظ ایسے نکلا جیسے اس کے دل میں کوئی آگ تھی جو ایک دم سے سرد پڑ گئی ہو۔

''ہاں انتظار...وہ کہتے ہیں ان کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر پہنچنا نہیں چاہتی اس لیے آپ کو کچھ اور وقت کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔'' فارس کی امید پوری طرح ٹوٹی نہیں تھی۔ اس لیے وہ آخری امید کو بروئے کار لاتے ہوئے بولا۔

''چلیے انھوں نے بہر حال منع تو نہیں کیا۔ وہ شاید ابھی شرجیل کا انتظار کرنا چاہتے ہیں۔ مگر شرجیل جس طرح سے غائب ہوا ہے مجھے تو لگتا ہے وہ جانے کے لیے ہی گیا ہے۔''

''تم کہنا چاہتے ہو اب شرجیل کبھی واپس نہیں آئے گا!'' رحمن نے پھر سے اپنے بیٹے کو شک کی نظروں سے دیکھا۔ ''تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو فارس؟'' فارس کو اپنی غلطی اور بے صبری کا اندازہ ہو چکا تھا۔

''نہیں ڈیڈی میرا وہ مطلب نہیں ہے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شرجیل جس انداز سے گیا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ورنہ وہ کم سے کم صنوبر کو ضرور بتا کر جاتا۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''میں آج صنوبر کے بھائی سلمان سے ملا تھا۔ اس نے بھی اسی قسم کی بات کہی تھی اس کا کہنا ہے کہ صنوبر بھی اب کافی حد تک مایوس ہو چکی ہے اور اسے بھی نہیں لگتا کہ شرجیل کبھی واپس آئے گا۔'' تفصیل میں چھپے اپنے بیٹے فارس کی خوشی کو دونوں ماں باپ نے محسوس کر لیا تھا۔

''کھانا تو آپ نہیں کھا کر آئے ہوں گے۔ میں کھانا لگواتی ہوں'' ساجدہ نے کہا تو رحمن سے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ یہ سنتے ہی فارس ایکسکیوز کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔

''لڑکی شادی کے لیے تیار ہے...!'' فارس کے جانے کے بعد رحمن نے اپنی بیوی کو بتایا تو وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی اور اس کے کھلے ہوئے منہ سے نکلا۔ کیا.........!

☆☆☆

سلمان گھر واپس آیا تو اسے اپنے گھر کی فضاء کچھ سوگوار اور خاموش خاموش سی لگی اس نے اپنے والد کو بالکونی میں سگار پیتے ہوئے دیکھا اور چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ کسی بھاری اسٹریس میں ہیں اس لیے اس کی ہمت نہیں پڑی کہ ان سے کچھ بھی پوچھ سکے۔ وہ گھر میں اندر آیا تو اسے سلمٰی دکھائی دی جو ٹیبل پر برتن صاف کر کر کے رکھ رہی تھی عموماً وہ نوکروں سے کوئی بھی بات ذرا مشکل سے کرتا تھا اسے تو بس حکم دینا ہی آتا تھا۔ ''ماما کہاں ہیں؟'' وہ اصل میں جاننا چاہتا تھا کہ فارس کے باپ کو اس گھر سے کیا جواب دیا گیا ہے۔

''جی چھوٹے سرکار وہ صنوبر بی بی کے کمرے میں ہیں۔'' سلمٰی کا جواب سن کر وہ وہاں رکا نہیں اور خلاف توقع سیدھا صنوبر کے کمرے میں چلا آیا۔ گہرے سبز رنگ کی قمیض اور کیمل کلر کی پینٹ اس پر کوئی خاص نہیں جچ رہی تھی پر لباس کے معاملے میں وہ اس بات کی پروا کم ہی کرتا تھا کہ لوگوں کو اس کا لباس پسند آئے گا یا نہیں بس اسے خود کو پسند آنا چاہیے۔ باقی اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ صنوبر کے کمرے میں پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اس نے اسے ایک دم سے بے چین کر دیا۔ صنوبر اب تک ایسے لیٹی ہوئی تھی بے سدھ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے لگا وہ سو نہیں رہی بلکہ بے ہوش ہے۔ ''اسے کیا ہوا ہے ماما؟'' اس کی بات سن کر درشہوار کو پتا چلا کہ اس کا بیٹا کمرے میں آ چکا ہے۔ وہ کچھ دیر کو ٹھہری اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

''کچھ نہیں بس گہری نیند سو رہی ہے؟''

''لیکن اس کے چہرے کی اذیت سے لگ رہا ہے کہ یہ بہت اسٹریس میں ہے'' سلمان کی بات سن کر درشہوار نے اسے ایک بار گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

''تمہیں اس بات کی پروا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے ضرور کچھ ہوا ہے۔ کیا اس گھٹیا آدمی نے کوئی دھمکی وغیرہ دی ہے یا کوئی بدتمیزی کی ہے۔'' وہ سیدھا موضوع پر آ گیا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟'' درشہوار نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اسی فارس کے باپ کی اور کس کی۔ اس کا بیٹا تو آج بہت بدلا ہوا ظاہر کر رہا تھا خود کو جیسے اس سے زیادہ تہذیب اور انسانیت کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ منہ بگاڑ کے بولا۔

''تو کیا تم جانتے تھے کہ رحمن یزدانی یہاں آنے والے ہیں؟'' درشہوار نے پوچھا۔

''ہاں فارس نے ہی بتایا تھا کہ وہ آج ہمارے گھر صنوبر کا باقاعدہ رشتا مانگنے آنے والے ہیں۔'' سلمان نے کہا تو درشہوار کو ایک دم ہی غصہ آ گیا۔ ''تب تو تمہیں گھر پر ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''مجھے اس سے ملنے کے بعد ہی پتا چلا۔ میں گھر سے کافی دور جا چکا تھا اسی کے ساتھ تو اس نے مجھے روک لیا۔ بولا کہ تم اگر کوشش کر کے چلے بھی گئے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے ڈیڈی اتنی زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔ اس لیے میں نہیں پہنچ سکا۔''

''وہ کافی دیر تک بیٹھے رہے جیسے انھیں جو چاہیے تھا وہ لے کر ہی جانے کی ٹھان کر آئے تھے۔''

''تو کیا جواب دیا پاپا نے؟'' سلمان کی بے چینی بڑھنے لگی۔

''جواب تو صنوبر کو دینا تھا۔ تم اپنے پاپا کو جانتے ہو وہ صنوبر کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کہیں نہیں کر سکتے۔'' درشہوار کو جیسے صنوبر کا جواب بتا دینے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''تو کیا کہا صنوبر نے اس نے ضرور انکار کر دیا ہوگا۔ میں جانتا ہوں۔ تو پھر وہ اتنی دیر تک کیوں بیٹھے رہے؟'' سلمان کو حیرانی نے پکڑا۔ تب پھر درشہوار نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات سلمان کو بتا دی۔

''یہ کیسے ہوا۔ صنوبر نے ہاں کر دی۔ لیکن وہ تو؟'' سلمان کے منہ میں جیسے الفاظ پھنس کے رہ گئے۔

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کیا تم ایسا ہی نہیں چاہتے تھے۔ فارس تمہارا دوست ہے اور اپنے دوستوں کے لیے تو تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔!'' درشہوار کے لہجے کا طنز سلمان کو اچھی طرح محسوس ہو چکا تھا۔

''ہاں ایسا ہے میں پہلے ایسا ہی چاہتا تھا لیکن اب میں وہ پہلے والا سلمان نہیں ہوں۔ اب میں بدل چکا ہوں۔ مجھے اپنی بہن کی خوشی اپنے کسی بھی دوست سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے فارس کا رشتا صنوبر کے لیے بالکل بھی پسند نہیں ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں پاپا صنوبر کی ہر بات کو مانیں گے اب اگر صنوبر نے ہی.....'' وہ کہتے کہتے رکا اور پھر بولا۔ ''لیکن صنوبر تو شرجیل کو پسند کرتی ہے وہ فارس کے لیے مان کیسے گئی۔''

''شرجیل..... کس شرجیل کی بات کر رہے ہو۔ جو اسے بنا بتائے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اور کب آئے گا۔'' ایک دم سے ہی درشہوار کو پتا نہیں کیا خیال آیا وہ بولی۔

''سلمان اگر تم اپنی بہن کو خوش دیکھنا چاہتے ہو تو شرجیل کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لے آؤ۔ ورنہ یہ بے وقوف لڑکی اس فارس سے شادی کر لے گی اور پھر زندگی بھر پچھتائے گی۔ کیا تم شرجیل کو ڈھونڈ نہیں سکتے۔'' درشہوار کو سلمان کے روپ میں جیسے کوئی امید دکھائی دینے لگی۔

''میں اسے کہاں سے تلاش کر سکتا ہوں۔ ماما اس کے باپ نے اسے ایسی سب جگہوں پر تلاش کیا ہے حتیٰ کہ ان کے جو بھی رشتے دار لندن، امریکا اور آسٹریلیا میں ہیں ان سے بھی وہ پتا کر چکے ہیں مگر پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔'' سلمان کی باتوں سے بھی بے بسی صاف عیاں ہو رہی تھی۔

''تب تو پھر اسے ضرور کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ اور پتا نہیں وہ اب تک زندہ بھی ہے یا نہیں؟ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ اس کی یکا یک اتنی گہری دشمنی کیسے نکل آئی۔'' درشہوار جو دل میں رکھنا چاہتی تھی وہ اس کی زبان سے پھسل چکا تھا۔

''اس پر پہلے بھی حملہ ہوا تھا۔ پتا ہی نہیں چلا کن لوگوں نے کروایا تھا۔ اگر اس حملے کا کوئی سراغ مل جاتا تو شاید شرجیل کو تلاش کرنا آسان ہوتا۔'' سلمان نے کہا تو شہوار بولی۔

''پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے جیسے شرجیل کی گمشدگی اور اس حملے میں یہی دونوں باپ بیٹا ملوث ہیں۔ ساری دنیا میں بس ان ہی کو یقین ہے کہ شرجیل کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ تو کیا فارس کا باپ بھی اس کے گناہوں میں اس کا شریک بن چکا ہے؟'' سلمان نے ایسے کہا جیسے خود سے پوچھ رہا ہو۔

''وہ ایسا لگتا تو نہیں ہے مگر فارس سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اتنا سب اس نے صنوبر کو حاصل کرنے کے لیے کیا۔ یہ بات مجھے بہت عجیب لگ رہی ہے۔'' سلمان سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔

''انسان اپنی ضد کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ انسان سے شیطان بن جائے تو؟''

''میں اس کے دوستوں سے پتا لگاتا ہوں۔ شاید کوئی کچھ جانتا ہو۔'' سلمان نے سوچ کے پیچھے سے بولتے ہوئے کہا۔ اسی وقت صنوبر کسمسائی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے کمرے میں سلمان اور اپنی ماں کو موجود پا کر اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا..... بات ہے..... آپ دونوں.....'' پوری بات وہ جیسے کہہ ہی نہیں سکی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے ہم یہیں بیٹھے رہے۔ کہیں تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو'' درشہوار نے کہا۔

''کیوں میری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟'' صنوبر مزید حیرت میں پڑ گئی اس نے سلمان کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کی موجودگی کسی بڑی ہونی کی وجہ سے ہے۔

''پریشان مت ہو۔ میں تو ابھی آیا ہوں۔ ماما کب سے تمہارے پاس ہیں۔ تم شاید بے ہوش ہو گئی تھیں۔''

سلمان نے کہا۔

''بے ہوش ہوگئی تھی'' وہ ایسے بولی جیسے بڑبڑا رہی ہو۔

''پر اب تم ٹھیک ہو بیٹے۔ اچھا اب تم فریش ہو جاؤ میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔ تمہارے پاپا بھی پریشان تھے میں انھیں بھی بتا کر آتی ہوں کہ تم اب جاگ چکی ہو۔''

''پاپا بھی پریشان تھے۔'' اس نے دل میں کہا۔ مگر اور کچھ نہیں بولی۔

''میں بھی فریش ہو جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سلمان بھی وہاں سے چلا گیا۔ اور اب کمرے میں صنوبر اکیلی رہ گئی۔

کچھ دیر بعد اسے دھیرے دھیرے سب یاد آ گیا اسے پاپا اور ماما سے ہونے والی وہ گفتگو جس میں اس نے شرجیل کی بے حسی کا ذکر کیا تھا اور فارس سے شادی کے لیے کی گئی ہاں سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ کچھ دیر گم صم سی بستر پر بیٹھی رہی پھر آہستگی سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

سلمان کو اپنے والد کی ناراضگی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انھوں نے ساری زندگی اپنے قبیلے کے ساتھ اس طرح گزاری تھی جیسے کوئی قانون پسند شہری اپنے ملک سے محبت کرتے ہوئے اس کے سب قوانین کو ایمان سمجھ کر ان پر عمل کرتا ہو۔ لیکن جو کچھ ہوتا چلا گیا اسے وہ ہونے سے روک نہیں سکے آخری چیز ان کی اپنی جان تھی جو وہ اپنے اصولوں اور اپنے قبیلے کے قوانین کی نذر کر دینا چاہتے تھے لیکن ان کے بیٹے نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا اور ان کو قبیلے کے قوانین توڑ کر باقاعدہ جنگ کر کے موت کی سزا سے بچا لیا۔

''افسوس کرنے اور دکھ میں رہنے کے بجائے آپ کو اپنے بیٹے کی بہادری اور اس کی محبت کے لیے اس کی پیٹھ تھپتھپانی چاہیے۔ اس نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آپ کو ظالم سردار کے ظلم سے بچایا ہے۔'' زلیخاں کو اپنے شوہر کی حالت پر رحم آنے کے بجائے غصہ آنے لگا۔

''لیکن زلیخاں تم ایک بات کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ اب ہم قبیلے میں نا تو کبھی واپس جا سکیں گے اور نہ ہی ہمیں قبیلے والے یہاں رہنے کی اجازت دیں گے تو تم ہی بتاؤ پھر ہم کہاں جائیں گے۔ کیا کوئی بھی جن کبھی اپنے قبیلے سے نکل کر خوش رہ سکتا ہے۔ ہمیں کوئی بھی قبیلہ کبھی بھی پناہ نہیں دے گا تو پھر ہم کہاں رہیں گے۔ جن جنات کو قبیلے سے در بدر کر دیا جاتا ہے تو جانتی ہو وہ کس طرح کی زندگی گزارتے ہیں۔ انھیں انسانوں کی بستیوں میں رہنا پڑتا ہے جہاں انھیں خود کو زندہ رکھنے کے لیے شیطان بننا پڑتا ہے وہ انسانوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں کے جسموں میں گھس جاتے ہیں اور ان کے وجود کو نوچ نوچ کے کھاتے رہتے ہیں تو کیا تم ایسی زندگی کو زندگی کہتی ہو۔ کیا ہمیں اب اس طرح جینا ہوگا۔'' ابراہیم کی بات غلط نہیں تھی۔

''لیکن اب کیا کیا جائے۔ ہمیں اب جیسے بھی ہو جینا تو ہوگا۔ اپنے بیٹے کی خاطر ہمیں سب کچھ جھیلنا ہوگا۔'' زلیخاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابراہیم کو اس کی بات کا اور کیا جواب دے۔ یہ سب باتیں سلمان بھی سن رہا تھا اس نے ان دونوں کو پریشان دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا۔

''بابا اب ہمیں انسانوں کی دنیا میں انسان بن کے رہنا ہوگا۔'' سلمان کے منہ سے بات کیا نکلی سمجھو جیسے ایک دھماکہ تھا جو ابراہیم کی سماعتوں سے ہوتا ہوا اس کے دل و دماغ کو چھلنی کرتا چلا گیا۔

''کیا..... کیا کہہ رہے ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم انسان بن کر کبھی جی نہیں سکیں گے۔'' ابراہیم نے اپنے اندر کا جوالا مکھی دباتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں جی سکیں گے۔ بابا جی سکتے ہیں میں اتنے دن تک جیتا رہا ہوں تو آپ بھی جی سکتے ہیں اور پھر اپنے گھر میں تو ہم جب چاہیں جنات کی طرح بھی رہ سکتے ہیں وہاں ہمیں کون دیکھنے والا ہوگا۔'' سلمان نے پھر کہا۔

اس کی تائید میں زلیخاں بولی۔

''ہاں ہاں ہم ایسا ہی کریں گے۔اور چارہ بھی کیا ہے۔ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔''

''اور ایسا کب تک کرنا ہوگا۔کیا یہ بتاؤ گے میرے لاڈلے؟''ابراہیم نے طنز کیا مگر سلمان نے جو بروقت جواب دیا اس نے ابراہیم کو چپ ہونے پر مجبور کر دیا۔

''سردار شماش کے سرداری گدی سے اترنے تک''ابراہیم نے گھور کے سلمان کی طرف دیکھا جو ایسی عجیب اور بے تکی بات کر رہا تھا جس کے کوئی معنی ہی نہیں تھے۔''سردار موت سے پہلے تو اپنی گدی سے اترے گا نہیں''ابراہیم نے جل کے کہا۔''ہاں تو پھر ہمیں اس کی موت کا انتظار کرنا ہوگا''سلمان نے اطمینان سے کہا۔

''اور اس سے پہلے ہم مر گئے تو۔بے عزتی اور ہجرت کی یہ زندگی ہمارا مرن کو کیسے کرے گی۔کہاں ہمیں بھیجا جائے گا۔ہماری روحوں کا مسکن تو ہمارے ہی قبیلوں میں ہوتا ہے وہ اس صورت میں کہاں ہوگا۔؟''ابراہیم کو جیسے رہ رہ کر ایسی باتیں یاد آرہی تھیں جو اسے مزید دکھی اور مایوس کر رہی تھیں۔

''بابا آپ ایسی باتیں سوچ سوچ کر پریشان مت ہوں۔اس سے تو ہمت ٹوٹ جائے گی۔اس وقت ہمیں ہمت توڑنے کی نہیں ایک دوسرے کی ہمت جوڑنے کی ضرورت ہے۔کسے پتا کہ کون پہلے مرے گا۔اور کیا آپ کو یاد نہیں دستور تو یہی ہے کہ کوئی کہیں بھی مرے لیکن اسے موت کے بعد اس کے قبیلے والے قبول کر لیتے ہیں چاہے تو شیطان ہو یا باغی۔اس لیے موت کے بعد ہم اسی جگہ لے جائے جائیں گے جہاں سب ہی قبیلے کے جنات کی روحوں کی آخری رسوم ہوتی ہیں۔''

سلمان نے صراحت سے کہا۔کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر سلمان کی ماں نے جیسے اس بات کو بھول کر آنے والے جیون کی تیاری شروع کر دی۔''بے گناہ کنعان کی ماں کو بھی ہماری خاطر یہ سب جھیلنا ہوگا۔انھیں بھی اب ہمارے ساتھ ہی انسانوں کی دنیا میں جا کے رہنا ہوگا۔اور کنعان کو بھی۔''

''اس کی تم فکر مت کرو ماں میں نے کنعان سے بات کر لی ہے وہ اپنی ماں کو لے کر آتا ہی ہوگا۔''سلمان نے کہا۔لیکن اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں بلکہ اپنی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو مجھ پر بیتی ہے وہ بتانا چاہتا ہوں۔''سلمان اصل بات کی طرف آنے کی کوشش کرنے لگا۔

''رہنے دو یہ وقت تمہاری کہانی سننے کا نہیں ہے جیسے بھی جلد سے جلد ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔سردار اپنی اس بے عزتی کو بھی برداشت نہیں کرے گا اور وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمارا پیچھا ضرور کرے گا۔''زلیخاں یہ سنتے ہی ایک دم ہی گھبرا سی گئی۔''کیوں وہ ہمارا پیچھا کیوں کرنے لگا۔اسے معلوم ہے سلمان کی خفیہ طاقتیں کیسی ہیں۔اتنی بڑی شکست کے بعد وہ یہ بھول کبھی نہیں کرے گا۔''

''ابھی تو شاید وہ ایسا نہ کرے مگر بعد میں۔کوشش تو ضرور کرے گا۔لیکن اس وقت کی اس وقت ہی دیکھیں گے۔اس وقت میری بات سن لو ماں میں بعد میں سنا نہیں سکوں گا میں نہیں چاہتا کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اس بات کا کبھی بھی کنعان یا اس کی ماں کو پتا چلے۔''

''ایسی کیا بات ہے بیٹا بولو۔مجھے تمہارے چہرے کی طرف دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم ضرور کوئی ایسی بات کہنے والے ہو جس سے میرے دل کو تکلیف پہنچے گی۔پھر بھی سننا تو ضروری ہے ہی اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''زلیخاں نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

''میں اس دن کو روتا ہوں جب میں نے پہلی بار تمہاری بات مانی تھی۔کاش اس وقت ہی میں نے منع کر دیا ہوتا اور اسے انسانوں کے ساتھ پڑھنے نہ بھیجا ہوتا۔تو آج اطمینان سے اپنے گھر قبیلے میں رہ بھی رہے ہوتے اور اس طرح در بدر اور غیر جات کے ساتھ رہنے کی ذلت بھی نہیں ہو رہی ہوتی۔''ابراہیم نے قدرے اکھڑے ہوئے

لہجے میں کہا۔ اب جو ہو چکا ہے اسے سوچتے رہنے سے کیا ہونے والا ہے۔ بچے کی بات تو سنو پتا نہیں وہ اور کیا ستم توڑنے والا ہے۔ اپنے دل کو مضبوط رکھو اس کی اس وقت زیادہ ضرورت ہے۔''

سلمان نے شروع سے لے آخیر تک اپنی اور اپنے عشق صنوبر کی داستان اپنے ماں باپ کو سنا دی۔ وہ دم سادھے سنتے رہے اور جب سلمان چپ ہوا تو ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس عجیب و غریب کہانی کے بعد ان کے تاثرات کیا ہونے چاہیں۔

''تو کیا وہ لڑکی بھی اب ہمارے ساتھ رہنے والی ہے؟'' زلیخاں کو جیسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

''نہیں میں اس کے ساتھ جا کے رہنے والا ہوں۔ اس سے بھی پہلے میں شرجیل کے ماں باپ کے گھران کا بیٹا بن کے رہوں گا۔''

''سیدھی طرح سے کیوں نہیں کہتے تم ہمارے ساتھ نہیں رہنے والے۔ ہمیں در بدر کرا کے خود پھر بھی کہیں اور جا کے کسی اور کا بیٹا بن کے رہے گا۔ سن رہی ہو تم شاید اس ایک آسرے پر اس کی ہر بات مان رہی تھیں کہ کچھ بھی ہو یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے تو رہے گا مگر اس نے تمہاری یہ آخری امید بھی توڑ دی ہے۔ ایک لمحے کو تو میں نے بھی اپنے دل کو یہی سوچ کر تسلی دے دی تھی کہ چلو جو کچھ بھی ہوا ہمارا بیٹا تو ہمارے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گا مگر اس نے یہ ایک آخری خوشی بھی چھین لی ہے زلیخاں۔ دیکھو اسی دن کے لیے ہم نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔'' ابراہیم کو سلمان کی باتیں سن کر نئے سرے سے غصہ آنے لگا تھا۔

''لیکن ماں میں جلدی جلدی آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔ میری مجبوری سمجھو نا بابا'' سلمان نے جیسے گھگیا کر کہا۔ سلمان کی باتیں سن کر ابراہیم نے تو فوراً ہی اپنا ردعمل ظاہر کر دیا تھا لیکن زلیخاں کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

''تم کچھ بولو ناماں'' سلمان نے پھر سے ماں کو مخاطب کیا وہ جانتا تھا کیسے بھی حالات ہوں اس کی ماں ہمیشہ اسی کا ساتھ دیتی ہے۔

''میں تو یہ سوچ رہی ہوں۔ بیٹا تم ایک جن ہو اور وہ لڑکی صنوبر ایک انسان ہے۔ تم اس کے ساتھ چاہے شرجیل بن کے شادی کر و مگر تم رہو گے تو جن...... اس سے شادی کرنے سے انسان تو نہیں بن جاؤ گے۔ اور یہ ایک قسم کا دھوکا تو ہے ہی مگر یہ ناممکن ہے ایک انسان اور جن کی شادی کیسے ہو سکتی ہے بیٹے۔ کیسے مجھے ذرا سمجھاؤ''

زلیخاں کی بات سن کر ایک دم ہی ابراہیم بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اپنے غصے اور ناراضگی میں اس نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم یہ تو میں نے بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو گا سلمان تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو بولو'' ابراہیم نے بھی اس پر چڑھائی کر دی۔ تب سلمان کو ایک اور راز سے پردہ ہٹانا ہی پڑا۔ وہ بولا۔

''بابا آپ نے دیکھا کہ میں نے اور کنعان اور ماں نے مل کر کیسے سردار کے سینکڑوں جن سپاہیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ کیا آپ کا دماغ اس بات کو قبول کرتا ہے۔ کیا یہ کبھی جنات کی تاریخ میں ہوا ہے کہ صرف تین جنات جن میں سے ایک عورت تھی سردار کی پوری تیار فوج کو اس طرح مٹی چٹا دیں اور تمہیں اس کی قید سے آزاد کرا دیں'' سلمان کی بات سن کر زلیخاں اور ابراہیم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ ہاں یہ تو کبھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ''آپ دونوں یہی سوچ رہے ہیں نا کہ ہاں یہ تو ناممکن تھا۔ تو میں آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے معاملے میں بہت سی ناممکن باتیں بھی ممکن ہو سکتی ہیں۔'' سلمان نے اپنی بات مکمل کی اور ان دونوں کے قریب جا کر کہا۔ ''اس طرح پریشان مت ہوں۔ آپ کو اور سردار کے مہا پروہتوں کو اس بات کا یقین آچکا ہے کہ میرے قبضے میں کوئی ایسی غیر معمولی طاقت ہے جس کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے اسی لیے سردار نے آسانی سے جنگ میں اپنی شکست مان لی تھی اور تمہیں ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔''

''ہاں ہم بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ کسی آسمانی طاقت نے اس وقت تمہاری مدد کی تھی مگر...'' ابراہیم نے کہا اور بات ادھوری چھوڑ کر اس نے زلیخاں کو دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے اس انسان لڑکی سے شادی کرنے میں بھی وہ ہی آسمانی طاقت تمہاری مدد کر رہی ہے؟'' ابراہیم کے سوال کو سمجھتے ہوئے زلیخاں نے بھی ایک گہرا سانس لیا۔

''ہاں آپ لوگ سمجھ لیں کہ ایسا ہی ہے'' سلمان کو اس وقت اپنے ماں باپ کو مطمئن کرنے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا حالانکہ وہ دل ہی دل میں یہ بات جانتا تھا کہ صنوبر سے شادی کرنے کے معاملے میں بزرگ بابا اس کی مدد کریں گے یا نہیں یہ خود اسے بھی پتا نہیں تھا۔ لیکن اس وقت اپنے ماں باپ کے اطمینان کی خاطر اس نے یہ اسی بات کو اپنی ڈھال بنانے میں عافیت جانی۔

''لیکن جتنا میں جانتا ہوں قدرت اپنے اصول کبھی کسی کے لیے نہیں بدلتی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنے اصولوں کو بدل ڈالے۔ خدا نے ایسا کبھی پہلے تو نہیں کیا۔ بڑی بڑی بزرگ اور خدا کی پسندیدہ ہستیاں گزری ہیں مگر قدرت کے اصول سب کے لیے ایک جیسے ہی رہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنے اصول بدل ڈالے مجھے تمہاری اس بات پر بالکل بھی یقین نہیں ہے۔'' ابراہیم نے نا مانتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا، تو سلمان کو لگا کہ اب انھیں مطمئن کرنا آسان نہیں ہوگا۔

''آپ انھیں بابا میں جو بھی کروں گا وہ غلط نہیں ہوگا، قدرت بھی اپنے اصول بدلتی ہے مگر اس کی یہ بات کبھی کسی کے علم میں نہیں آتی۔ آپ کو میں نے مجبوری سے بتا دیا ہے تا کہ آپ کو پتا ہو اور آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں ورنہ مجھے بھی ایسی کوئی بات کرنے اور کسی کو بتانے کی آزادی نہیں ہے۔ اب میں چاہتا ہوں آپ دونوں یہ بات کبھی کسی سے نہیں کریں گے اسی لیے میں کنعان اور اس کی ماں کے آنے سے پہلے یہ بات آپ دونوں سے کرنا ضروری سمجھا۔''

سلمان کی بات سن کر دونوں کچھ کچھ اب بھی غیر مطمئن سے تھے لیکن وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکے کیونکہ کنعان اپنی ماں کو لے کر آ گیا تھا۔ اور اب انھیں اس غار کو چھوڑ کر آگے بڑھنا تھا۔

سلمان کے لیے جو سب سے بڑی مشکل تھی وہ یہ کہ اس نے ایک غار میں شرجیل کا جسم چھوڑ دیا تھا اور اب اسے اسی جسم میں پھر سے داخل ہونا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر اس نے ایسا کیا تو کنعان اور اس کی ماں کو کیسے سمجھائے گا۔ اپنے ماں باپ کو تو وہ کسی بھی طرح سمجھا سکتا تھا لیکن ان دونوں کو یہ بات کسی بھی صورت سمجھائی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ کچھ دیر کی رخصت لے کر وہاں سے چلا آیا۔ کنعان نے اس کے ساتھ چلنے کی بہت ضد کی مگر اس نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور غار تک اکیلا ہی آیا تھا۔ اب وہ شرجیل کے جسم کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسی وقت اسے بزرگ بابا کا خیال آیا جنھوں نے اس سے کہا تھا کہ جس کام کو تم کرنے میں معذوری محسوس کرو اس وقت مجھے مدد کے لیے یاد کر لینا۔ اس نے اس وقت بھی بزرگ بابا کو یاد کیا تو اسے آواز آئی کہ وہ شرجیل کے جسم میں چلا جائے کسی کو بھی وہ اس وقت تک شرجیل نظر نہیں آئے گا جب تک وہ خود ایسا نہ چاہے۔ بزرگ بابا کا جواب سن کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ لیکن ایک بات اس کے دل میں اب بھی کھٹک رہی تھی جو اس نے اپنے بابا سے کہی تھی کہ جن اور انسان کی کبھی شادی نہیں ہو سکتی تو پھر اس کا شرجیل کے جسم میں رہنے کا کیا فائدہ ہے؟ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اسے بزرگ بابا کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا نہیں ہے کہ تم وہ پہلے جن ہو جس کی کسی انسان لڑکی سے شادی ہوگی۔ اس سے پہلے بہت بار ایسا ہو چکا ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ کسی انسان اور جن کو یہ بات کبھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔ تم نے اپنے ماں باپ کو بتا کر اچھا نہیں کیا لیکن اب انھیں چپ رہنا ہوگا کسی سے بھی یہ بات کبھی نہ کرنے کی قسم کھانی ہوگی نہیں تو....'' بابا ایک لمحے کو کہتے کہتے رک گئے تھے۔

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ نومبر میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو از راہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میرے عزیز بچو!
اللہ تم سب کو صحت و سلامتی کے ساتھ جیتا رکھے اور حسبِ استطاعت نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بندوں سے مانگنا سوائے دکھ کے کچھ نہیں دیتا اللہ تبارک و تعالیٰ سورۃ سجدہ آیت 33 میں فرماتا ہے۔

''اور اس سے بہتر بات کس کی ہوگی جو لوگوں کو اللہ سے دعا کے لیے کہے اور خود بھی نیک عمل کرے۔''

لہٰذا ہر مشکل میں صرف اللہ سے ہی مدد مانگنی چاہیے۔ وہ اسباب پیدا کرتا ہے۔ انسان کی مدد دوسرا انسان ہی کرتا ہے مگر یہ امداد اللہ کے حکم سے مدد کرنے والے کے دل میں نرمی پیدا ہونے پر میسر آتی ہے۔ انسان کو چاہیے کم ترین میں جینا سیکھ لے۔ اس طرح وہ لالچ سے بھی دور رہتا ہے اور کم ترین وسائل میں بھی اُس کا ہاتھ دینے والا ہوتا ہے لینے والا نہیں...... ماہ محرم کی آمد آمد ہے۔ مسلمانوں کے سال کی ابتداء اسی بابرکت ماہ سے ہوتی ہے لہٰذا کوشش کرو کہ اس سال برائیوں اور خامیوں سے نجات حاصل کر کے اللہ کا قرب حاصل کرلو، اس کی فرمانبرداری کر کے، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر۔ نماز کی پابندی کامیابی کی کنجی ہے یہ یاد رکھنے والا ہی سرخرو ہوگا۔ خوب دعائیں مانگو...... اپنے رب سے طلب کرتے رہو۔ بارہا نصیحت کرتا ہوں اب بھی یہی کہوں گا کہ قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر سمجھنا ہی ہماری زندگیوں کو سہل کرے گا۔ اللہ کے بندوں کا خیال رکھو۔ اذیت کسی بھی جاندار کو نہ دو، کیونکہ سب کا خالق رب العزت ہے۔ سورۃ فاتحہ ایک مکمل دعا ہے اس کا بہت پڑھنا زندگی کو درست راستے پر رکھتا ہے۔ اسمِ الٰہی کا ورد ضرور کرو۔ اپنی تیز رفتار زندگی میں کچھ وقت سکون سے اپنے رب کے لیے ضرور نکالو کیونکہ درحقیقت یہ وہ وقت ہے جو تم اپنے لیے نکالتے ہو۔

□ کرن ناز۔ کراچی

o بابا جی! میں نے پہلی بار آپ کا کالم پڑھا تو دل کو بہت سکون ہوا یقین ہوگیا کہ دنیا میں آج بھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ بابا جی میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے میں عرصہ تین سال سے کسی کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں مگر میری ایک غلطی کی وجہ سے وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ آپ میری مدد کیجیے تاکہ وہ خود سے میرے پاس واپس آجائیں۔ میں اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بہت امید کے ساتھ آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ میری مدد کریں اور میری زندگی میں بھی خوشحالی واپس لوٹ آئے۔ اس کی دعا دیں مجھے۔ بابا جی اگر وہ واپس نہیں آئے تو میں نیند کی گولیاں کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔ اور ایک بار میں ایسا کرنے والی تھی مگر پھر میں نے آپ کے کالم کو پڑھا یوں سمجھ لیں کہ میں بس آپ کی

ہی وجہ سے زندہ ہوں اور اگر آپ کا جواب نہیں ملا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ میں اپنا مسئلہ واضح الفاظ میں نیچے لکھ رہی ہوں۔ بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ چند ماہ پہلے میں کسی لڑکے سے Wrong Number پر دوستی کر بیٹھی تھی اور اس لڑکے سے میری بات چیت اچھی خاصی ہوئی پھر میں نے اس لڑکے کو اپنی تصویر واٹس اپ کے ذریعے سینڈ کرنی چاہی مگر سینڈ نہ ہو سکی یوں سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی نہیں تھی اور پھر ایک دن یہ ساری بات اُن کو پتا چل گئی اور اُس وقت بہت غصے میں تھے ہماری تھوڑی بات خراب ہوئی مگر پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ ہماری بات چیت تو ٹھیک چل رہی تھی۔ مگر اُس کے بعد میرے لور اور میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے اور پھر ایک دو دن میں سب ٹھیک بھی ہو جاتا اور پھر ماہ رمضان میں میرا موبائل خراب ہو گیا تھا تو میں نے نے موبائل ٹھیک کروانے انہیں دیا اور دو دن موبائل اُن کے پاس ہی تھا۔ جب موبائل اُن کے پاس تھا تب ہی رات میں اُس لڑکے کی کال آئی میرے موبائل پر۔ اور پھر جب میرے لور نے موبائل پر اُس لڑکے کی کال دیکھی تو بہت غصے ہوئے اور پھر میرے لور نے اپنے نمبر سے اُس لڑکے کو کال کر کے یہ کہا کہ بھائی مجھے یہ موبائل ملا ہے مجھے نہیں پتا یہ کس کا موبائل ہے۔ اگر آپ جانتے ہوں تو اُس کا پتا دو مجھے اور آپ کون ہو؟ یہ ساری بات میرے لور نے اُس لڑکے سے کہی۔ جس سے میں نے دوستی کی تھی اور پھر اُس لڑکے نے اُن سے کیا بات کی مجھ کچھ نہیں پتا پر جب سے اُس لڑکے سے انہوں نے بات کی ہے اُس دن سے ہماری بات نہیں ہوئی۔ ہاں بس ایک دن انہوں نے مجھے میرا موبائل دیا اور کہا کہ آج کے بعد مجھے کال نہیں کرنا میں تم کو چھوڑ رہا ہوں۔ بہت غصے میں تھے وہ اور اب تک مجھ سے بات نہیں کی۔ میں کافی دفعہ کال کر کے بات کو ٹھیک کرنا چاہتی ہوں مگر ہماری بات ٹھیک نہ ہو سکی میں نے بہت کوشش کی اپنے پیار کو منانے کی مگر کوئی بات نہ بنی اور آج 4 ماہ ہو گئے ہیں ہماری بات چیت نہیں ہوئی۔ اب بس میں ایک آخری امید کے ساتھ آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ بابا جی میری مدد کیجیے تاکہ میری زندگی میں بھی خوشحالی لوٹ آئے۔ میں اُن کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اُن کے بنا مرنا نہیں، میں بہت امید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں میں آپ کی بے حد شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی کرن! تمہارا خط پڑھ کر دکھ ہوا کسی بھی رشتے میں دھوکا دینا نہایت قبیح حرکت ہے۔ تم تو پہلے ہی غیر شرعی حرکت کر رہی تھیں اس کے بعد جس شخص سے محبت کا دعویٰ کرتی ہو اُس کو دھوکا بھی دیتی رہیں۔ یاد رکھو دھوکا دینے والے کو اللہ تبارک و تعالیٰ بے پردہ کر دیتا ہے اور یہی تمہارے ساتھ ہوا۔ اعتماد کو ٹھیس پہنچانے سے زیادہ برا کچھ نہیں۔ تم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور عہد کر لو کہ کسی بھی نامحرم سے بلاوجہ فون پر بات نہیں کرو گی۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور کثرت سے استغفراللہ ربی پڑھا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ ردا منصور۔ کوہاٹ

☆: بیٹی ردا! جو صورتحال تم نے تحریر کی ہے میں اس میں تمہیں تعویذ منگوانے کا ہی مشورہ دوں گا۔ کیونکہ مزید وقت ضائع کرنا تمہارے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ تفصیل کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو یا مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

☐ مہناز۔ کوٹری

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ جیتا رکھے۔ میں نے آپ سے دانتوں کی دوا منگوائی تھی۔ میرے دانت اور مسوڑھے ختم ہو چکے تھے۔ ایک بوتل سے ہی بہت فائدہ ہوا فون اور پس آنا بالکل بند ہو گیا۔ اب مجھے اور دوا چاہیے۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کیا تھا وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو خط لکھوں تو بابا جی برائے مہربانی مجھے 3 بوتل دوا تیار کر دیں۔ میں ہدیہ ارسال کر دوں گی۔

☆ بیٹی مہناز! میں دوا تیار کر کے سچی کہانیاں

کے دفتر میں بھجوا دوں گا۔ اصل میں لوگ فون کر کے دوا کا کہتے ہیں اور پھر منگوانے میں بہت تاخیر کر دیتے ہیں۔ اس لیے آفس والے میرے کہنے پر ہی دوا دینے کی حامی بھرتے ہیں۔ تم بے فکر رہو۔

□ رضوان اللہ۔ دیر

o بابا جان! میرے 18 سال کے بیٹے کی ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے راڈ تو ڈال دی تھی مگر کہا تھا کہ ہڈی بیٹھنے میں بہت وقت لے گی۔ بابا جان میری بیوی نے آپ سے دوا منگوائی تھی جو وہ چھپکے چھپکے بیٹے کو دیتی رہی اللہ کا بڑا احسان ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا۔ ڈاکٹر بھی حیران تھا کہ یہ معجزہ کیسے ہوگیا۔ بابا جان میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور کیا یہ دوا کسی بھی ایسے شخص کو دی جا سکتی ہے جس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

☆ بیٹے رضوان! اللہ کا شکر ہے کہ بچے کو صحت نصیب ہوئی مجھے یہ دوا میرے بزرگوں نے بخشی تھی یہ ہڈی کو ایسے جوڑتی ہے کہ لوگ جادو سمجھتے ہیں۔ لیکن بیٹے دوا تیار کرنے کے لیے مریض کی عمر اور وزن کا جاننا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا تم اپنی مرضی سے کسی اور کو یہ دوا مت دینا۔ بچے پر سے صدقہ نکالو یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔

□ فاخرہ۔ کشمیر

o بابا جی میری والدہ کو دل کی تکلیف ہے ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی رہتا ہے۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جائے اُن کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ شور شرابہ اُن سے بالکل برداشت نہیں ہوتا۔ بابا جی ہم لوگ بہت کوشش کرتے ہیں کہ اُن کا پورا خیال رکھیں مگر بچوں کا گھر ہے شور بھی ہوتا ہے پھر لوگوں کے درمیان بدمزگی بھی ہو جاتی ہے۔ اُن کو کیسے اِن سب سے دور رکھیں بعض دفعہ تو پتا بھی نہیں چلتا کہ کس بات پر اُن کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ گھر میں بھابیاں ہیں وہ چوری بن جاتی ہیں۔ جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بابا جی ایسا اسم الٰہی بتائیں جس کی برکت سے والدہ کی طبیعت میں سدھار پیدا ہو۔

☆ بیٹی فاخرہ! مرض کا علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مریض کے بارے میں معلومات نہ ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تمہاری والدہ نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے۔ خوف زدہ رہ رہ کر اُن کا دل کمزور ہوگیا ہے۔ اکثر اوقات انسانی رویے دوسرے شخص کو بری طرح توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ وہ زندہ تو رہتا ہے کیونکہ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اندر سے بے انتہا کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال تمہاری والدہ کے ساتھ بھی ہے۔ تم لوگوں کو اُن کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ والدہ سے کہو بعد نماز فجر ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھ کر پانی پر دم کریں اور یہ پانی پی لیں۔ 21 دن پابندی سے یہ عمل کریں انشاء اللہ وہ اپنی طبیعت میں مثبت تبدیلی محسوس کریں گی۔

□ شاہدہ طالب۔ چراٹ

o بابا جی! کچھ عرصہ قبل آپ سے جنات سے نجات کے لیے تعویذ اور وظیفہ لیا تھا آپ نے درست کہا تھا وظیفہ شروع کرنے کے بعد اُن کے تنگ کرنے میں ایک دم بہت اضافہ ہوگیا تھا مگر ہم سب گھر والے ثابت قدم رہے مگر تعویذ رکھنے کے بعد ایک دم خاموش ہوگئی۔ ہفتہ کی رات کو مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں مگر اب وہ بھی ختم ہوگئی ہیں۔ بابا جی آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور پوچھنا تھا کہ تعویذ رہنے دیں یا ہٹا دیں۔

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ کا شکر ادا کرو جناتی مخلوق سے نجات بہت مشکل ہوتی ہے مگر تم نے مستقل مزاجی سے علاج کروایا۔ اسی لیے کامیابی ملی۔ بیٹی تعویذ جہاں رکھا ہے وہیں رہنے دو، وہ خود ہی غائب ہو جائے گا۔ تم بروز جمعہ پابندی سے صدقہ خیرات نکالو اور جائز ضرورت مند کو دو۔ گھر میں پابندی سے نماز کا اہتمام رکھو اور سورج کی روشنی کمروں میں ضرور آنے دیا کرو۔ بروز جمعہ ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھا کرو۔

□ ماہ رخ۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی ماہ رخ! نکاح کرنا گناہ نہیں مگر والدین

کی رضا مندی ضروری ہے۔ اس سے آنے والی زندگی بہت سہل رہتی ہے۔ اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے مگر تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم نے کتنی مشکل زندگی کا انتخاب کرلیا ہے۔ بہرحال نماز کی پابندی رکھو اور نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۃ واقعہ ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ اپنے غصے کو قابو میں رکھنا۔ میکہ لڑکی کو بہت طاقت دیتا ہے اور تم وہ طاقت کھو چکی ہو۔ لہٰذا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا۔ میں تمہارے لیے دعا کا اہتمام رکھوں گا۔

☐ راحیلہ گستاب۔ چکوال

○ بابا جی میری والدہ ہمیشہ آپ کے رابطے میں رہیں اور اُن کے انتقال کے بعد میں بھی آپ سے وقتاً فوقتاً رابطہ کرتی رہتی ہوں۔ آپ نے بہت سے ایسے مسئلوں میں رہنمائی کی جو انسان سوائے اپنے والدین کے کسی سے شیئر نہیں کرسکتا۔ بابا جی میں اس وقت ایک شدید مسئلے میں گرفتار ہوں۔ میری ساس میری ہر بات میں کیڑے نکالتی ہیں۔ اس بارے میں، میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا اب میں جو صدقہ خیرات نکالتی ہوں اس پر میرے میاں کے کان بھرتی ہیں کہ اللہ کو پیسوں کی کیا ضرورت، بس قرآن پڑھنا ہی کافی ہے وغیرہ وغیرہ...... بابا جی یہ بات مجھے اتنی تکلیف دے رہی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ کوئی اتنا بھی جاہل اور کند ذہن ہوسکتا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی مجھے اُن سے نفرت سی محسوس ہونے لگی ہے۔ شاید آپ کو میرا مسئلہ بڑا نہ لگے مگر بابا جی میں ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور اللہ کی راہ میں دینے کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اس کی برکت ہے کہ اب تک میرا کوئی کام نہیں رکا اور میں نہیں چاہتی کہ ان کی اتنی گری ہوئی سوچ کی وجہ سے میرے معاملات میں رکاوٹ آئے۔ بابا جی میری چاروں نندیں غیر شادی شدہ ہیں۔ پیسے کی کمی نہیں مگر پھر بھی کوئی رشتہ نہیں۔ رشتے کرانے والیوں کو ہزاروں روپے دے دیتی ہیں مگر دراصل جہاں دینے سے رکاوٹ دور ہوگی وہاں چند سو دیتے ہوئے بھی جان نکلتی ہے۔ بابا جی مجھے کچھ ایسا پڑھنے کو دیں کہ یہ میرے اور اللہ کے معاملے میں نہ بولیں۔

☆ بیٹی راحیلہ! میں سب سے پہلے تو تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنی ساس کے بارے میں سخت الفاظ کا استعمال مت کیا کرو وہ تمہاری بزرگ ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تم صرف انہیں اتنا بتادو کہ بے شک اللہ کو ہماری کسی چیز کی ضرورت نہیں مگر پھر بھی زکوٰۃ کا کتنا سخت حکم ہے۔ قربانی فرض ہے، حج صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ ان سب میں پیسہ درکار ہوتا ہے۔ اصل میں بیٹی اللہ آپ سے آپ کی پسندیدہ ترین شے مانگتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان اللہ سے زیادہ کسی شے کو عزیز نہ رکھے۔ سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کرنے کو تیار رہے۔ منفی سوچ رکھنے والے دکھ اٹھاتے ہیں مگر انہیں سمجھ نہیں آتا اور جب سمجھ آتا ہے تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ تم ان کے لیے دعا کیا کرو کہ اللہ اُن پر رحم فرمائے اور اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ اس سے بڑا کیا دکھ ہوگا کہ بہو گھر میں موجود ہے اور بیٹیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں مگر یہ سب عقل والے سمجھتے ہیں۔ تم 'یا قہار' کی تسبیح پڑھتی رہا کرو۔ اللہ تم پر ہمیشہ اپنا کرم رکھے گا۔

☐ امبر۔ شورکوٹ

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کررہے ہیں، اسی طرح ہمارے بھی دو مسئلے حل کردیں۔ اللہ پاک آپ کو نیک اجر دے گا۔ ہمارا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ابو ایک سرکاری ملازم ہیں مگر ان سے جونیئر لوگوں کو ترقی مل گئی ہے لیکن میرے ابو کو پروموشن نہیں دی جارہی کیونکہ ان کے پاس نہ تو کوئی سفارش ہے اور نہ رشوت دینے کے لیے پیسہ۔ وہ تو ہم پانچ بچوں کے تعلیمی اخراجات اور گھر کا خرچ بھی بڑی مشکل سے چلا پاتے ہیں۔ براہ کرم کوئی ایسا تعویذ دیں کہ ان کا حق یعنی پروموشن مل جائے۔ دوسرا مسئلہ میرے ماموں کا ہے۔ وہ بی اے پاس ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں کسٹم یا انکم ٹیکس کے محکمے میں انسپکٹر کی ملازمت مل جائے۔ اس کے لیے بھی کوئی تعویذ دیجیے۔ آپ

کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆: بیٹی امبر! جہاں تک تمہارے پہلے مسئلے کا تعلق ہے تو سب سے پہلے تمہارے والد کو نماز کی مکمل پابندی کرنا ہوگی بلکہ تم سب کو نماز کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ دوسرے مسئلے کے لیے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تمہارا ماموں صرف کسٹم اور انکم ٹیکس کا انسپکٹر بننے میں ہی دلچسپی کیوں رکھتا ہے؟ کیا اس لیے کہ یہ دونوں محکمے ''رشوت'' کے لیے مشہور ہیں۔ میں اس کام کے لیے تعویذ نہیں دے سکتا۔ اور وہ ایمانداری سے رزق کی کشائش کے لیے تعویذ چاہتا ہے تو نماز کی مکمل پابندی کے ساتھ صدق دل سے دعا مانگے۔ کرم ہوگا۔

□: نعمان علی۔ لاس اینجلس (امریکا)

o: بابا جی، السلام علیکم! میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے ایم کام کے ساتھ ساتھ ایم بی اے بھی کیا ہے۔ پاکستان میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی تنخواہ پر ملازمت کررہا تھا۔ پھر دوسروں کی دیکھا دیکھی مجھے بھی امریکا جانے کا جنون سوار ہوگیا۔ میں نے عزیزوں اور رشتے داروں سے قرض ادھار لیا اور کسی نہ کسی طرح امریکا پہنچ گیا۔ یہاں آکر احساس ہوا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ میں نے یہاں انتہائی گھٹیا درجے کے کام بھی کیے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنے اوپر رونا آتا تھا۔ میری ساری ذہانت، تعلیم اور قابلیت دھری کی دھری رہ گئی۔ پھر میں نے دوسری بڑی غلطی یہ کی کہ گرین کارڈ کے لالچ میں یہاں شادی کرلی۔ بس اسی دن سے اذیت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بابا جی! میں گزشتہ سترہ سال سے یہاں مقیم ہوں۔ اس دوران مجھے خوشی کا ایک پل بھی نصیب نہیں ہوا ہے۔ امریکن عورتوں کی طرح میری بیوی تو خودسر ہے ہی بچے بھی اسی ماحول میں رنگ گئے ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے مجھے قلبی سکون میسر ہو۔ میں تمام پاکستانی بھائیوں سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ خدارا اس جنون سے باز آئیں۔ ان ملکوں میں دولت تو بہت ملتی ہے مگر عزت وغیرت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اپنی ہی بیٹی جب بوائے فرینڈز کے ساتھ آزادانہ گھومے پھرے تو انسان ہر لمحہ جیتا اور مرتا ہے۔ بابا جی! خدارا مجھے کوئی تعویذ بھی دیں جس سے میرے بچے راہ راست پر آجائیں۔ وہ میری بات ماننے لگیں اور پاکستان آنے پر راضی ہوجائیں۔ تاعمر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆: بیٹے نعمان! تمہارے حالات جان کر انتہائی قلق ہوا۔ میں نے تمہارے خط کے کچھ حصے اس لیے شائع کردیے ہیں تاکہ دوسرے نوجوان بھی اس سے عبرت حاصل کریں۔ بیٹے! اس میں تمہاری اور صرف تمہاری غلطی ہے۔ امریکا اور یورپ میں مقیم اکثریت کا مسئلہ یہی ہے۔ وہ لوگ دولت کی چمک دمک دیکھ کر اپنی بینائی کھودیتے ہیں۔ بعد میں انھیں پچھتاوا ہوتا ہے مگر وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو تم خود نماز کی پابندی کرو اور بچوں کو ایک مثال بن کر دکھاؤ۔ ابھی تمہارے بچوں کی عمریں اتنی زیادہ نہیں ہیں کہ ان کی اصلاح نہ ہوسکے۔ انھیں پیار ومحبت سے سمجھاؤ۔ اٹھتے بیٹھتے غیر محسوس طریقے سے ان کے دل میں اپنے مذہب کی محبت پیدا کرو۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو۔ رب العالمین تمہارے دونوں بچوں کو سیدھی راہ دکھائے۔ (آمین) بیٹے! تم ''سورۃ حج'' باریک قلم سے لکھ لو یا کسی سے لکھوالو۔ اس کا تعویذ بنا کر بیٹے اور بیٹی کے گلے میں ڈال دو۔ اس کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد 360 مرتبہ ''یا تواب'' کا ورد کرو اور اللہ رب العزت سے انتہائی رقت قلب سے گڑگڑا کر بچوں کے لیے دعا کرو۔ اس عمل کی مدت چالیس دن ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد بہتری کے آثار پیدا ہوں گے۔ اس دوران میں تم خود بھی تمام مکروہات سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خیرات کرنے سے بھی بے شمار مسائل سے نجات ملتی ہے۔ تعویذ کے

لیے فوری طور پر سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلوم کر لو۔

□: شاہانہ انصاری۔ حیدر آباد

٥: بیٹی شاہانہ! اللہ تبارک و تعالیٰ تمہاری جائز مراد پوری فرمائے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم کبھی کبھی نماز پڑھتی ہو۔ نماز سے تو کسی بھی حالت میں رخصت نہیں ہے۔ انتہائی بیماری کی حالت میں بھی اس کی ادائیگی کا حکم ہے۔ سب سے پہلے تو تم نماز کی پابندی کرو۔ کم از کم چالیس دن تک دل پہ جبر کر کے پابندی کرو گی تو خود بہ خود نماز پڑھنے کو دل چاہے گا۔ تم نے لکھا ہے کہ تمہیں وظیفہ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ بیٹی! وظیفہ تو کلام الٰہی کا کیا جاتا ہے۔ اس رحمت اللعالمین کا کلام تو رحمتوں اور برکتوں کا باعث ہے، اس سے خوف کیسا؟ میں تمہیں آسان سا مگر انتہائی زود اثر عمل بتا رہا ہوں۔ اسے پختہ یقین اور خلوص نیت کے ساتھ کرو گی تو انشاء اللہ تمہاری دلی مراد بر آئے گی۔

تم ہر فرض نماز کے بعد 129 دفعہ ''یا لطیف'' کا ورد کر لیا کرو۔ اس کے علاوہ جمعرات کے دن چاشت کی نماز پڑھو (دن کے دس اور گیارہ بجے کے درمیان) اس کے بعد 500 دفعہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ''یا سمیع'' کا ورد کرو۔ اس دوران میں کسی سے بات بالکل مت کرنا۔ ورد مکمل کرنے کے بعد اپنی حاجت روائی کے لیے انتہائی عاجزی و انکساری سے دعا کرو۔ وہ رب رحمٰن و رحیم اپنا فضل فرمائے گا مگر نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جھوٹ، غیبت، فلم بینی، موسیقی، فضول گوئی سے پرہیز بھی لازمی ہے۔

□: محمد علی۔ مکران

٥: بیٹے محمد علی! یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ تعویذ لینے کے بعد تمہاری بہن کی شادی بہ خیر و خوبی ہو گئی۔ بیٹے! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اپنی رحمتوں سے نوازا اور فرض سے سبکدوش کیا۔ نماز سے کبھی غفلت مت برتنا۔ حسب استطاعت خیرات اور ضرورت مندوں کی امداد کرتے رہنا۔

□: فرزانہ۔ جھنگ

٥: بیٹی فرزانہ! انتہائی خوشی کی بات ہے تعویذ استعمال کرتے ہی تمہاری دلی مراد بر آئی اور تمہاری شادی مطلوبہ جگہ ہو گئی۔ بیٹی! میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس مہربان آقا کا شکر ادا کرو جو رب العالمین ہے۔ شکریہ ادا کر کے مجھ عاصی و عاجز کو مزید گناہ گار مت کرو۔ رزق میں کشادگی کے لیے تمہیں انتہائی زود اثر اور آزمودہ عمل تحریر کر رہا ہوں۔ یہ عمل تم خود بھی کرو اور اپنے شوہر سے بھی کراؤ، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

نماز کی مکمل طور پر پابندی خود بھی کرو اور اپنے شوہر سے بھی کراؤ۔ نماز فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان ایک مرتبہ با آواز بلند ''سورہ رحمٰن'' کی تلاوت کر لیا کرو۔ بعد نماز مغرب ایک مرتبہ ''سورۃ الواقعہ'' کی تلاوت کرو اور گڑگڑا کر دعا مانگو کہ ''اے رحیم و کریم! اپنے عرش اعظم کے طفیل میں اور اپنے حبیب ﷺ کے طفیل میں میری دعاؤں کو قبول فرما۔'' خیرات ضرور کرتی رہنا۔ دو ماہ بعد نتائج سے مطلع کرنا۔

□: کشور۔ انگلینڈ

٥: بابا جی! مجھے پردیس میں رہتے ہوئے 25 سال ہو گئے ہیں۔ اولاد یہاں کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ باوجود کوشش کہ اب راہ راست پر نہیں آ سکتی۔ میں بہت مایوس ہوں اور چاہتی ہوں کہ اب وطن لوٹ آؤں۔ ہم دونوں میاں بیوی چاہتے ہیں کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں اور ہم اپنوں میں لوٹ جائیں۔ ہماری مدد کیجیے۔ میں آخری وقت اس سرد ملک میں غیروں کے درمیان نہیں گزارنا چاہتی۔

☆: بیٹی کشور! خدا تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ یہ نہایت بابرکت ماہ ہے۔ اللہ سے جو مانگو گی وہ ملے گا۔ تمہارا پورا خط شائع نہیں کر رہا ہوں۔ بہر حال بیٹی! لوگ بہتر مستقبل کے لیے اپنوں سے دور چلے جاتے ہیں مگر عام طور پر خالی ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے خصوصی

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

"مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دعا کروں گا۔ کوشش کرو کہ بچوں کو بھی واپس لاسکو ورنہ تم اپنے وطن میں ہوگی اور جان بچوں میں اٹکی رہے گی۔ نماز فجر کے بعد 11 بار آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر دم کر دو۔ نماز عصر اور عشاء کے بعد 21-21 بار سورہ الحمد شریف پڑھو اول وآخر ایک ایک تسبیح یا رحمٰن پڑھو پھر دعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ اُم فضا۔ کراچی۔

o پیارے بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیوپیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ بابا جی میں وظیفہ وغیرہ نہیں پڑھ سکتی ہو سکے تو کوئی ایسی آیت دیں جو میں آسانی سے پڑھ لوں۔ اُس کے لیے بھی کوئی تعویذ بنا دیں تاکہ اس کی بھی بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی اُم فضا! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو' ہزار بار یَاشَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں تمہارے کم از کم دس گلاس پانی کے ہونا چاہئیں۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ تعویذ کے لیے فوری طور پر تم دونوں بہنیں 'سچی کہانیاں' کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو۔

□ صدف۔ سکھر۔

☆ بیٹی صدف! بڑا دُکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد الٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو اللہ کے ہاں بھی اس کی معافی نہیں۔ پریشانی' خوشی' بیماری' صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف' چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ عالیہ جہاں۔ لاہور۔

☆ بیٹی عالیہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی! کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بیٹی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کر سکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے' روز بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

□ وسیم شاہانی۔ دادو۔

o بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا' میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی

بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے بس آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے وسیم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط ارسال کرو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھو۔

□: علیم رضوی۔ اسلام آباد

○: بزرگوار سدا سلامت رہو۔ مجھ گناہ گار بندے سے میرے رب نے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ اب آپ کا ہی سہارا بچا ہے۔ بابا جی میں بہت اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ گھر، عزت، دولت اولاد وسب کچھ حاصل ہے مگر سکون بالکل نہیں ہے۔ ہر وقت بے چینی سی رہتی ہے۔ یہ کیفیت پچھلے تین برس سی ہے اور اب قابل برداشت نہیں رہی۔ خدارا میری رہنمائی فرمائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھالوں۔

☆: بیٹے علیم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بے چینی اور بے سکونی کیوں ہے۔ یہ اللہ کی جانب سے آخری موقع ہے اگر بے حسی طاری ہوگئی تو پھر سب ختم ہو جائے گا۔ تم رزق حلال ہی میں گزارا کرو۔ لالچ اور حرص سوائے پریشانی کے کچھ نہیں دیتا۔ دین اور دنیا دونوں بچا لو حرام کی کمائی کا خمیازہ اولاد کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ وہ راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ بصد استطاعت صدقہ وخیرات ضرور کرو۔ اور یہ عہد کرلو کہ حرام کمائی سے پرہیز کروگے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ صرف توبہ استغفار کا کثرت سے ورد کرو۔ چند دنوں میں ہی سکون محسوس کروگے۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔

ہائیڈ پارک

ذوئی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

باوضو شخص اور نیکیاں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ ''اے ابو ہریرہ! جب تم وضو کرنا چاہو تو پہلے یہ پڑھ لیا کرو۔

بسم اللہ والحمد للہ

ایسا کرو گے تو جب تک تمہارا وضو قائم رہے گا تمہارے محافظ فرشتے (کاتبین اعمال) تمہارے لیے مسلسل نیکیاں لکھتے رہیں گے۔

(معارف الحدیث جلد نمبر 3 صفحہ نمبر 75)

نماز کیلئے بس رک گئی

حضرت فقیر غلام باہوؒ جو حضرت سلطان باہوؒ کی اولاد میں سے مشہور بزرگ گزرے ہیں ایک دفعہ فیصل آباد سے واپس اپنے گھر ڈیرہ اسماعیل خان گوٹھ جمعہ شریف گئے تو راستے میں بس کے ڈرائیور سے فرمایا: ''ذرا بس روک دو نماز پڑھ لیں۔''

ڈرائیور نے اصرار کیا کہ آگے ہوٹل ہے وہاں چل کر نماز پڑھ لیں گے یہ علاقہ خطرناک ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں نماز کا وقت گزر جائے گا۔''

دو منٹ گزرے کہ بس خود بخود رک گئی اور ڈرائیور، کنڈیکٹر وغیرہ بس کو چیک کرنے لگے تو حضرت فقیر غلام باہوؒ نے لوگوں سے فرمایا۔ ''جس نے نماز ادا کرنی ہے یہیں پر کرلے۔''

ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس میں خرابی ڈھونڈتے رہے اتنے میں غلام باہوؒ نے نماز مکمل کرلی تو ڈرائیور نے اچانک کسی خیال کے تحت بس اسٹارٹ کی تو بس اسٹارٹ ہوگئی۔ چنانچہ ڈرائیور اپنے فعل پر شرمندہ ہوا۔ غلام باہوؒ سے اپنے فعل پر معافی مانگی اور دعا کا طلب گار ہوا۔''

حسن انتخاب: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

زاویہ

بدقسمتی سے ہمارے یہاں آدمی کے چلے جانے کے بعد اس کی تعریف ہوتی ہے اگر اب لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میں جا کر دیکھیں تو بہت سے کتبے آپ کو ایسے نظر آئیں گے جن کے اوپر مرحوم کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات لکھی ہوگی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ توصیفی کلمات بھی ہوں گے۔ اب وہ بے چارہ باہر نکل کر تو نہیں دیکھ سکتا کہ کتنے پر کیا لکھا ہے۔ یہ تو اس کے کام نہیں آیا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے تعریف و توصیف ہو جائے تو اس کو سہارا ہو۔ اس کو پتا چلے کہ میرے اردگرد رہنے والے لوگ جو ہیں وہ بہت تقویت عطا کرنے والے لوگ ہیں۔ (زاویہ صفحہ:69)

حسن انتخاب: ڈاکٹر محمد شہباز۔ حیدر آباد

☆

ایک وکیل دوسرے سے۔ ''تم نے دیکھا میں نے ایک شخص کو جعلی کرنسی کے مقدمے سے بری کروادیا لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔''

دوسرے وکیل صاحب نے پوچھا۔ ''کیا کیا؟''

پہلے وکیل نے جواب دیا۔ ''وہ مجھے فیس میں جعلی کرنسی ہی دے گا۔''

مرسلہ: محمد جواد انور۔ اسلام آباد

احساس

وہ کتابوں کے لفظوں میں چھپے احساس سا باتیں کرتا تھا مجھ سے...... کبھی چاند کا روپ دھار کر ایک ٹک دیکھا کرتا تھا...... کبھی بارش سا میری روح کی گہرائیوں میں چھم چھم برسا کرتا تھا...... کبھی آنکھوں میں تیرتے آنسو سا برس برس کر یادوں میں بہہ جاتا...... تو کبھی رنگ رنگ سے پھولوں میں خوشبو بن کر مہکا کرتا...... مگر کون ہے وہ...... جو بے پاؤں خوابوں میں کرنوں سے چمکا کرتا ہے۔

زورِ قلم: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

ظالمانہ برتاؤ

روم کی جنگ میں مسلمانوں نے بہت سے رومیوں کو گرفتار کرلیا اور قیدی بنا کر جہاز میں سوار کردیا۔ جب ابوایوب انصاری اتفاق سے قیدیوں کے پاس گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک قیدی عورت زار و قطار رو رہی ہے۔ اس عورت سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے اس عورت کا بچہ چھین لیا ہے اور اسے کسی دوسری جگہ رکھا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے اس بچے کو ڈھونڈ نکالا اور ماں کے سپرد کردیا۔ قیدیوں کے نگراں افسر نے سپہ سالار سے اس بات کی شکایت کی۔ سپہ سالار نے ابوایوب انصاری کو بلا بھیجا اور وضاحت طلب کی کہ آپ نے اس قیدی عورت سے ہمدردی کیوں کی؟

غزل

اکثر اس سوچ میں رہتی ہوں
کیوں غم اور صدمہ سہتی ہوں
جب پیار کی لہریں اٹھتی ہیں
تو شعر غزل کے کہتی ہوں
جب کشتی اس کے ہاتھ میں ہو
میں ندیا بن کے بہتی ہوں
تصویر ادھوری چھوڑی جو
رنگ اس میں بھرتی رہتی ہوں
گو رگ رگ میری زخمی ہے
پر سب کو اچھی دکھتی ہوں
ناز اس ضدی دل کے بھی اب
میں اکثر نخرے سہتی ہوں

شاعرہ: عمارہ ناز۔ کمالیہ

شگوفے

امتحان میں فیل ہونے کے بعد ایک لڑکے نے گھر جانے سے پہلے بہن کو فون پر کہا۔ ''میں فیل ہوگیا ہوں میرے آنے سے پہلے ابا کو تیار کرلو۔''

بہن نے کہا۔ ''ابا کو اطلاع مل چکی ہے اپنے آپ کو تیار کرلو۔''

☆

چور کی بیوی۔ ''گھر میں راشن ختم ہوگیا ہے۔''

چور غصے سے بولا۔ ''لے آؤں گا پہلے دکانیں تو بند ہونے دو۔''

☆

مجسٹریٹ نے چور لڑکے کے باپ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''آخر تم اپنے لڑکے کی اصلاح کیوں نہیں کرتے اسے کیوں نہیں بتاتے کہ درست راستہ کیا ہے چور لڑکے کے باپ نے جواب دیا۔ ''جناب میں نے اس کو بہت دفعہ سمجھایا اور تربیت دی لیکن ایسا بے وقوف ہے کہ ہر دفعہ ہی پکڑا جاتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ظالمانہ برتاؤ سے منع فرمایا ہے۔ اب تم ہی کہو کہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔''

مرسلہ: اشفاق احمد رفیق۔ آزاد کشمیر

سات دن

بیوی۔ ''ہفتے کو شاپنگ پر چلتے ہیں۔ اتوار کو امی کے گھر جائیں گے۔ پیر کو پارلر جائیں گے۔ منگل کو ڈنر کرنے جائیں گے۔ بدھ کو موی دیکھنے چلیں گے اور جمعرات کو پکنک پر جائیں گے ٹھیک ہے ناں؟''

شوہر۔ ''جمعہ کو بھی تیار رہنا مسجد چلیں گے۔''

بیوی۔ ''مسجد کیوں؟''

شوہر۔ ''بھیک مانگنے۔''

مرسلہ: مور شاہد حسین۔ قمر مشہداوکوٹ

شناسائی کا دکھ

اس جہاں میں
بہت سے لوگ ایسے ہیں
جو سب جہانوں سے
آشنا ہیں
اس شناسائی کا دکھ
صرف
گھر والوں کو ہے
وہ اس لیے
کہ سب جہانوں سے
یہ آشنا
گھر کے مکینوں سے
ناآشنا ہیں
شاعر۔ ظریف احسن

سنہری باتیں

☆ غضب بھی بھی نہایت قابل اور ذہین انسان کو بھی بے وقوفی والی حرکات پر مجبور کردیتا ہے۔

☆ غم ایسا بادل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت برستی ہے۔

☆ صبر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والا بہت بڑا تحفہ ہے۔

☆ انسان کی سب سے بڑی دشمن حرص اور لالچ ہے۔

☆ انسان بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑ دیتا ہے، عذاب کے ڈر سے گناہ بھی چھوڑ دینا چاہیے۔

☆ دوست کو اپنی ساری محبت دو مگر راز نہیں۔ یہ عمل اُسے کل آپ کا سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا دشمن بھی بنا سکتا ہے۔

☆ پاؤں پھسل جائے تو جسمانی چوٹ لگے گی مگر زبان کو نہ پھسلنے دو، یہ روحانی چوٹ کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

مرسلہ: حنا طارق۔ کراچی۔

تقلید

انسان کی جبلت بھی عجب شئے ہے۔ نہ تین میں خوش نہ تیرہ میں۔ قدرت نے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر جہاں دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے، وہیں کچھ ایسے جذبات بھی ہماری طبیعت میں شامل کر دیئے ہیں کہ ہم اکثر اوقات اپنے ہی خالق کی ناشکری کر جاتے ہیں۔ کبھی حالات و واقعات کی پریشانی پہ شکوے تو کبھی تقدیر کے ہاتھوں شکست کے گلے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری زندگیوں میں مادہ پرستی کا عنصر اس حد تک شامل ہو چکا ہے کہ اب ہمیں سوائے چمک دمک کے، کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ بڑے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اس معاشرے میں بسنے والے ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ ایک ہی خاندان کا گماں گزرتا تھا۔ ہماری اقدار رسم و رواج اور روایات ہی ہماری پہچان تھیں، لیکن ترقی کے تیز رفتار پہیے نے ہمیں آسائشیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کو سہل کر دیا ہے، وہیں اس نے ہماری اصلیت کو کچل کر اس کو بری طرح سے مسخ کر دیا ہے کہ خود اپنی پہچان بھی ممکن نہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم واقعی ایک قوم کی بجائے

بے ہنگم ہجوم میں اور دوسروں کی تقلید کرتے کرتے ہماری حالت اس کوے جیسی ہوگئی ہے جو ہنس کی چال چلتے چلتے خود اپنی ہی چال بھول گیا تھا۔
ریاض جاوید کی تصنیف ''ہم زندہ قوم ہیں'' سے
محمد فیاض محمود کراچی کا انتخاب

محبت

تمہیں پتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جنوں کی حد تک محبت کرتا ہو کیونکہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ بے شک تم نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں اتنا بھی پاگل نہیں کہ تمہاری خوبصورت آنکھوں میں اپنے لیے محبت نہ دیکھ سکو تم چاہو بھی تو اس بات سے انکار نہیں کرسکتی کہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔
انتخاب: رفعت، بہاولنگر

تلاشِ گمشدہ

☆ رشوت کی گلی میں ہمارا ایمان کھو گیا ہے' کہاں ملے گا؟
☆ گھر سے اخلاق گم ہو گیا ہے' کہاں ملے گا؟
☆ دہشت گردی کی آگ بجھانے والا اسپرے گم ہو گیا ہے' کہاں سے ملے گا؟
☆ بے حسی کی بیماری میں لگانے والا خلوص و محبت کا انجکشن گم ہو گیا ہے' کہاں سے ملے گا؟
☆ شرافت ہمیں چھوڑ کر کہیں فرار ہو گئی ہے' کہاں سے ملے گی؟
مرسلہ: انور شیخ۔ حیدر آباد

پیاری بات

دل میں محبت اور چہرے پر ناراضگی دوسروں کو بہت اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ اکثر ناراضگی بھانپ کر رخ بدل کر چھوڑ جاتے ہیں اور زندگی بھر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا اگر محبت ہو تو دل میں بھی اور چہرے پر بھی محبت کے آثار رکھو جو دوسروں کی خوشی کا باعث بنے اور وہ کبھی آپ کو بھول نہ پائیں۔
مرسلہ: ایم ایوب احمدانی۔ ڈی جی خان

بچانا ہے

بدعہد سیاست کاروں سے
امریکہ کے ہرکاروں سے
جمہور کے ٹھیکے داروں سے
ایسے ہی کچھ غداروں سے یہ پاکستان بچانا ہے
کب قوم کا قرض اتاریں گے
کس فن سے قوم کو ماریں گے
سب اپنے کام سنواریں گے
ایسے ہی کچھ غداروں سے یہ پاکستان بچانا ہے
نیٹو سے مال کماتے ہیں
اپنوں کا خون بہاتے ہیں
امریکی برگر کھاتے ہیں
ایسے ہی کچھ غداروں سے یہ پاکستان بچانا ہے
ہر نسل کے ہیں فنکار یہاں
جمہور کے ہیں غدار یہاں
مجہول بھی کردار یہاں
ایسے ہی کچھ غداروں سے یہ پاکستان بچانا ہے
کب جنتا ہوش میں آئے گی
خائن سے جان چھڑائے گی
کب گھر سے چور بھگائے گی
ایسے ہی کچھ غداروں سے یہ پاکستان بچانا ہے
شاعر: رضا زیدی۔ لاہور

مظلوم

میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ مرد عورت پر ظلم کرتا ہے یا مرد نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے میں تو اس بات سے بھی انکار کرتا ہوں کہ مرد ظالم ہوتے ہیں اگر مرد ظالم ہوتے اور مرد نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے تو دنیا کی ہر ایک عورت مظلوم ہوتی۔ ہر عورت پر ظلم ہوتا بے شک انسانی تاریخ کے ساتھ عورت پر ظلم کی داستان ملتی ہیں لیکن کیا ہر عورت کے ساتھ ظلم ہوا؟ یقیناً نہیں کیونکہ ظلم صرف اور صرف ان پر ہوا ہے جو ظلم کے خلاف خاموش رہی ہیں۔
زور قلم: خواجہ حسین جاوید۔ منچن آبادی

چیری زیادہ کھائیں

ایک اسٹڈی کے دوران معلوم ہوا ہے کہ اگر آپ مسلسل آٹھ روز تک دن میں دو مرتبہ کھٹی چیری کا 350 ملی لیٹر جوس پئیں تو اس سے آپ کے پٹھوں میں درد کی کمی ہو سکتی ہے۔ تازہ اور ڈبہ بند کھٹی چیری دونوں ٹھیک ہیں۔

مرسلہ: عبدالرحمن۔ کراچی

میری بیٹی

میری سوچ کا محور میرے پیار کا سب اثاثہ
میری ننھی پری تجھ سے منسوب ہے
تو میرے دل کی وہ کلی ہے
جو دل کے ہر گوشے میں آباد ہے
میرا سارا پیار صرف تم سے ہے
تو میری ہر آرزو ہو
میں اپنی زندگی کا تصور تیرے بنا کر ہی نہیں سکتا
میری ہر خواہش تیرے روپ میں پوری ہوئی
اک عجب احساس
سوچ کے دل شاد ہو جاتا ہے
تیرے صدقے میرا جہان آباد ہے
میری مالک دو جہاں سے دعا ہے
ایسی خوشی کائنات میں سب کو ملے

شاعر: وفا صدام حسین غازی تنیو۔ حیدر آباد

دریافت اور وجہ تسمیہ

05 اپریل 1722ء کو ایسٹر کے مذہبی تہوار کے دن مشہور ولندیزی جہاز راں اور سیاح جیکب روگی وین (Jacob Roggeveen) نے اس جزیرے پر قدم رکھا تھا۔ جیکب روگی وین مہذب دنیا کا پہلا یورپی فرد تھا جس نے تقریباً تیرہ صدیوں تک باقی دنیا سے لاعلم رہنے والے اس آباد جزیرے کو دریافت کیا اور گمنامی میں چھپے ہوئے نادر اور انوکھے موآئی مجسموں کو شہرت دوام بخشی۔ اگرچہ ایسٹر کی مناسبت سے جزیرے کا نام ایسٹر آئی لینڈ مشہور ہو گیا ہے تاہم جزیرے کو تیسری صدی عیسوی میں آباد کرنے والے ابتدائی آباد کار نسلی گروہ "راپانیو" (Rapa Nui) کے تاریخی نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ لاکھوں سال کے آتش فشانی کے عمل سے تقریباً تکونی شکل میں تشکیل پانے والے اس جزیرے کو مقامی افراد Te Pito O Te Henua یعنی "زمین کی ناف" (Naval of the world) بھی کہتے ہیں جبکہ یہاں موجود چٹانوں سے تراشے ہوئے بلند و بالا مجسموں کے لیے مقامی افراد اپنی مادری زبان کے لفظ "موآئی" کا استعمال کرتے ہیں جس کے معنی مجسمہ، بت یا مورتی کے ہیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر اعجاز باجوہ۔ کراچی

بلبل

جانے کہاں سے روز آتی ہے بلبل
پھولوں کو ادائیں دکھاتی ہے بلبل
دکھوں میں دیتے ہیں دل کو تسلی
سکھوں میں جو گیت گاتی ہے بلبل
چرا کر گلوں سے وفاؤں کی خوشبو!
پھر اپنے ہی اشکوں نہاتی ہے بلبل
مسرتوں کے پھول کبھی تو لٹا کر
تنہائی میں آنسو بہاتی ہے بلبل
اڑانوں میں توانائی اپنی بڑھا کر
دلوں میں الفت جگاتی ہے بلبل
پت جھڑ کے بے رنگ موسموں کو
غم ہجراں کے نغمے سناتی ہے بلبل
تصور میں دیکھا ہے رقص بہاراں
خیالوں میں جب مسکراتی ہے بلبل
چاہتوں کے پھول دل میں سجا کر
دلوں کے غنچے کھلاتی ہے بلبل
پیار کی خوشیاں پوچھو حسن سے
میرے من کو کیسے بہلاتی ہے بلبل

شاعر: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف



تیرِ نیم کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

محمد قاسم خان بلوچ...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سب کام پرانے ہیں نیا کچھ نہیں ہوتا
اب مجھ سے محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا
نامے کئی ایسے بھی میرے نام ہیں آتے
خوشبو بہت آتی ہے لکھا کچھ نہیں ہوتا

ابو ہریرہ بلوچ...... بورے والا

بٹھا کر یار کو پہلو میں اپنے
جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں

ریاض حسین تبسم چوہان...... فیصل آباد

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی جب ہم انہیں یاد نہ آئے

نادیہ طارق...... کراچی

مسلسل بادلوں سے اتنی بارش
کوئی روتا ہے شاید بادلوں میں

رانا حبیب الرحمٰن...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

آج بھی گھر میں کیا ہے کہ ترتیب دوں جسے
کچھ خواب ہیں اِدھر سے اُدھر کر رہا ہوں میں

مہوش یوسف...... ڈسکہ

سبھی میں ہوتا ہے، مجھ میں ذرا زیادہ ہے
مرے وجود میں، میں کم خدا زیادہ ہے
چراغ دھر کے ہتھیلی پہ آ نہیں سکتا
میں جس جگہ ہوں وہاں پر ہوا زیادہ ہے

شاعر عتیق...... کراچی

اُس کی عادت ہے میرے بال بگاڑے رکھنا
اس کی کوشش ہے کسی اور کو اچھا نہ لگوں

عظمیٰ شکور...... اسلام آباد

آتا ہے کون کون مرے غم کو بانٹنے
محسن تُو میری موت کی افواہ اُڑا کے دیکھ

عمر العطاس...... کراچی

شوق یہ ہے کہ سمندر کی میں تہہ تک پہنچوں
سو تیری آنکھ میں اترا ہوں خدا خیر کرے

ڈاکٹر محمد شہباز...... حیدرآباد

میرا ہم سفر جو عجیب ہے
تو عجیب تر ہوں میں آپ بھی
مجھے منزلوں کی خبر نہیں
اُسے راستوں کا پتا نہیں

اسامہ بلال اعوان...... لاہور

عید کا چاند تم نے دیکھ لیا
چاند کی عید ہوگئی ہوگی

ظفر شاہ...... کراچی

میرے جسم سے روح نکال دی اُس نے
مجھے اداس رہنے کی عادت ڈال دی اس نے
میں نے جب بھی اسے اپنا بنانا چاہا
باتوں باتوں میں بات ٹال دی اُس نے

احمد کمال...... گجرات

آیت ہجر تلاوت ہی نہیں کی میں نے
تم سمجھتے ہو محبت ہی نہیں کی میں نے
نشۂ قید رہائی سے کہیں بہتر ہے
لوگ کہتے ہیں بغاوت ہی نہیں کی میں نے

عبداللہ افغانی......پشاور

حدِ ادب کی بات تھی حدِ ادب میں رہ گئی
میں نے کہا کہ میں چلا، اُس نے کہا کہ جائیے

نزابت افشاں......مہورہ، فتح جنگ

لکھنا میرے مزار کے کتبے پہ یہ حروف
"مرحوم جینے کی حراست میں مرگیا"

سلیمان شبیر......اکوال، تلہ گنگ

تاروں کی بہاروں میں بھی قمر افسردہ سے تم رہتے ہو
پھولوں کو تو دیکھو کانٹوں میں بھی ہنس ہنس کے گزارہ کرتے ہیں

مسکان بھٹی......شام کے بھٹیاں

اندر کے میلے پن کا لگے کیسے سراغ
اندازہ کرتے ہیں لوگ اُجلے لباس سے

خضر حیات......روڑہ تھل

تمہاری محبت سے لے کر تمہارے الوداع کہنے تک بس
ہم صرف تمھیں چاہتے ہیں تم سے کچھ نہیں چاہتے

کرن شبیر......کراچی

مسلسل ذہن و دل پہ ہے مسلط
یہ دنیا عارضی ہوتے ہوئے بھی

مور شاہد حسین قیمر......شہداد کوٹ

تم مثلِ تعویذ ہو اے جاناں
یقیں مانو گلے لگتے ہی شفا مل جاتی ہے

خواجہ حسین جاوید......مچھن آباد

مہلت عمر کہ جب تک مرے کشکول میں ہے
خود کو فہرستِ گناہ گار میں لکھنا ہوگا

ثناء اللہ غنی......رحیم یار خان

شکر ہے ہم ضربِ گل بھی سہہ گئے
ریزہ ریزہ ہوتے ہوتے رہ گئے
خندہ پیشانی سے مل اے زندگی
تیرے جتنے وار تھے ہم سہہ گئے

سلیمان بشیر......چکوال

جانے کون سا آسیب بستا ہے دل میں
جو بھی ٹھہرا آخر مکان چھوڑ گیا

نزابت افشاں......اٹک

تھی کس کو میرے حال سے آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

محمد وسیم چدہڑ......میٹھا ٹوانہ

خاموش خاموش رہتے ہو آج کل کیا ہوا تمھیں وصی
ہماری کوئی بات دل پہ لگی یا دل ہی کسی اور سے لگا بیٹھے ہو

میاں سہیل الفت......ننکانہ صاحب

اپنے خلوص سے تجھے چاہتا ہوں میں الفت
جیسے تیری محبت میری بخشش کا وسیلہ ہو

فلک شیر تابش......شاہ گڑھ، رحیم یار خان

زندگی درد کے تپتے ہوئے صحرا میں گئی
ہم مگر ہنستے رہے پھر بھی زمانے کے لیے

محمد یوسف لغاری......لیہ

خدا تو ملتا ہے، انساں نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

عظمیٰ......اسلام آباد

آج اشکوں پہ مرے تم کو ہنسی آتی ہے
تم تو کہتے تھے کبھی ان کو ستارے آنسو

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا:

کوپن برائے

ترنیم کش

نومبر 2016ء